گرما/خزاں ۱۹۹۱   ۸

آج

ترتیب : اجمل کمال

منوج داس   ضمیرالدین احمد   نیّر مسعود
اکرام اللہ   خالدہ حسین   نکانور پارا
افتخار جالب   اوسِپ ماندلستام
افضال احمد سید   عذرا عباس   بیری پی
ذی شان ساحل   گریگور فان ریزوری

آج کی کتاب

Scanned with CamScanner

آج
ستمبر ۱۹۹۱

منیجنگ ایڈیٹر
زینت حسام

اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۱۲، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۳۶

کمپوزنگ
پبلشرز یونائیٹڈ
۸۶ دارالامان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی

طباعت
ابن حسن پرنٹنگ پریس
ہاکی اسٹیڈیم، کراچی

تقسیم کار
مکتبہ دانیال
وکٹوریہ چیمبرز نمبر ۲، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی

کلاسیک
شاہراہ قائداعظم، لاہور

ترتیب

۷
منوج داس
جنگل میں

۲۳
ضمیرالدین احمد
گنگا سے گنگا تک

۳۹
نیر مسعود
جانوس

۴۹
اکرام اللہ
کتنا پانی

Scanned with CamScanner

۹۵

عالیہ حسینی

پاسپورٹ

۱۰۲

نکانور پارا

قاری کو تنبیہ
پارا
بچوں کی باتیں   آخری جام صحت
ترانہ بد   راز و نیاز
بیر جیسی کی علامتیں
نظمیں
نظم   نظم   نظم   نظم
مقتبس   تصویریں   عالم
میں اپنے سب قول واپس لیتا ہوں

۱۰۳

افتخار جالب

تمہاری شکایتوں کے بوجھ میں
کچرے کے ڈھیر پر
تنگی خلاؤں کی اشیوں کی وسعتوں میں
بہزاد کی فرکس میں
بہتا ساحل ہیں، ماہیرینا ایسے
سورج کو رات نیند نہیں آئی

۱۲۲

اوسپ ماندلستام

جسے گھوڑے کی نعل ملتی ہے
ماندلستام اسٹریٹ
نظم   نظم   نظم   نظم

۱۲۹

افضال احمد سید

نظم ناموں سے ابتدا
سرقہ غیر اہم شاعر
مجھے ایک کہانی سناؤ
فوجی ورجل کی زمین چھین لیتے ہیں

۱۳۳

عذرا عباس

چوہے کو کیسے مارا گیا
ایک نظم آتی ہے

۱۳۶

ہیرک پیس

شجرالموت

Scanned with CamScanner

ذی شان ساحل

قرطبیا کا زوال

انتخاب

۱۹۱ء

گریگور فان ریزوری

اسکیچز

اس شمارے میں شامل اسکیچ بنگلادیش کی ممتاز مصور قمرالحسن کی شائع ہوئے ہیں۔

منوج داس

انگریزی سے ترجمہ : اسد محمد خاں

جنگل میں

مسز مِتّی نے سنا، دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ کتنی ہی دستکوں کے بعد اس کی آنکھ کھلی۔ بہت نرمی سے، کئی کئی منٹ کا وقفہ دے کر دروازہ تھپ تھپایا جا رہا تھا۔

اصل میں یہ چوکی دار کی مجبوری تھی۔ وہ اس کے برخلاف کر ہی نہیں سکتا تھا، اسے پتا تھا۔

مسز مِتّی نے نظروں ہی نظروں میں ہال کا جائزہ لیا۔ اس کے پیروں میں راجا صاحب پڑا تھا، جیسے قصر جاہ پر نعش مٹی کا ڈھیر۔ چھ آٹھ مکھیاں راجا کے سر جیسے ہوئے بوتلوں کی دراز میں پک ٹیک منا رہی تھیں۔ ایک طرف اکڑباز چکوردی صاحب، جو عام حالات میں بڑا معزز بنتا تھا، یوں بڑا خراٹے لے رہا تھا جیسے سور خرخراتا ہے۔

متی صاحب اور چکوردی کی بیوی ایک دوسرے کی طرف رخ کیے فرش پر پڑے تھے، شاید ایک دوسرے کی لے بڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے نڈھال ہو گئے ہوں گے۔

پھر ایک بار دستک ہوئی۔ مسز متی ایک درجہ اور بیدار ہو گئی۔ آواز نے یادداشت پر چھائی ہوئی کاہلی کے بےڈھنگے تودے سے ایک ٹکڑا اور کاٹ کے پھینک دیا۔ وہ سب لوگ اتنی گہری نیند میں کب جا پڑے تھے، ظاہر ہے اس وقت اسے بالکل یاد نہیں تھا۔ ویسے جو جو کچھ ہوتا رہا تھا ذرا سی کوشش سے سبھی یاد آتا جا رہا تھا۔ آگ کے گرد ان کا ناچنا، اور سور کے مردہ جسم سے (جسے انھوں نے ادھا زندہ ہی آگ پر ڈال دیا تھا) پارچے کاٹ کاٹ کر کھانا اسے یاد تھا۔

وہ لوگ چاہتے تھے کہ ایک رات عہد قدیم کے وحشیوں کی طرح گزاری جائے؛ بےطرح ٹھونسنے، ناچتے، بلانوشی اور خرمستیاں کرتے لاکھوں برس پہلے کے آدمی کی طرح۔ شراب نوشی سے پہلے چکوردی صاحب نے، جو خود کو ان معاملات میں سند سمجھتا تھا، اپنی اس فلسفے پر لیکچر دیا تھا کہ عہد وحشت کو کبھی کبھی لوٹ کر آنے دیا جائے کیوں کہ کبھی کبھی جوش و ہیجان کا یہ ابال آدمی کے لیے مفید ہوتا ہے۔ اس طولانی لیکچر کی کسی کو ضرورت نہیں تھی، مگر چکوردی باز نہ آیا۔ اس نے بہرحال تقریر جھاڑ دی۔

ایک بار اور دستک ہوئی۔

جو کچھ ہو چکا تھا تیزی سے مسز مٹی کو سب یاد آ گیا۔

ایک دن پہلے، سہ پہر کے وقت، جنگل کے بیچوں بیچ ایک آجاڑ بنگلے تک پہنچنے کے لیے ان کی جیپ میلوں تک جھاڑیوں اور بکھری ہوئی چٹانوں کے درمیان بہت مشکل سے رستا تلاش کر رہی تھی۔ ایک زخمی تتلی جیپ کے پہیوں کی لپیٹ میں آ گئی اور مسز مٹی نے چیخ ماری۔ دردمندی اس کے چہرے پر مکھی کی طرح چپکی ہوئی تھی۔

"تم بڑی نرم دل ہو بیبی!" چکوڈی صاحب ریشہ خطمی ہوتے ہوئے بولا۔ اس کے گول مٹول چہرے پر جھونپڑی کی طرح اگی ہوئی مونچھ مسز مٹی کے چہرے کے اس قدر قریب پہنچ گئی کہ لگتا تھا دردمندی کا سارا ہی مکھی چاٹ لے گی۔

چکوڈی کی بیوی نے یہ سب دیکھا اور ایسے ناک سکوڑی جیسے کسی بدبو سے بچنا چاہتی ہو۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں، وہ سُوں سُوں کرنے لگی پھر ایک ایک سلیبل پر جھٹکا دیتے ہوئے بولی، "ہاں ہاں! مٹی صاحب جیسی عورتیں کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ زیادہ ہی نرم ہے۔"

ہمیشہ کی طرح اس کی بات سننے میں پرسرور تھی، مگر ہمیشہ کی طرح جب وہ بات کہہ چکی تو یوں لگا جیسے چکوڈی کی بیوی گردوپیش میں کوئی بیماری چھوڑ کر بیٹھی ہے۔

مٹی صاحب کا سگار گھوم کر لب کے دہانے کے کونے میں پہنچ گیا اور داڑھی کی گرفت میں جھک گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ بیٹھکی بولنا شروع کریں گے۔ تقریر کے دوران وقفے وقفے سے وہ سامعین کو بیاشارت سے دیکھتا بھی جائے گا کہ اب جو وہ دانش کے موتی رول رہا ہے تو کتنوں کی جھولی بھر سکتی ہے، کتنوں کی خالی ہے۔

مٹی کہنے لگا، "سچ پوچھیے تو چکوڈی صاحب، عورت ایک ایسی مسٹری ہے جسے میں آج تک حل نہیں کر سکا۔ ہر ایک بات کہوں گا، کہ یہ جو مسز مٹی کہلاتی ہیں ان میں کوئی سمجھ نہ آنے والی بات ایسی ضرور ہے جو میں شادی کے اتنے برس بعد بھی لٹکا ہوا ہوں۔ قسم سے، دشمن کی جان لینے سے زیادہ مزا ہے میری اس چاہت میں۔"

"اچھا چپ کرو! راکشس کہیں کا!" مسز مٹی چہرے پر رومال اور رومال پر چہرہ جھٹکتے ہوئے جیسے احتجاج کرنے لگی۔

اسی طرح اور کچھ دیر مسز مٹی نازک مزاجی دکھاتی رہی، اور چکوڈی کی بیوی کی جھنجھلاہٹ اور بیزاری بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ جیپ گھوم کر ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں بائیں ہاتھ پر ایک نصف دائرہ میدان سا تھا۔ تین طرف سے یہ میدان پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔

یہاں مسز مٹی نے اچانک شوفر کو حکم دیا، "روکو!" جیپ جھٹکے سے رک گئی۔ سب کود کر باہر آ گئے اور مسز مٹی کے ہاتھ کی سیدھ میں دیکھنے لگے۔ وہ تلوار کی طرح اپنا ہاتھ سونتے، پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہوئے ایک اکیلے ہرن کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ سب نے آنکھیں گڑا کر دیکھا۔ تاریک، چمکیلی چٹانوں کے مقابل بجلی کے ٹھہرے ہوئے

شعلے کی طرح یہ ہرن جیسے اس منظر میں جم کر رہ گیا تھا۔

لمحے بھر بعد وہ بلٹ جیپ کی وجہ سے اس کا جنگل میں گھسنے کا رستا بند تھا۔ اس لیے وہ ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی پر چھلانگیں مارنے لگا۔

چکوڈی کی بیوی کے سوا سب کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ اور مسز چکوڈی کی آنکھیں! وہ اس وقت آنکھیں نہیں تھیں، بندوق کی نال سے نکلی ہوئی دو گولیاں تھیں جو ہوا میں آگ لگاتی چلی جا رہی تھیں۔

اچانک ہرن نے بہت بڑا خطرہ مول لے لیا۔ وہ ان لوگوں کے قریب سے زقندیں بھرتا، جنگل میں داخل ہو گیا۔ شوفر شیامل کی بندوق کی نال اس وقت جیسے ہرن کی چھاتی پر جا لگی تھی۔

"شوٹ کرو!" مسز مٹی چیخی۔

شیامل نے گولی نہیں چلائی۔ اس نے بندوق کی نال زمین کی طرف جھکا دی، اور ہرن کو سنہری خنجر کی طرح گھنے سرسبز میں داخل ہو جانے دیا۔

آنکھوں کی بانچ جوڑیاں شیامل کے لیے اچانک زہر کی خس پھنکاریاں بن گئیں۔

جواب میں شیامل بولا، "وہ گابھن تھی صاحب، بچہ تھا پیٹ میں۔"

مایوسی اور غصے میں مسز مٹی کی آواز ایک دم گھٹ کر رہ گئی۔ اس نے ہکلاتے ہوئے بہ مشکل اتنا کہا، "بدتمیز! ایسی بیہودہ بات کہنے کی ہمت کیسے کی تو نے؟" لگتا تھا مسز مٹی رو پڑے گی۔

چکوڈی نے تسلی دی، "نا نا نا۔ طبیعت پر بار مت ڈالو میڈم! میں اب کے ایسا کچھ کر دوں گا کہ اگلا چانس تمھارا ہی ہو گا۔ بندوق گود میں رکھ کے بیٹھنا۔ ہاں؟"

مسز مٹی اب شوفر شیامل کے برابر آ بیٹھی۔ بدتمیز آدمی! صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کے جذبات کا اسے ذرہ برابر بھی خیال نہیں ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ یہ لفنگا اپنے مالک راجا صاحب کا سوتیلا بھائی تھا۔ شیامل شوفر، سورگیہ بڑے راجاجی کے بےشمار ناجائز بچوں میں سے ایک تھا۔ اگرچہ مرتبے کے اعتبار سے بہت نچلے درجے کی ناجائز اولاد تھا، کیونکہ اس کی ماں ریکولرائز نہ ہو سکی تھی، اسے کل وقتی کنیز کا درجہ ہی نہ مل سکا۔

شیامل، افسردہ سا آدمی، بعضوں کی نظر میں دل کش شخصیت کا مالک تھا۔ وہ بڑا ماہر شکاری تھا۔ سورگیہ بڑے راجاجی کا شاہی ناک نقشہ اسے ورثے میں ملا تھا۔ جب کہ راجا صاحب پیٹ بھر کے بدصورت تھے۔ رہی سہی کسر ان کی بےلگام عیاشیوں نے پوری کر دی تھی! زندگی کا سارا رنگ، سبھی رس چوس لیا تھا۔ بقول کسے اب تو نصیب میں ٹھنڈی گرمیاں ہی رہ گئی تھیں۔ عورتوں کے گرد منڈلاتے، انھیں سونگھتے پھرتے، ان سے پھوڑ کر اٹھ بیٹھ لینے سے راجا صاحب کی تسلی ہو جاتی تھی۔

بس اتنے ہی کے لیے راجا صاحب نے یہ جنگل میں بنگلہ ترتیب دیا تھا اور یہ تقریباً متروک بنگلا کہیں سے جھاڑپونچھ کے نکالا تھا۔

باقی رستے شیامل خاموش بیٹھا رہا۔ راجا صاحب کی مسلسل بک بک کا ذرا بھی جو اس نے اثر لیا ہو۔

وہ لوگ سہ پہر میں دیر سے بنگلے پر پہنچے۔ ہلکے ناشتے اور بوتل سے شغل کے بعد مردوں نے شکار کے لیے نکلنے کی تیاری کی۔ مگر شیامل نے جانے سے انکار کر دیا۔ راجا صاحب کچھ دیر تک جھاڑتا رہا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

اور کیوں کہ اچھا بھلا یوں کچھ ذہنی پر مسز متی کی نازک مزاجی کو دھچکا پہنچا تھا، اس لیے ظاہر ہے اس نے کہا کہ وہ بھی شکار پر نہیں جائے گی۔

چکوددی کی بیوی نے مسز متی کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔ مگر بلا سے دیکھا کرے۔ مسز متی جانتی تھی کہ اس عورت کو متی صاحب کے ساتھ لگ کر جانے کا بہترین موقع ملا ہے وہ یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے گی۔ اس کا میاں اس پاس ہی منڈلاتا رہتا تھا، مگر وہ پروا کب کرتی تھی۔ چکوددی صاحب تو اس لائق بھی نہیں تھا کہ تالی بجا کر مرغے مرغی کو بھگا دے۔

مسز متی اور شیامل کو بنگلے میں اکیلا چھوڑ کر بےبسی سے کندھے اچکاتی ہوئی، باقی پارٹی اندر جنگل میں گھس گئی۔

باقی رہ جانے والا سناٹا، جیسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد نامانوس آوازیں درہم برہم کر رہی تھیں، دہشت کے جھٹ پٹے میں مسز متی کے لیے ایک آسیبی تجربہ بنتا جا رہا تھا۔ اس نے بولا کر ایک اور گلاس بنایا اور چڑھا لیا، اکیلے ہی۔

اس وقت جیسے ایک دم مسز متی کو محسوس ہوا کہ شیامل کی یہ عندی اداسی اور خاموشی خود اس کے لیے چیلنج ہے۔

اس نے پوچھا، "شیامل، یہ کیا آواز ہے؟"

"شیر کی دہاڑ ہے میڈم۔"

برآمدے میں بچھی کرسی سے چھلانگ لگا کر مسز متی ہال کی طرف دوڑی، اور بوکھلاہٹ میں دروازے پر ہی گر گئی۔ اس وقت تک اس نے اٹھنے کی کوشش نہ کی جب تک کہ شیامل اٹھانے نہ پہنچ گیا۔ اور جب وہ پہنچا تو بس اتنا اٹھی کہ اس کی بازوؤں میں ٹھہر ہو سکی۔

پھر اپنے اس مصنوعی حادثے کے بارے میں ایک بھی لفظ کہے بغیر وہ خیرہ کن مسکراہٹ کے ساتھ بولی، "بڑے ماہر شکاری ہو۔ کیسی آسانی سے شکار گرا لیتے ہو۔"

شیامل کا دل اس بچے کی طرح کھٹا ہو گیا جسے کوئی سستا سا جھولی مرے مرے کھیل سکھا رہا ہو۔

باقی وقت اس نے فرمانبرداروں کی طرح گزار دیا مگر آخر تک اپنے لفنگے چہرے سے ایک رازدارانہ سی طنزیہ مسکراہٹ نہ ہٹائی، اور اسی مسکراہٹ نے مسز متی کی جیت کی ساری خوشی مٹی کر دی۔ جلد ہی اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کی توہین ہوئی ہے اسی کمینے کی طرف سے یہ دہرا چیلنج تھا۔

راجا صاحب اور پارٹی واپس آئی تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ مسز متی تھک کر سوتی رہی، اور گھنٹہ بھر بعد اب جب اٹھی تھی تو اسے بخار سا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ جیسے ہی اس کی نظر چکوددی کی بیوی پر پڑی، وہ سمجھ گئی کہ یہ عورت بہت سی باتیں قیاس کر کے بیٹھی ہے، جبھی اس کی آنکھیں شیامل پر ٹکی ہوئی ہیں۔ شیامل ہال کے ایک کونے میں پڑا گہری نیند سو رہا تھا۔ اور مسز چکوددی آنکھیں گڑائے اسے برابر گھورے جا رہی تھی۔ اس کی بھیانک آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اپنے ساتھ کی گئی اس دغابازی کو کس شدت سے محسوس کر رہی ہے۔

متی صاحب آتے ہی کہنے لگا، "ڈارلنگ! مسز چکوددی کو سارے وقت یہی فکر ستاتی رہی کہ تمہیں اکیلا چھوڑ آئے ہیں۔۔۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔۔۔ ایں؟"

مسز متی ابھی تک چکرائی ہوئی تھی، مگر اس نے فوراً ہی فیصلہ کر لیا کہ چکوددی کی عورت کا شبہ دور کرنا ضروری ہے ساتھ ہی اس سوتے ہوئے منحوس شیامل کی طنزیہ مسکراہٹ بھی مٹانا ہے۔ اس بدبختی کی حد تک احسان فراموش ہونٹوں پر یہ مسکراہٹ صاف بڑھی جا رہی تھی۔

چنانچہ وہ پھٹ پڑی۔ مسٹر متی کی بیلٹ میں ہاتھ ڈال کر وہ اسے کھینچتی ہوئی ہال میں لے آئی۔ "تمہیں خبر ہے؟ خبر ہے ایسے۔ اس وحشی نے میرے۔۔۔ مجھے۔۔۔ میں تو بھی اسے وا جوتے نکالتی ہیں۔۔۔ ابھی ٹھکانے کی ہے حرام زادے۔۔۔"

"کیا؟ کیا اس شیامل نے۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ ہاں جی! ایسا بھیانک۔۔۔ او ہمارا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا حرامی نکلے گا یہ۔"

کچھ دیر تک ایک بھاری بےڈھب سناٹا طاری رہا۔ راجا صاحب، جو ہمیشہ سے اپنے اس شوفر سے ایک نامعلوم سی کد رکھتا تھا، سوتے ہوئے شیامل کی طرف طیش کے عالم میں پھر چکتا ہوا بڑھا۔ اس کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ راجا صاحب گہرے گہرے سانس لے رہا تھا اور اتنی دیر میں پسینے میں تر ہو چکا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

اندھیرے میں چکوددی صاحب اور متی صاحب اکڑی ہوئی لاشوں کی طرح بےحرکت تھے۔ لگتا تھا دو لٹھے فرش میں گڑے ہوئے ہیں۔ یہ ساکت منظر ایک لمحے بعد اچانک مسز چکوددی کی سسکیوں سے درہم برہم ہو گیا۔ وہ سسکتی ہوئی جھپٹی اور نہایت غصے میں

Scanned with CamScanner

اس نے شیامل کو ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔

شیامل ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، مگر اس کی حیرت اور سراسیمگی عارضی تھی۔ مسز مٹی کے سوا سب کے سب چکوڑی کی عورت کی پیروی میں اس پر پل پڑے۔ اس پر اتنی وحشت سے لاتیں اور گھونسے برسائے گئے کہ وہ بیہوش ہو گیا۔ اس وقت تک مسز مٹی کی ہسٹیریائی ہنسی بتدریج بڑھتی ہوئی سب سے اونچے سُر پر پہنچ گئی تھی۔

وہ شیامل کو کھینچ کر اس چھوٹے سے کمرے میں پھینک آئے جہاں انھوں نے ابھی ابھی ایک نیم مردہ سوّر ڈالا تھا۔

اس کے بعد وہ ہانپتے ہوئے صوفوں پر ڈھیر ہو گئے۔

چوکی دار سے کہہ دیا گیا کہ اب جائے۔ اسے یہاں صبح سویرے آنا ہو گا۔ پھر دروازوں کی چٹخنیاں چڑھا دی گئیں۔ وہ سب کے سب اونچی دیواروں والے کچن گارڈن میں نکل آئے، جہاں انھوں نے الاؤ جلایا اور دائرے میں بیٹھ کر پینے پلانے لگے۔ بعد میں کسی وقت وہ اندر سے اپنا شکار کیا ہوا سوّر کھینچ لائے۔ اسے آگ پر ڈال دیا۔ پھر پارچے کاٹ کاٹ کر وہ لوگ آدھی کچی آدھی پکی ہوئی بوٹیاں کھاتے، ناچتے اور گاتے رہے۔

رات میں دیر تک یہ جشن جاری رہا۔

ایک بار پھر دستک ہوئی۔ مسز مٹی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا، ابھی اندھیرا تھا۔

اور تب، خبر نہیں کہاں سے، خوف و دہشت کی ٹھنڈک اس کے وجود میں اترتی چلی گئی۔ پسینے بن کر اس کے روم روم سے خارج ہونے لگی۔

اس نے آوازیں دے دے کر سب کو اٹھا دیا۔ چوکی دار نے اس کی آواز سن لی اور دستک دینی بند کر دی۔

سب سے پہلے بات کرنے والا راجا صاحب تھا۔ "بیٹو! سب لوگ کو گڈ مورننگ! کچھ چائے وائے کا بندوبست کیا جائے۔ آؤ۔۔۔ ذرا دیکھیں اس سالے شیامل کا کیا حال ہے۔"

راجا صاحب اس چھوٹے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں شیامل کو پھینکا گیا تھا۔

"نہیں۔۔۔ پلیز نہیں!" مسز مٹی چیخنے لگی۔ اس نے راجا صاحب کو کمرے کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔

راجا صاحب حیرت میں ہکلانے لگا: "مم۔۔۔ مگر کیوں؟"

مسز مٹی کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ بولی، "فرض کرو اس کمرے میں تمھیں سوّر پڑا ہوا ملے، شیامل کی بجائے؟"

"مگر ہم نے سوّر تو بھون کے کھا لیا تھا پچھلی رات! کھا لیا تھا نا؟"

"فرض کرو تمھیں اندر سوّر ملے، شیامل کی بجائے؟"

"لیکن ہم نے تو۔۔۔ کیوں بھئی؟۔۔۔ سوّر تو کھا لیا تھا نا؟"

"فرض کرو سوّر ملے، شیامل کی بجائے؟"

وہ سب کافی دیر تک خاموش رہے۔

کسی نے کہا: "کچن گارڈن میں جا کے تو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ سوّر کا کافی حصہ ادھر پڑا ہونا چاہیے۔"

"نو کانٹ سیکٹا! کچن گارڈن میں مت جانا!" مسز مٹی اور مسز چکوڑی ایک ساتھ چیخنے لگیں۔ "اگر وہاں سوّر کی ہڈیاں نہ پڑی ہوئیں۔۔۔ تو؟"

سنّاٹا لپیٹا کر لوٹ آیا۔ بنگلے کے عقب میں سیار بولنے لگے۔ ان پانچوں میں سے ہر ایک کسی دوسرے کو لرزتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔

دو گھنٹے بعد جب مٹی صاحب جیپ چلا رہا تھا اور باقی لوگ ریت بھرے تھیلوں کی طرح بے جان بیٹھے تھے، راجا صاحب کوشش کر کے ہنسا، کہنے لگا۔ "مسز مٹی، تمھاری کلپنا یا شاید خواب بھی کیسا فنٹاسٹک تھا۔۔۔ بھئی جو بھی ہو ماننا پڑے گا۔۔۔ تم نے تو سبھی کا خون خشک کر دیا تھا۔۔۔ اوریجنل ہو آپ بھی؟"

مسز مٹی یا کسی اور کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو راجا صاحب پھر بولا، کہنے لگا: "ویسے تو میں نے چوکی دار کو سمجھا دیا ہے۔ پہلے بھی یہ آدمی میرے بہت سے مشکل کام کر چکا ہے۔ میں نے سمجھا دیا ہے، وہ سب بندوبست کر دے گا۔۔۔ مطلب ہے اگر واقعی پچھلی رات ہم لوگوں سے کوئی۔۔۔ کوئی گڑبڑ ہو گیا ہے تو وہ سنبھال۔۔۔ ویسے، یار، مسز مٹی بلاوجہ ہی ڈر رہی تھیں، جیسے لوگ بھوت پریت کو بلاوجہ ہی سچ کر لیتے ہیں۔"

"کسی بھی نہیں تھا صاحب۔" چکوڑی صاحب اور مٹی صاحب دونوں بولے، "رات تو سبھی کو پکا یقین تھا۔۔۔ یہ صفا حماقت تھی جو ہم نے کمرہ نہیں کھولا، یا کچن گارڈن میں نہیں گئے۔"

راجا صاحب کہنے لگا: "بھئی کہہ نہیں سکتے کہ بھوت ووت صرف وہم ہوتا ہے یا کوئی اصلیت بھی ہوتی ہے۔ بنگلے کے لیے تو اڑا رکھا ہے لوگوں نے کہ وہاں کوئی اثر وثر ہے۔۔۔ سنا ہے بھوت پریت ہر قسم کی بدمعاشیاں کرتے ہیں۔ کیا لگے ہم سب کی کھوپڑی پھرا دی ہو، الو بنا دیا ہو، کچھ کا کچھ دکھا دیا ہو سب کو۔۔۔ ہا ہا۔" راجا صاحب کوشش کر کے پھر ہنسا۔

اچانک مسز مٹی سسکیاں بھرنے لگی اور چکوڑی کی عورت نے ہسٹیریا کی مریضہ کی طرح ہنسنا شروع کر دیا۔ باقی تینوں آدمی جیسے پھر ریت کی بوریاں ہو گئے۔

عورتوں کی سسکیاں اور ہنسی بے رحمی سے کھلتی ہوئی اور غراتی ہوئی ان کی جیپ چلتی رہی، جھاڑیوں اور بکھرے ہوئے پتھروں کے درمیان راستا بناتی ہوئی، چلتی رہی۔

Scanned with CamScanner

ضمیر الدین احمد

گنگا سے گنگا تک

(ایک نامکمل ناول کا پہلا باب)

"یہ جگہ دیکھ رہے ہو، ساجد میاں؟"

ساجد کی نظریں اُدھر مڑ گئیں جدھر آغا میاں کے ہاتھ نے اشارہ کیا تھا۔ ایک کھلا میدان، جس کے داہنی جانب فوجی بارکیں ترچھی قطاریں باندھے کھڑی تھیں اور جو کسی چوڑے، بھاری سینے، پتلی کمر اور چوڑے، بھاری کولھوں والی عورت کے جسم کی مانند ان بارکوں کے بیچ میں سے سمٹتا سکڑتا گزر کر پیچھے کی جانب پھر پھیل گیا تھا۔

"یہاں قیدیوں کو رکھا گیا تھا۔"

"کون سے قیدی؟"

"آپ بھی کمال کرتے ہو ساجد میاں؟" وہ تانگے کے اگلے حصے میں شبراتی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جو گھوڑے کو رہ رہ کر بلاوجہ ٹٹکتا رہا تھا۔ انھوں نے پہلو بدل کر منھ ساجد کی طرف کیا۔ "وہی، تمہارے پاکستانی۔ کیا کہتے ہیں انھیں۔ پرزنرواز قیدی۔ اور کون؟"

تانگے کا پہیا کسی پتھر پر یا کسی گڈھے میں آ گیا۔ ساجد اچھلا اور اس کا سر تانگے کی چھت سے ٹکرایا جس کا فریم لوہے کا تھا۔ اس کے منھ سے اضطراری طور پر "سی" نکل گئی۔

شبراتی نے گھوڑے کے چابک رسید کیا اور پھر ساجد سے اپنے انداز میں معذرت خواہ ہوا۔ "چوٹ تو نہیں آئی میاں؟"

"نہیں۔" ساجد ابھی تک سر سہلا رہا تھا۔ "بات یہ ہے شبراتی کہ اب تانگے میں بیٹھنے کی عادت نہیں رہی۔ اس میں تو سواری کو ہر وقت چوکس رہنا چاہیے۔ رستا اوبڑکھابڑ ہو تو اور بھی۔"

"سو تو ہے میاں!" شبراتی نے ان سے نظریں ملاتے ہوئے آغا میاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی یہ تو کچا تھا بستی والے رستے چلو۔"

"اسے بند کرنا ہے اپنا بھونپو کہ لگاؤں ایک؟" اور آغا میاں نے چپت رسید کرنے کے انداز میں اپنا داہنا ہاتھ اٹھا بھی لیا۔ "یہ سڑک کون سی خراب ہے؟ آ گیا ہو گا کسی پتھر وتھر پر پہیا۔"

خالی ہاتھ سے اپنے سر کی، جس پر ایک میلی چیکٹ ٹوپی منڈھی ہوئی تھی۔ ایسی آڑ کر کے جیسے آغا میاں سچ مچ اس کے چپت لگانا چاہتے ہوں، شبراتی کھی کھی ہنسا۔

آغا میاں نے مڑ کر شاہد کی طرف دیکھا جو پیچھے ساجد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، اور آنکھ مار کر مسکرائے۔ شاہد نے ان کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا، گویا انھیں یقین دلا رہا ہو کہ اسے ان کا یہ بزرگانہ مسخراپن بھلا لگا ہے۔

اچانک ساجد کی سمجھ میں آیا کہ آغا میاں نے اس راستے فرخ آباد جانے پر کیوں اصرار کیا تھا۔ مجھے یہ پھیلتا، سکڑتا اور پھر پھیلتا میدان دکھا کر میرا امتحان لینا چاہتے تھے۔

"آپ کے سر کی قسم آغا میاں! مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ پاکستان کے جنگی قیدی یہاں بھی رکھے گئے تھے۔ مجھے تو بس یہ معلوم ہے کہ کوئی ایک لاکھ نے ہتھیار ڈالے تھے۔"

"سنا تو نے شبراتی؟ ساجد میاں کہتے ہیں انھیں بالکل پتا نہیں تھا۔ اور قسم بھی کھائی تو میرے سر کی! دنیا جہان کی باتیں انھیں معلوم رہتی ہیں۔ پر یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے فوجی یہاں بھی مہمان رہے تھے۔ ان کے اپنے فتح گڑھ میں۔" آغا میاں کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ انھیں ساجد کی بات کو سچ ماننے میں دقت پیش آ رہی ہے۔

تانگا اتار پر رہا تھا۔ شبراتی کھسک کر بم پر آ گیا۔ "بچاروں میل دور میاں کو ادھر کی ساری خبریں تھوڑی ملتی رہی ہوں گی۔ ہے نا میاں؟"

"ہاں؟"

اسی وقت دو تصویریں منھ پونچھتی، بال جھٹکتی، کپڑے جھاڑتی اس کی یادوں کے تہ خانے سے نکلیں، اور ساجد کو گویا آغا میاں کے شک اور طنز کا جواب مل گیا۔

"واقعی آغا میاں! مجھے بالکل نہیں معلوم تھا۔ شاید اس لیے کہ ان دنوں میں خبروں اور اخبار وغیرہ سے دور ہی رہتا تھا۔ بس کبھی کبھار ٹی وی پر خبریں سن لیتا تھا۔ اور یہ خبر میں نے ٹی وی پر ہرگز نہیں سنی۔"

آغا میاں چپ رہے۔

"ایک دن دیکھا — یہ ہتھیار ڈالنے کے فوراً بعد کی بات ہے — کہ ایک سڑک کے دونوں طرف بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ جیسے لوگ باگ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کے بیچ میں سے پاکستانی فوجی ریلے کی طرح گزر رہے ہیں، اور ایک ہندوستانی نوجوان کسی چیز سے — غالباً کسی چیز سے — شاید کسی فوجی ٹوپی سے ہر گزرتے ہوئے فوجی کو مار رہا ہے۔ اور ٹی وی پر یہ بھی دیکھا — شاید اسی دن — کہ ایک فوجی افسر، ہندوستان کا کوئی فوجی افسر، کسی ٹینک یا کسی فوجی گاڑی پر کھڑا چلا چلا کر پاکستانی موجود کو گالی دے رہا ہے۔ ہو باسٹرڈ پاکستانیز؟"

شبراتی نے سدھائے جانور کی پیٹھ پر ایک چابک جڑ دیا۔ بلاوجہ۔

Scanned with CamScanner

"باسٹرڈ انگریزی میں..."

اقا میاں نے ساجد کی بات کاٹ دی۔ "اتنی انگریزی تو ہمیں بھی آتی ہے ساجد میاں! بوباسٹر حرامی کو کہتے ہیں۔ نطفۂ ناتحقیق کو۔"

انھوں نے کنکھیوں سے شاہد کو دیکھا۔ شاہد پھر مسکرایا۔ اقا میاں خوش نظر آئے۔

"میں تو اُن دنوں ادھر سے گزرتے کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ پر سنا ہے ایسی گالیاں تو میاں اِن پر روز پڑا کرتی تھیں!"

دو منٹ میں ایک آدھ پھیرا فرخ آباد کا اس وقت بھی ہوتی جاتا تھا۔" شیراتی چنگیرے گھوڑے کی کلنی سے مخاطب ہوا۔ "سواریاں اچھی خاصی چپ چاپ بیٹھی ہیں، یا آپس میں باتیں کر رہی ہیں۔ پر فیدیوں کا کیسے آیا نہیں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ، چوکھٹے ادھر کو۔ دو ایک گالیاں سنا ڈالیں۔ چاہے آواج زبان تک پہنچتی بھی نہ ہو۔ اور گالیاں بھی کیسی؟" اس نے مڑ کر ساجد کو دیکھا، مگر کوئی تمرہ پیش نہیں کیا۔ "بڑی گندی گالیاں دیتی تھیں جی! ایں کے تو کان جلنے لگتے تھے۔ اور ادھر سے آئے ہوئے تو اپنی جبان میں گالیاں بکتے تھے۔ سالے ڈکے، ہمیں ڈکے..."

"اپنی گالی اپنی زبان میں مزا دیتی ہے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ جیسے دی جائے اس کی زبان بھی وہی ہو؟" اقا میاں شیراتی کو گالی دیتے اور گالی کھاتے کا یہ نکتہ سمجھانے کے بعد ساجد سے مخاطب ہوئے۔ "تمھاری انگریزی ویسے چاہے کتنی بڑھیا زبان ہو، پر گالیوں کی زبان ایک دم نہیں۔ بلاڈی فول، بوسٹرڈ؟" وہ رکے۔ مگر انھیں انگریزی کی کوئی اور گالی یا تو یاد نہیں آئی یا یاد نہیں تھی۔ "یہ بھی کوئی گالیاں ہوئیں! اس سے بڑھ کالیاں تو میں بچپن سے شیراتی کو اپنی اردو میں دیتا ہوں۔" انھوں نے شیراتی سے تصدیق چاہی۔ "کیوں میاں دیتا ہوں کہ نہیں؟"

شیراتی نے مسکرا کر فخریہ سر ہلایا۔ "ہروبر!"

"اُلو کا پٹھا، تخم حرام، حرامی، موتہ، گدھے کا بچہ!" مثالیں پیش کرتے کرتے اقا میاں کو کچھ یاد آ گیا۔ "کیوں بے شیراتی! تجھے وہ دن یاد ہے جب گاڑی ہکنے پر شیراتی کو اندر کر دیا گیا تھا؟" اور اس سے پہلے کہ شیراتی جواب دے، انھوں نے کہا، "نہیں تجھے کہاں یاد ہو گا۔ تُو تو بہت چھوٹا رہا ہو گا اس وقت!"

مگر شیراتی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "مجھے اچھی طریوں یاد ہے۔"

"اچھی طریوں یاد ہے تو بتا..." اقا میاں کا لہجہ تیز ہو گیا۔

"چھوٹا تھا، پر اتّا چھوٹا بھی نہیں تھا۔ دس سے اوپر کا تھا۔ مجھے اچھی طریوں یاد ہے۔ اماں کا رو رو کے بُرا حال ہو گیا تھا۔" شیراتی کو سب کچھ یاد تھا۔ اسے یاد تھا کہ اس دن سارے قصبے میں اس کے ابّا کی بات ہو رہی تھی۔ اور اسے یہ بھی یاد تھا کہ جب اس کے ابّا حوالات سے چھوٹے تھے تو دیوان جی نے انھیں دو ایک موٹی موٹی گالیاں دے کر — اور اِن

کے چوتڑوں پر اپنا موٹا ڈنڈا برسا کر" — کہا تھا، "شکر کر کہ دروغہ جی اتنے رحمدل ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو غداری کے جرم میں دھروا دیتا۔"

"لیکن ہوا کیا تھا؟"

اور اس سے پہلے کہ شیراتی یا اقا میاں منھ کھولیں، ساجد نے شاہد کے سوال کا جواب دیا۔ "گڑالی کا زمانہ تھا۔ خیراتی — شیراتی کے والد — ٹرنک میں رہے ہوں گے۔ کوئی سواری لے کر کچہری جا رہے تھے۔ گھوڑا مریل تھا۔ تانگا رینگ رینگ کے چل رہا تھا۔ عین کوتوالی کے سامنے انھیں غصہ آ گیا۔ بولے، ابے سالے! یہ کیا انگریزوں کی چال چل رہا ہے۔ ہٹلر کی چال چل! بس، دھر لیے گئے۔"

"کمال ہے!" شیراتی نے سچ مچ حیران ہو کر کہا۔ "ساجد میاں تو بھی یاد ہے؟"

ساجد نے کہا، "اچھی طریوں!"

ساجد نے آنکھیں کھول دیں۔ باہر درخت، باغ، کھیت، کچھ کھروندے، پکے مکان، تار کھمبے، ٹمٹماتی روشنیاں رقص کرتی ہوئی پاس آ رہی تھیں، دور جا رہی تھیں۔ دھندلے شیشے میں سے لپٹرے ہوئی چاندنی اور لپٹری نظر آ رہی تھی۔ فراق جیسی جس پر سے آنسوؤں کا کٹی۔ وہ ٹرین کو کچھ دیر آنسوؤں کی کٹی، کی کٹ پر چلانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر پہیوں نے اس کا کہنا نہ مانا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"یہ تمھارے سکڑ دادا کی قبر ہے۔"

کالی پکی سڑک کے اس طرف حویلی کی چاردیواری اور اس کا بلند چوبی دروازہ، اور اس طرف قبرستان، جس کے بیچوں بیچ املی کا ایک بوڑھا درخت، جس کی شاخیں کئی قبروں پر سایہ کیے ہوئے تھیں۔ اور ان میں سے سب سے نمایاں اور اونچی ایک پکی قبر جس کے گنج پر کالی جمی ہوئی تھی اور جس کا تعویذ زمین سے کم از کم تین فٹ بلند تھا۔

"سکڑ دادا کتنے نمبر پہلے آتے ہیں؟"

ساجد نے جلدی سے حساب لگایا۔ "تمھارے دادا کے والد ہی سے شروع کریں تو تم چھٹے نمبر پر آتے ہو۔"

"سب سے پرانی معلوم ہوتی ہے!" شاہد نے قبر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا، جس کا گنج دو ایک جگہ سے اکھڑ گیا تھا اور اندر سے ککیا اینٹیں جھانک رہی تھیں۔

"ہاں! یہ ہمارے اس خاندانی قبرستان کی سب سے پہلی قبر ہے۔" ساجد نے احتراماً قبر کے ایک حصے پر سے املی کی سوکھی پتّیاں ہٹاتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے جدامجد کا ذکر شاہد سے کئی بار بڑے فخر سے کر چکا تھا، اور اسے بتا چکا تھا کہ "غدر" کے زمانے میں اس "انگریز دشمن" فخرِ خاندان کو پھانسی پر چڑھایا گیا تھا۔ مگر اس نے شاہد یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ

Scanned with CamScanner

پھانسی کہاں گاڑی تھی جس پر اس "سورما" کو چڑھایا گیا تھا۔

"ہاشم علی خان کو یہیں پھانسی دی گئی تھی"

"یہاں؟ قبرستان میں؟"

"ہاں! تمہارے دادا جی بتاتے تھے کہ پہلے یہ جگہ قبرستان نہیں تھی۔ بس ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ انگریزوں نے غدر کے زمانے میں یہیں پھانسیاں گاڑیں۔ ہاشم علی خان یہیں دفن ہوئے اور اس طرح یہ ہمارا خاندانی قبرستان بن گیا۔" ساجد چند لمحے چپ رہا، پھر اس نے کہا

"ہمارا سلسلہ نسب انہی لوگوں سے ملتا ہے۔ اسی قبر سے شروع ہوتا ہے۔"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر ساجد نے شاہد کا بازو پکڑ کر کہا، "آؤ"، اور دونوں ایک قبر کی جانب بڑھے جو ہاشم علی خان کی قبر سے سات آٹھ گز کے فاصلے پر تھی اور جس کا کتبہ ساجد نے قبرستان میں داخل ہوتے ہی پڑھ لیا تھا۔ "یہ تمہارے دادا کی قبر ہے"

قبر اچھی حالت میں تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ کل پرسوں ہی اس کی صفائی کی گئی ہے۔ ساجد نے پتلون کی جیب سے رومال نکالا اور کھول کر سر پر ڈال لیا۔ شاہد نے اس کی تقلید کی۔

"سورہ فاتحہ یاد ہے؟"

جواب میں شاہد نے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھا

"الحمد۔۔۔"

"ہاں!" شاہد نے جلدی سے کہا۔ "وہ تو یاد ہے!"

دونوں نے ہاتھ اٹھائے اور ساجد یہ سوچتا رہ گیا کہ جانے اسے یاد بھی ہے یا نہیں، محض خوش کرنے کو ہی کہہ دیا تھا۔ اس نے بے چینی سی محسوس کی۔ اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔ وہ پڑھتا رہا۔ فاتحہ اتنی آہستہ ہو گئیں کہ صاف سنائی نہیں لگیں۔ فاتحہ پڑھنے کے دوران میں ساجد کی نظریں کئی بار قبرستان کے اُس پار تکیے کی طرف اٹھیں جس کی ایک کچی کوٹھری کے سامنے پڑے ہوئے چھپر کے نیچے ایک عورت ایک جھلنگا سی چارپائی پر بیٹھی کچھ سی رہی تھی اور اب ہاتھ روکے بیٹھی جھانک رہی تھی۔ دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ فاتحہ پڑھ چکنے اور منہ پر ہاتھ پھیرنے اور رومال کو سر سے اتار کر دوبارہ تہہ کر کے پتلون کی جیب میں رکھنے کے بعد ساجد مڑا تو اس نے اسی عورت کو لال چھینٹ کے پیوند لگے سیدھے پاجامے اور لال نور کی قمیص میں پاس ہی کھڑا پایا۔ اس کے پاس ایک مرد کالی تہمد اور گاڑھے کی میلی سپید کرتے پر نیلی صدری پہنے کھڑا تھا۔ اس کا سر سپید تھا اور اس کی آنکھوں میں لال ڈورے تھے۔ دونوں نے ساجد کو سلام کیا۔

"پہچانا ساجد میاں؟" مرد نے پوچھا۔

"بھئی معاف کرنا، یاد نہیں آ رہا۔" حالانکہ ساجد دیکھتے ہی دونوں کو پہچان گیا تھا۔

"میں بادشاہ ہوں، ساجد میاں۔ بادشاہ!"

تب ساجد نے "ارے بادشاہا!" کہہ کر اسے کھینچا اور گلے لگا لیا۔ "تو پھر یہ بتولی ہوئی؟" اس نے جس تیزی سے بادشاہ کو کھینچ کر گلے لگایا تھا اسی تیزی سے اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ بادشاہ کے کپڑوں سے چرس کی بو آ رہی تھی۔

بتولی ساجد کے منہ سے اپنا نام سن کر اس عمر میں بھی شرمائی، لجائی اور پھر ہنس دی۔

"سلام کرو میاں کو!" بادشاہ نے اسے حکم دیا۔

بتولی نے ساجد کو پھر سلام کیا۔

"اور یہ چھوٹے صاحب ہوں گے؟" بادشاہ نے کہا

"ہاں!" ساجد نے کہا، "ان کا نام شاہد ہے۔"

"بالکل میاں کی شکل ہے!" بتولی بولی۔

شاہد نے دونوں کو ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ دونوں کے چہرے کھل اٹھے۔ دونوں نے اسے بہت ساری دعائیں دے ڈالیں۔

"شہنشاہ کیسے ہیں؟" ساجد نے پوچھا۔

بادشاہ فوراً آنکھوں میں آنسو لے آیا۔ "ان کو گزرے ہوئے تو اس اوپر دو بارہ برس ہو گئے!" اس نے ساجد کے والد کی قبر کی طرف دیکھا۔ "میاں کے انتقال کے کچھ ہی دنوں بعد چل بسا!" جیسے ساجد کے والد کا انتقال نہ ہوا ہوتا تو شاید اس کا باپ بھی نہ مرا ہوتا۔

بتولی آنکھوں میں آنسو لانے میں ناکام رہی۔ اس نے اپنی خشک ناک سڑکنے پر اکتفا کیا۔

"بہت افسوس ہوا سن کر!" ساجد نے کہا اور اس سے اسے یاد آیا کہ بابے بچپن میں کبھی کبھی انھیں بہت لڑاتی جھگڑا، ٹوٹو میں میں۔

"ہاں میاں!" بادشاہ نے اپنے خالی ہاتھ کی پشت کو دونوں آنکھوں پر پھیر کر کہا۔ "اب تو اپنی باری ہے!"

"نہیں، بادشاہا!" ساجد نے اخلاقاً اس سے اختلاف ضروری سمجھا۔ "تم ابھی اور بہت دن جیو گے!"

اب بادشاہ کی باری تھی۔ اس نے مصلحتاً ساجد سے اختلاف ضروری سمجھا۔ "نہیں ساجد میاں! اس سالی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں! اب اپنے میاں ہی کو دیکھو، جھٹ پٹ ہو گئے!"

تکیے کی کچی گھروندوں کے دروازوں میں جوان اور بوڑھی عورتوں کے سر نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے اور کئی بچے بچیاں [illegible] کسی کی [illegible]

Scanned with CamScanner

بھٹی ہوئی کسی کے گلے میں تعویذ، کوئی سجدے میں سکتا، سب کے سر میلے چیکٹ، سب سوکھے ہوئے... لیکن کھسکتے قبرستان کی طرف گئے تھے۔

ساجد نے محسوس کیا کہ کھلے ہوئے والا میں اس نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو کا ایک نوٹ کو اندر ہی اندر تہہ کر کے اس صفائی سے نکالا کہ بادشاہ کو بھی نظر نہ آیا۔ حالانکہ اس کی آنکھیں اسی لمحے سے لگاتار ساجد کے ہاتھ کا تعاقب کر رہی تھیں۔ جب وہ جیکٹ کی اندرونی جیب کی طرف بڑھا تھا۔ ساجد نے بادشاہ اور سوالی کی طرف پیٹھ کر کے وہ تہہ کیا ہوا نوٹ شاہد کو دیا اور اس سے انگریزی میں کہا کہ یہ عورت کو دے دے۔ شاہد نے آگے بڑھ کر وہ تہہ کیا ہوا نوٹ سوالی کو دے دیا۔ پتوں نے نوٹ ادھا کھول کر دیکھا پھر [illegible] آنکھوں کے پاس لے گئی۔ اس کے چہرے میں آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے جلدی سے نوٹ کو پھر تہہ کر کے مٹھی زور سے بند کر لی اور جہاں کھڑی تھی وہیں سے ایک قدم بھی آگے بڑھے بغیر، ایک کھلے اور ایک بند ہاتھ سے شاہد کی کنپٹیوں کو چھو کر اس کی بلائیں لے ڈالیں، اور ایک بار پھر شاہد پر دعاؤں کی بارش ہونے لگی۔ جگ جگ اور ہزار برس جینے کی دعا، دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو کی دعا، چاند سی بہو بیاہ کر لانے کی دعا، بری نظر سے بچنے کی دعا، "فرنچ" پر ہاتھی جھومنے کی دعا، اور اونچے "عہدے" کی دعا۔ [illegible] دعا بادشاہ نے [illegible] دعاؤں کی [illegible] بار بار [illegible] کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

"یہ چلی گئی؟" [illegible] ساجد سے اجازت مانگی۔

"ہاں۔"

"سب ٹھیک ٹھاک ہے؟" اس نے مڑ کر پہلے ساجد کی والد کی قبر کی جانب ایک مبہم سا اشارہ کر کے پوچھا۔

"ہاں۔"

دونوں نے دونوں کو سلام کیا۔ بادشاہ چلنے کو ہی تھا، مگر ہوئی ہچکچاہٹ۔ شاید وہ مزید اظہارِ تشکر کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے کرے۔

"یہ چلی ہی گئی؟" بادشاہ نے اسی غصہ کی نگاہوں سے دیکھا۔

سوالی نے جلدی سے ساجد اور شاہد کو پھر سلام کیا اور بادشاہ کے پیچھے ہو لی۔ جو ان بچوں کو ڈانٹ کر بھگا رہا تھا جو قبرستان کے کنارے جمع ہو گئے تھے۔

"یہ دونوں میں لوٹ ہو گی۔" ساجد نے، ہاشم علی کی قبر کی جانب بڑھتے ہوئے، مڑ کر پیچھے کوئی کی سمت میں کہا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"کیوں؟"

"بادشاہ کہے گا سب مجھے دو۔ ہتولی کہے گی ہرگز نہیں، مجھے پانی میں ڈبو دے گا۔ یہ

ہاتھ پہنچنے کا دستور ہے کہ کروں دھماس؟ وہ کہے گی جا بے بدی ہستی ایک کو دے پر تجھے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دوں گی۔" ساجد قبر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور شاہد بھی۔ "گالم گلوچ ہو گی۔ شاید جوتم پیزار بھی۔ سارا تکیہ جمع ہو جائے گا پھر مجمع بجاور ہو گا اور میرے خیال میں فیصلہ آدھے آدھے پر ہو گا۔ فیصلہ جیسے جو بھی ہو، آج بادشاہ دم لگائے کے بعد بوتل کا خوب سرور پائے گا۔ فتح گڑھ کی بوتلیں بہت اچھی ہوا کرتی تھیں!"

"دم کرتا ہے؟" شاہد نے انگریزی میں پوچھا۔

"اپنا ویسا! اس وقت بھی کپڑوں سے چرس کی بو آ رہی ہے۔ ان لوگوں میں—" ساجد نے تکیے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا، "یہ عادت خاصی عام ہے۔"

"کوئی قانونی پابندی نہیں؟" شاہد نے پھر انگریزی میں پوچھا۔

ساجد مسکرایا۔ "گانجے، چرس، بھنگ، افیم کا ادھر، خاص کر ایسے لوگوں میں، ہزاروں برس سے رواج ہے۔ کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ کوئی پابندی نہیں۔ نہ لیگل نہ سوشل۔"

شاہد نے تکیے کی طرف دیکھا۔ کچھ نظریں ابھی تک ان کی اور ساجد کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے قبرستان پر ایک نظر ڈالی جس میں کوئی قبر نئی نہیں تھی۔

"قبریں کھود کر ان کا کام چل جاتا ہے؟"

"خالی قبریں تھوڑی کھودتے ہیں۔ بھیک بھی مانگتے ہیں۔ اور اب پتا نہیں پہلے تو شادی بیاہ میں بینڈ باجا بھی بجاتے تھے۔ ڈھول، شہنائی، نفیری۔ ایک آدھ ساتھ لڑکی یا ایک آدھ ساتھ چھوٹی گھنٹی ہوتی لال پیلی وردیاں اور بھنووں تک آتی ہوئی انگریزی ٹوپیاں پہن کر۔ نہ تال، نہ سُر، نہ گت، نہ سر۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے کو جی چاہتا تھا۔ شادی بیاہ کا کھانا بھی جاتا تھا پیٹ بھر کے کھانے کو، اور کچھ نقدی بھی۔ یہ الگ بات کہ بیچاروں کو بہت انتظار کرنا پڑتا تھا۔ جب سب کھا پی چکتے تھے تب ان کی باری آتی تھی۔"

"اور یہ بادشاہ! یہ کیا ان کا چیف ہے؟"

"ایشل نہیں تو ان آفیشل۔ اس کا خاندان سالہاسال سے اس قبرستان کی رکھوالی کرتا آ رہا ہے، اور بدلے میں اس خاندان کو ہم لوگوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ پہلے ان کا ماہانہ بندھا ہوا تھا۔ جمعرات، عید بقرعید، شادی بیاہ الگ۔ ابا میاں بھی ہر مہینے کچھ نہ کچھ تو دیتے ہی رہے گا اور کچھ میں تو حویلی کی روایت قائم رکھے گا ہے۔ تم کیا سمجھے؟ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا؟"

"لگا تو ایسا ہی تھا۔"

ساجد ہنسا۔ "بہت بدمعاش ہے۔ اچھا خاصا ایکٹر! ابا میاں نے بتا دیا ہو گا۔ ورنہ قبریں کہیں اتنی صاف ستھری؟ معلوم ہوتا ہے سارے قبرستان میں جھاڑو لگائی گئی ہے۔ تم نے ایک بات نوٹ کی؟"

شاہد چپ رہا۔

"اس نے تمہاری عمر کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کی عمر تو ابھی [illegible] نہیں۔ ورنہ
جیوسی سے پوچھیں، بیگم صاحبہ بھی آئی ہیں؟ رہی خوش ہیں؟ بلکہ پہلے سے [illegible]
چکی ہوتی بیگم صاحب کو سلام کرنے اور دونوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ تمہاری ابھی
شادی نہیں ہوئی ہے۔"

"ابھی کب رہیں گی [illegible] جانے سے پہلے کی [illegible] کسی قسم ہیں؟"

"ہوں گی۔ لیکن یہاں محض ملنے کو ہیں۔ بلکہ [illegible] ہیں۔"

یکایک ساجد کا حافظہ اسے بہت دور لے گیا۔

"اس کا باپ اس سے بھی بڑا ایکٹر تھا۔ ایک دن ہمیں اسی شکر کے سامنے، کسی سے لڑ جھگڑ رہا تھا۔ بلکہ باقاعدہ مار رہا تھا۔ [illegible] جوتی سے۔ کہہ رہا تھا [illegible] ہو گئے اس نے مجھ سے ایک روپیہ ادھار لیا تھا۔ بیسیوں بار تقاضا کر چکا ہوں پر واپس [illegible] کا نام نہیں لیتا۔ گالیاں بھی دے رہا تھا۔ پھر اسے بالک سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ [illegible] اس وقت یہ کنکر کی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی۔ کہہ رہا تھا اٹھا کر [illegible] میں پھینک دوں گا۔" ساجد لمحے بھر کو لیے رکا۔ اسے وہ گالی یاد آئی جو بادشاہ کے باپ نے اس شخص کو [illegible] دی تھی۔ گالی اس کی زبان تک آئی آئی رک گئی۔ "مجھے اچھی طرح سے یاد ہے میں پاس ہی کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اور مجھے سخت غصہ آ رہا تھا کہ یہ شخص محض ایک روپے کی خاطر ایک آدمی کو ایسے مار رہا ہے۔ [illegible] اسے بے عزت کر رہا ہے۔ میں اس وقت زیادہ سے زیادہ آٹھ نو برس کا رہا ہوں گا۔ جب شہزادہ اس آدمی کو گھسیٹتا ہوا بالکل نالے کے کنارے لے گیا اور میں سمجھا کہ وہ اسے [illegible] والا ہے تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ایک ڈھیلا اٹھا کر اس کے [illegible] اتفاق کی بات کہ ڈھیلا یا پتھر یا اینٹ کا ٹکڑا جو کچھ بھی تھا، جا کر سیدھا اس کے منہ پر لگا اور اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ بس پھر کیا تھا۔ اس آدمی کو چھوڑ چھاڑ [illegible] تو [illegible] وہاں خون [illegible] سر پھٹنے [illegible] خون بہتے [illegible] کی رٹ لگاتا ہوا۔ ابا جان اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ [illegible] معاملہ ابا جان کی عدالت میں پیش ہو [illegible] کسی ملازم سے کہا [illegible] جا کر دیکھو کیسی چوٹ ہے۔ [illegible] مگر چوٹ گہری نہیں۔ ابا جان نے [illegible] پانچ روپے بھجوائے اور ملازم کو ساتھ کر دیا کہ [illegible] کو ڈاکٹر [illegible] سے [illegible] جو اس زمانے میں فتح گڑھ کے واحد ڈاکٹر تھے، مرہم پٹی کروا دو۔ لیکن وہ [illegible] والا تھا؟ پانچ تو بہت ہوتے ہیں۔ [illegible] بہت خوش [illegible] روز [illegible] دو دفعہ [illegible] تب کہیں جا کر [illegible] پھر بھی [illegible] جب تک [illegible] ابا جان سے پانچ روپے اور نہیں اینٹھ لیے تب تک نہیں ٹلا۔"

"[illegible] پوری ہو گئی؟"

ساجد مسکرایا۔ [illegible] بچوں کو یہ جان کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ کبھی ان کے والدین پر بھی شامت پڑا کرتی تھی۔ [illegible] ابا جان ہوں۔

"شامت ہی سمجھو، لیکن ذرا مختلف قسم کی۔ میں اوپر برساتی میں تھا۔ تمہاری پھوپھی صاحبہ آئیں۔ [illegible] آپ کو ابا جان بلا رہے ہیں۔ ساجدہ اس زمانے میں تتلایا کرتی تھی۔ تو جناب ہم [illegible] جا کر عدالت میں حاضر ہوئے۔ تشریف رکھیے۔ ہمارے [illegible] کھڑے ہوئے کیونکہ [illegible] جب ناراض ہوتی تھیں۔ ورنہ ہمیشہ تم۔ ابا جان کا معاملہ اس کے بالکل برخلاف تھا۔ وہ جب ناراض ہوتے تھے تب تم کہتے تھے ورنہ ہمیشہ آپ۔ تو جناب، ہمیں بتایا گیا کہ وہ [illegible] شہزادہ شکایت لے کر آیا تھا کہ میاں نے اس کا سر پھوڑ دیا۔ ہم نے فوراً اقبال جرم کیا مگر ساتھ ہی انہیں یہ سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ ہم نے ایسا ایک بہت بری حرکت [illegible] کے لیے ایسا کیا۔ لیکن ہماری کوئی شنوائی نہیں ہوئی اور فیصلہ ہمارے خلاف صادر ہوا۔ آپ کو دوسروں کے قصوں میں پڑنے کی کیا ضرورت؟ اب اپنے کام سے کام رکھیے۔ دوسروں کے پھٹے میں پیر نہ اڑایئے۔ پھر کبھی ہم اس قسم کی کوئی شکایت نہ سنیں، ورنہ ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔ جائیے، اور عدالت برخاست۔"

ساجد تھوڑی دیر خاموش رہا۔

"واقعی بہت بڑا ایکٹر تھا بادشاہ کا باپ۔ بہت عرصے بعد ایک دن میں نے اسے یاد دلایا کہ میری وجہ سے تمہیں دس روپے ملے، تو معلوم ہے کیا بولا؟ دس کہیں میاں، پورے گیارہ! میں کیا اپنا روپیہ چھوڑنے والا تھا؟ میں نے وصول کر کے چھوڑا۔ اس زمانے میں دس روپے بہت ہوتے تھے، اور وہ بھی کسی فقیر، بھیک منگے کے لیے۔ لوگ بھیک میں عموماً ایک پیسہ دیتے تھے اور کسی نے اکنی دے دی تو [illegible] حاتم کی قبر پر لات مار دی۔ اکنی چار پیسوں کی ہوتی تھی۔ [illegible] چار پیسے۔ روپے میں چونسٹھ۔ باپ بیٹے کی کیسی [illegible]۔ جب دیکھو آپس میں بک بک جھک جھک۔" وہ رکا۔ [illegible] پڑھا لکھا ہے [illegible] دیکھنے [illegible] ہے اور پھر [illegible] بیٹا تو [illegible] برابر ہوتا ہے۔ فیصلہ کب [illegible] کے حق میں ہوا۔ معلوم نہیں کہاں تک سچ ہے اور کتنا جھوٹ۔ مگر لوگ کہتے تھے کہ شہزادہ نے ایک رات اپنی بہو پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اسی بتولی پر۔ شاید نشے میں رہا ہو۔ [illegible] تو یہ بھی کہتے تھے کہ [illegible] بتولی کے ساتھ تعلقات تھے۔ اور اسی سے باپ بیٹے میں [illegible] تھی۔ اللہ بہتر جانتا ہے ویسے نیچ ذات کے لوگوں میں اس قسم کی باتیں عام تو ہیں۔"

"میں سمجھتا تھا کہ یہ باتیں صرف مغرب میں ہوتی ہیں۔" شاہد نے انگریزی میں کہا۔

"نہیں۔ مگر گورے اس معاملے میں بھی ہم لوگوں سے بہت آگے ہیں۔" ساجد کو ٹی وی کا ایک پروگرام یاد آ گیا۔ "صرف برطانیہ میں ایسے کئی ہزار کیس ہر سال عدالتوں میں

پیش ہوتے ہیں۔ ان ماہرین کی رائے ہے کہ جو واقعات عدالتوں تک نہیں پہنچتے ان کی تعداد اور بھی زیادہ ہے۔ ہمارے ہاں تو بیس پچیس برس میں ایک آدھ بات ایسی سننے میں آئی تھی، اور وہ بھی کوئی جانے کہ سچ یا جھوٹ۔"

"امریکا کا بھی یہی حال ہے۔"

"ایک بات اور،" ساجد نے کہا۔ "یہاں کی سچ جھوٹ، جو بھی ہیں، ایسی بات ہوتی ہے وہ زیادہ تر محرم سے ہوتی ہے۔ مگر اُدھر تو باپ بھائی، دادا، نانا، انکل اور پانچ پانچ چھ چھ برس تک کی بچیوں کے ساتھ۔ ایک ایسی مجھے یاد ہے جس میں اپنی ماں اور سگے باپ نے ملوث ہونے کا اعتراف کیا۔ لگاتار برسوں تک۔"

ساجد جھرجھری لے کر چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بھی چادر اور تکیوں کا مطالبہ کر دیا۔ جیسی ہے ایک سن کی بڑی بہن تھی ۔۔۔ اپا کی تھی۔ جو عمر میں اس سے دو چار سال بڑی تھی اور جس کا کم سنی میں انتقال ہو گیا تھا۔ جب وہ ہوٹل واپس جا رہے تھے تو ساجد نے ہاشم علی خاں کی قبر کے پاس سے گزرتے ہوئے سگریٹ منہ میں لیا۔

"میں یہ کہ ہاشمی دفن ہوں تو کتنا اچھا ہو۔"

"پریاگ راج" کی رفتار بہت تیزی سے کم ہونی شروع ہوئی اور گاڑی بالآخر پہیوں کی شدید چرچراہٹ کے ساتھ رک گئی۔ سامنے کی برتھ پر لیٹی ہوئی عورت نے کروٹ بدلی۔ اب اس کی پیٹھ ساجد کی طرف تھی جس پر سے سفید چادر کھسک گئی تھی۔ عورت نے بے چینی سے ہاتھ بڑھایا اور چپ ہو کر بدن کو چادر سے گردن تک ڈھانک لیا۔

ساجد اپنی برتھ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور اس نے شیشے کو اوپر سرکا دیا۔ باہر مطلع صاف تھا اور چاندنی میں سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ریل کی پٹری کے دونوں طرف دور دور تک کھیت تھے جن میں کہیں کہیں پیڑ تھے اور کھیتوں کے بیچ سے دور تک ایک پگڈنڈی گئی تھی۔ کھیتوں کے پار کچھ مکان۔ دائیں ہاتھ دور کا ایک درخت۔ بائیں ہاتھ ایک چھوٹا سا جنگل دکھائی دے رہا تھا۔ ساجد کا جی چاہا کہ گاڑی سے اتر کر کھیتوں میں چلا جائے۔ مگر گاڑی کسی اسٹیشن پر نہیں رکی تھی بلکہ سگنل کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر بھی اس نے سوچا کہ اگر وہ اتر جائے اور گاڑی چھوٹ گئی تو؟ وہ پہیے رکنے کی آواز سن کر ہی اندر بیٹھا رہا۔ اس نے کھڑکی پھر بند کر لی۔ مسافروں کو سونے کی عادت ہوتی ہے۔ قافلے کے سر ہو جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے سٹیشن، چھوٹے چھوٹے قصبے۔ کہیں چھت نہ جانے۔ پیچھے نہ رہ جائے۔ دل میں ایک ڈر سا بیٹھا رہتا ہے، پیچھے رہ جانے کا زیادہ خطرہ سفر میں ہے۔ سفر میں ... شاید کوئی رستہ ہے، ایسے پاس ملانے والا ہے، اور لوگ منزل کو پا لیتے ہیں۔

والہانہ شوق میں دوڑ رہے ہیں اور منزل پا لیتے ہیں۔ لیکن جب شدت خواہش سے بوڑھی آنکھوں سے پیکر مراد کا کتنی مایوس اترتے ہیں تو جو گولائیاں دور سے دعوت نظارہ دیتی ہیں و بانہہ بھی نظر آ رہی تھیں۔ درحقیقت تیکھی پھوڑے نکلتی ہیں۔ وہ شگاف جو مسکراتی نظر آ رہی تھیں دراصل زخم ہیں جن سے خون اور پیپ رس رہا ہے۔ اور مقسم آنکھیں جو ٹھنڈی روشنی کی چمک سی نظر آ رہی تھیں، اصل میں منہ زور جلتی آگ ہیں جو راستوں شعلوں میں جلا کر راکھ کر دینے کو بے چین ہیں۔

گاڑی جب ٹال سے سنسان ہوئی تو شاید کی نیند ٹوٹی۔ اور بالکل رک گئی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا۔ گاڑی نہیں چلی۔ اس نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ساجد برتھ پر پیر پھیلائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ کھڑکی کی طرف تھا۔

"آپ سوئے نہیں، ابا؟"

"نیند نہیں آئی؟"

شاہد نیچے آ گیا۔ ساجد نے پیر سکیڑ لیے۔ شاہد اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا۔

"کون سا اسٹیشن ہے؟"

"ابھی اسٹیشن نہیں آیا۔ سگنل پر رکی کھڑی ہے۔"

"فتح پور۔" سامنے کی برتھ پر لیٹی ہوئی عورت نے کہا۔ "آپ فتح پور اس کا۔" اور یہ اطمینان کر کے کہ چادر اس کے بدن کو ٹھیک سے ڈھانکے ہوئے ہے، عورت نے کروٹ بدلی اور بلا تکلف پشت ان کی طرف کر دی۔

"اردو لٹریچر میں،" ساجد نے کہا، "فتح پور کا نام خاصا جانا پہچانا ہے۔ تقسیم سے پہلے یہاں سے ایک مشہور ادبی رسالہ نکلا کرتا تھا۔ نہیں نکلتا ہو، مگر زمانہ ہو گیا۔ اور اس سے پہلے شاید بھوپال سے۔ مگر اس کے ایڈیٹر یہاں کے رہنے والے تھے۔ نیاز فتح پوری۔"

"کیا نام تھا؟"

"نگار۔ بہت اچھا پرچہ تھا۔"

"بند ہو گیا؟"

"ہاں۔ ہجرت کر کے پاکستان چلا گیا تھا۔ مگر وہاں چلا نہیں۔"

"کیوں؟"

ساجد چند لمحے خاموش رہا۔ "معلوم نہیں۔"

"یہاں سے نہ جاتا تو؟"

ساجد کے ذہن میں ایک مصرعہ کوندا۔ پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اس نے کہا، "پتہ نہیں۔ شاید تب بھی بند ہو جاتا۔ کچھ دیر اور سو لو۔"

"آپ بھی تھوڑا سو لیجیے۔" شاہد نے اپنی برتھ پر واپس جاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" لیکن ساجد نے آنکھیں بند کرنے کی بجائے سگریٹ سلگا لی۔ ٹرین حرکت میں

اتری، اور جب فتحپور پہنچے وہ لوگ تو ساجد نے [illegible] اس مصرعے کی گت پر جو ابھی
اس کے ذہن میں کوندا تھا سرپٹ بھاگی جا رہی ہے، غربت جس کو وطن نہ آئی اور وطن
میں چھوٹ گیا۔ [illegible] نے سگریٹ اپنی قریب ہی مسل کر آنکھیں بند کر لیں۔

ساجد شاہد کو اردو ادب کی تاریخ میں فرخ آباد کے مقام سے روشناس کرا چکا تھا۔
سودا اور ناسخ نے دلی سے لکھنؤ جاتے ہوئے یہاں قیام کیا تھا، اور غالب کلکتے جاتے ہوئے
یہاں رکے تھے۔ اور شاید میر بھی لکھنؤ جاتے ہوئے یہاں سے گزرے ہوں۔ اور چونکہ انشا کے
والد اسی شہر میں کہیں دفن ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ وہ بھی فرخ آباد سے واقف رہے ہوں۔
اور جاں صاحب تو پیدا یہیں ہوئے تھے۔ مگر [illegible] بھی یاد پڑا کہ اردو کے
معتدد شعرا دلی چھوڑ کر لکھنؤ میں کیوں جا بسے تھے اور غالب نے کلکتے کا سفر کیوں
کیا تھا۔ اور ریختی [illegible] اردو کا پورا نام نہیں لیتا، اردو شاعری کی ایک صنف ہے۔ اور ہاں اردو
کی مشہور ناول "امراؤ جان ادا" میں بھی فرخ آباد کا ذکر آتا ہے اور [illegible] ورما جو
ہندی کی ایک ممتاز شاعرہ ہیں وہ بھی فرخ آباد کی ہیں۔ شاید ابھی زندہ ہیں۔
[illegible] بعد غیر معمولی طور پر غالب [illegible] میں سے گزرے

[illegible]

[illegible] پر [illegible] کے چھ گز کی پوری چھپی ہوئی ہیں

[illegible]

[illegible] فرخ آباد کے علاوہ ہندوستان میں شاید کہیں اور نہیں ملتی۔
[illegible] دستکاروں اور بیوپاریوں وغیرہ کا کاروبار کرتے ہیں۔ مجبوراً [illegible]
[illegible] ہندوستانی لوگوں کی مجموعی ملی حیثیت [illegible] ہو گئی [illegible]
[illegible] مشہور [illegible] یہ نہیں [illegible] ساری کی ساری کاریگر مسلمان
ہوتے تھے۔ وہاں کے چھپے ہوئے لحافوں کا [illegible] دور دور تک شہرہ تھا۔ [illegible] ملک میں۔"

وہ [illegible] انہوں نے تانگے کی [illegible] تانگا چھوڑا تھا
جب وہ [illegible] سے [illegible] تو ساجد کو فرخ آباد کی ایک اور مشہور
چیز [illegible] گرمیوں میں [illegible] کلاس [illegible] میں ایک
[illegible] کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور
[illegible]

[illegible] گھوڑے کو گھاس کھلا رہا تھا۔ [illegible] کو کوئی ضروری کام یاد آ گیا
تھا [illegible] ساجد میاں جلد ہی فارغ ہو
[illegible]

اور جب وہ مغلوں کے زمانے کے صدر دروازے کے راستے شہر سے باہر نکلے تو شہراتی نے
تانگے کو سیمنٹ کی اس نئی بنی لمبی سڑک پر ڈال دیا جو سیدھی فتح گڑھ کو جاتی ہے۔
ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ساجد نے کہا: "اسی راستے واپس چلو جس راستے
آئے تھے۔" شہراتی نے تانگا موڑا اور اس سڑک پر آگے جا کر چھاؤنی میں سے گزرتی
ہے [illegible] ساجد نے شاہد کو بتانا شروع کیا کہ فتح گڑھ کی چھاؤنی خاصی بڑی ہے [illegible] میں
قصبے سے چھوٹی ہو گئی تو بس تھوڑی سی رہ گئی یہاں صرف ایک رجمنٹ رہتی تھی۔
ساتویں راجپوت۔ جنرل کری آپا جو بعد میں ہندوستانی فوج کے کمانڈر ان چیف بنے تھے
[illegible] لڑائی کے زمانے میں یہاں تعینات تھے۔ اب یہاں ایک اور رجمنٹ بھی ہے
سولہویں سکھ۔ ساتویں [illegible] میں جھبلہ وغیرہ کی طرف کے [illegible] سپاہیوں کی اچھی
خاصی تعداد ہوا کرتی تھی۔ وہ انہی کی وجہ سے ساجد پنجاب سے متعارف ہو تھا۔

رات کے سناٹے میں ان سپاہیوں میں سے کسی کی بلند آواز اور چانک چھاؤنی سے
بلند ہو کر سارے قصبے پر چھا جایا کرتی تھی۔ [illegible] جیسے کوئی فریاد کر رہا ہو۔
مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے پہلی مرتبہ یہ لے سنی تھی تو مجھے ایک نامعلوم سی
بے چینی کا احساس ہوا تھا۔ اور جب میں نے ابا جان سے پوچھا تھا کہ یہ کون کیا گا رہا تھا کیا
گا رہا تھا، تو میرا وارث شاہ سے تعارف ہوا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ پنجاب کے فوجیوں کو
جب گھر کی یاد ستاتی ہے تو ہیر گاتے ہیں۔

تانگا چھاؤنی کی حدود میں داخل ہو چکا تھا، اور ساجد کو وہ بارکیں اور وہ میدان
نظر آنا شروع ہو گیا تھا جہاں پاکستانی فوجی قیدی بنا کر رکھے گئے تھے۔ گھوڑے کی ٹاپوں
کی گت پر ایک خیال نے اس کے ذہن میں دستک دینی شروع کی۔ ان علاقوں کے لوگ کمپنی
بہادر کے زمانے سے فوج میں ملازمت کرتے آ رہے ہیں۔ نسلاً بعد نسلاً۔ باپ کے بعد بیٹا۔
غدر، سرحد، پہلی عالمی جنگ، دوسری عالمی جنگ، جزیرہ نمائے عرب، فلسطین، عراق،
شمالی افریقہ، اٹلی، فرانس، برما، سنگاپور، ملایا اور نہ جانے کہاں کہاں۔ جنگی قیدیوں میں
کچھ تو ضرور ایسے بھی رہے ہوں گے جن کے باپ، دادا، یا کوئی اور عزیز رشتہ دار کبھی اس
چھاؤنی میں تعینات رہے ہوں گے۔ بھرتی ہوئے، مشرقی پاکستان بھیجے جانے، ہتھیار ڈالنے،
قیدی بنائے جانے سے پہلے انھوں نے اپنے ان رشتہ داروں سے کیا نہ سنا ہو گا اس چھاؤنی کا ذکر
نہیں سنا ہو گا؟ اور جب چھوٹ کر واپس گئے ہوں گے تو انہوں نے اپنے گھر والوں، اپنے
رشتہ داروں کو بتایا ہو گا۔ کیا بتایا ہو گا؟ لو جی! تم جس چھاؤنی کا ذکر کیا کرتے تھے، سنا
کرتے تھے، ہم بھی وہاں رہ آئے! گھوڑے کی ٹاپوں کی گت پر ایک منظر ساجد کے ذہن میں ابھر
آیا۔ ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن۔ چاروں طرف دور دور تک گیہوں کے کھیت لہلہا رہے
ہیں۔ ایک ٹرین آ کر رکتی ہے۔ اس میں سے بس چار شخص، فوجی وردی میں ملبوس، اترتے
ہیں۔ پلیٹ فارم پر کئی مرد، پگڑیاں اور ساف باندھے، اور کچھ لڑکیاں اور عورتیں رنگ

پہچانی جاتی تو کیسے؟ یہ نہیں کہ قومی زبان ہوتی اور پہچانی گئی۔ پاجامہ پہنا نہیں کہ پہچانے گئے۔"

پھر ساجد نے شیرانی کو مخاطب کیا۔ "سواری کا انتظام کس نے کیا تھا؟"

"معلوم نہیں میاں!"

سنگھ سے چھاؤنی نے اُس علاقے میں سے گزر [illegible] کے قصبہ [illegible] بیچ میں سے ایک کے گیٹ پر ایک سکھ سپاہی، پوری وردی میں، ایک مونڈھے یا اسٹول پر بیٹھا ہوا بڑے غور سے تانگے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میاں، آپ کو ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا!"

"کیا؟"

"چھاؤنی میں پاکستانی [illegible] کا [illegible] ہوا؟" شیرانی نے سکھ سپاہی پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"تمھیں پہلے بتانا چاہیے تھا۔" ساجد نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"معاف کرنا میاں! ابھی یاد آیا۔"

"پیسے؟" ساجد نے سکھ سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے [illegible] ٹھہر ہو رہا تھا۔ "اب یہ تمھیں تانگا روکنے کا آرڈر دے گا۔"

"دے گا؟"

"آپ صورت سے کیا ہو گا؟" ساجد نے [illegible] سنگھ [illegible] سامنے سے گزر رہا تھا۔ شیرانی کی نظریں ناک کی سیدھ میں سامنے سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ سکھ سپاہی سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اٹینشن ہو کر سیلوٹ مارا۔ ساجد نے اُس سیلوٹ کا جواب سیلوٹ سے دیا۔ شیرانی نے مڑ کر ساجد کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ساجد مسکرایا۔ شاہد بڑی مشکل سے ہنسی روک سکا۔

"ہاں ہاں بھئی؟" ساجد نے کہا۔

"ہاں میاں؟" شیرانی نے کہا۔ مگر وہ بدستور ساجد کو حیرانی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اب ساجد سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ ہنسا۔ اس کے ساتھ شاہد بھی ہنس دیا۔ [illegible] ایسی شکل جیسے پنجرہ کھلنے پر اس میں سے پنچھی پر پھڑپھڑاتے نکلتے ہیں۔

"کوئی مبارک پیشانی پر لکھا ہے کہ ہم پاکستانی ہیں؟" ساجد نے ہنسی پر قابو پا کر کہا۔

"نہیں، پر وہ جو اس نے سلوٹ مارا، وہ کاہے کو؟" شیرانی کی حیرانی ابھی برقرار تھی۔

"احتیاطاً!" ساجد نے کہا۔ اور شیرانی کو تفصیلاً سمجھایا۔

تب شاہد نے شیرانی کو بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ "ہمارے پاس پاکستانی نہیں، انگریزی پاسپورٹ ہیں۔"

مرسکی جیسی اور خوبصورت وردی اور ہاتھوں میں ہار لیے کھڑے ہیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھتی ہیں اور ہار [illegible] پر پہنچے ہوئے مسافروں کے گلے میں پہنا جاتی ہیں۔ ساجد کی تصویر نے آنکھیں میچ لیں۔ اور جب کھولیں تو ایک اور منظر اس کے سامنے تھا۔ وہی اسٹیشن، وہی [illegible] وردی میں ملبوس ایک شخص، جس پر گرد جمی ہوئی ہے، ٹرین سے اترتا ہے۔ ادھر ادھر نظر دوڑاتا ہے۔ پلیٹ فارم سنسان ہے۔ وہ اسٹیشن سے باہر آ کر ایک پگڈنڈی پر ہو لیتا ہے جو کھیتوں کے بیچ میں سے ہو کر گزر رہی ہے۔ دونوں طرف عورتیں اور لڑکیاں اور مرد کھیتوں میں کام کر رہے ہیں۔ لمحے دو لمحے ہاتھ روک کر وہ اس نو وارد مسافر کو دیکھتے ہیں، جو گردن جھکائے چلا جا رہا ہے اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔

[illegible]

"یہ تو واقعی کمال ہوا!" شاہد نے ساجد سے انگریزی میں کہا۔ "جنگلی قبیلوں کی [illegible]"

[illegible]

جان سے بلاوجہ پل دو پل خون خشک کر دیا؟"

"اتنا مت ڈرا کرو؟" ساجد نے کہا

"ڈرا کون رہا ہے میاں؟" شبراتی نے چابک لہراتے ہوئے کہا۔ "شبراتی کسی سے نہیں ڈرتا۔ سوائے اوپر والے کے۔"

ساجد مسکرایا۔

ایک عمر کئی مسئلے میں ساجد کے ذہن کی تہ [illegible] سے باہر آنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کبھی ایک لفظ، کبھی مکالمات، کبھی دوسرا۔ لیکن باہم مربوط ہو کر نہیں۔ بالآخر ایک مصرع ابھرا اور ڈوبنے کی کشاکش سے چھوٹ کر سطح پر ایسا آیا کہ پھر اس نے روپوش ہونے کا نام نہیں [illegible] لیکن [illegible] ابھی تک [illegible] عالم میں بند تھا۔ اس نے [illegible] شروع کی [illegible] کی کروٹ [illegible] ساجد کی جانب [illegible] اور [illegible] چادر [illegible] [illegible] کوشش [illegible] [illegible] اس کا [illegible] [illegible] کی جانب [illegible] ساجد نے دیکھا کہ [illegible] پر چل رہا تھا [illegible] اس شعر کا مصرعہ نہیں تھا [illegible] کو شش کر رہا تھا [illegible] مصرعہ کو جوڑنے [illegible] زندگی [illegible] [illegible] عورت کی [illegible] [illegible] عورت [illegible] کروٹ [illegible] [illegible] ساجد کی [illegible] [illegible] عورت نے پھر چادر سے اپنے جسم کو گردن تک ڈھک لیا اور آنکھیں بند [illegible] [illegible] عورت [illegible] [illegible] کسی [illegible] روشنیاں تیزی سے گزریں۔

جہاں ساجد اور شاہد کھڑے ہوئے تھے وہ جگہ دریا کی سطح سے کوئی پچیس تیس فٹ [illegible] جانب [illegible] کی [illegible] [illegible] کچھ [illegible] کی طرف، تیس پچیس [illegible] گنگا بہہ رہی تھی۔ [illegible] شام کا وقت تھا۔ سورج ڈوبنا چاہتا تھا۔ اس کی [illegible] [illegible] رہی تھیں۔

"یہ جگہ،" ساجد نے اس بنگلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کی جانب اس کی پشت تھی "پہلے خالی ہوا کرتی تھی۔ یہ بنگلے بعد کے ہیں، کسی ایسڈیل جیک ہے۔ لہر میں بیٹھ کر گنگا کا نظارہ کروا آؤ ہمیں چلیں۔"

لال اینٹ کی بنی پچیس سیڑھیاں اتر کر وہ دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ پانی جو اوپر سے ٹھہرا ٹھہرا نظر آ رہا تھا اب باقاعدہ بہتا نظر آیا۔ دریا پار حد نظر تک ایک میدان سا پھیلا ہوا تھا جو سورج کی ماند پڑتی روشنی میں سنہرا نظر آ رہا ہے۔

"اس وقت تو پیدل پار کر سکتے ہیں۔" ساجد نے کہا، وہ دونوں گنگا کنارے کیلی ریت پر ٹہل رہے تھے۔ "لیکن برسات میں گنگا کا پاٹ میلوں تک نظر نہیں۔"

"کتنی پیاری جگہ ہے؟"

"ہاں" ساجد رک گیا۔ اس کی نگاہیں اس بلندی پر اگے ہوئے درختوں کی طرف اٹھ گئیں جہاں سے وہ چند منٹ پہلے اترے تھے۔ "یہاں میں بہت آیا کرتا تھا۔ کوئی کتاب اٹھائی اور ادھر آ نکلے اور ان پیڑوں میں سے کسی کے نیچے بیٹھ کر گھنٹوں پڑھتے رہے۔ سکون کے معنی شاید اسی جگہ نے مجھے پہلی بار سمجھائے۔"

[illegible] مڑے تو شاہد کو وہ مندر نظر آیا جو سیڑھیوں کے اس طرف ایک چبوترے پر رکھا ہو ایک بڑا سا کوڑاگھر لگ رہا تھا۔ اور اس کے اندر رکھی ہوئی مورتی اور مورتی کے قدموں میں بکھرے ہوئے عقیدت کے پھول شام کے دھندلکے میں بھی صاف نظر آ رہے تھے۔

"اور یہیں تو ہے وہ گھاٹ؟" شاہد کے لہجے میں دریافت کی خوشی کھنک رہی تھی۔

"کون سا گھاٹ؟"

"وہی جہاں وہ پجاری اپنا انسٹرومنٹ بجایا کرتا تھا۔ کیا کہتے ہیں اسے؟"

"ستار؟"

"ہاں۔ ایک تارا!"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"تم بتایا کرتے تھے۔ شاید جان نے اپنے کسی خط میں لکھا ہے۔"

سمجھو کسی کو بتائے، جیسے سے واپس آ گئے اور یہاں سے یہ نہایت اہم اطلاع بھیجی کہ وہ پجاری جو رانی گھاٹ کے مندر کے چبوترے پر بیٹھ کر شام کو اکثار بجایا کرتا تھا وہ مر گیا۔ "ہاں؟" ساجد نے کہا۔ اس کا چہرہ مندر کی طرف نہیں، ڈوبتے ہوئے سورج کی جانب تھا۔

وہ واپس جانے کے لیے مڑے تو ایک شخص نے، جو مندر سے کچھ قدم آگے ریت کی ایک تہمد [illegible] میں اکڑوں بیٹھا ہوا تھا، اور جس کا گھٹا سر اور چوڑی لمبی جٹا تھی کہ اوپر سے جھانک رہی تھی، کپڑے ہو کر اپنے کان میں دبا ہوا دھاگا اتارا۔

"یہ اس نے اپنے کان میں کیا لپیٹ رکھا تھا؟" شاہد نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے

چوڑھالو بشیر سمجھ لیا۔ اپنا صحن میں نہیں تھیں۔ بڑا سمجھی باورچی خانے میں مٹی کے کونڈے میں آٹا گوندھ رہی تھیں۔ انھوں نے سندے ہوئے ہاتھ سے نیا کی کمرے کی طرف اشارہ کیا اور میں کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ دھیمی [illegible] میں [illegible] ڈال رہی ہیں اور ایک چھا ہوا دوپٹا کنڈلی مارے پلنگ پر پڑا ہوا ہے اور پاس ہی دھلا ہوا کلف لگا کرتہ اور ایک تولیہ رکھی ہوئی ہے جس کی تہ میں سے ایک کلائی ہے جھانک رہا ہے۔ جی ایسا؟ میں جاکر نیا کی بالکل پاس کھڑا ہو گیا۔ ان کے بدن سے پسینے کی بُو آ رہی تھی۔ مجھے یہ کہ پسینے کی بو بہت اچھی لگتی تھی۔ میں ایک کام کر دو کہ میرے اچھے میاں؟ بس حکم کی دیر ہے وہ ہنسی تھیں۔ شربو کہیں گا؟ اور انھوں نے مجھے اپنے بدن سے لگا لیا تھا۔ ارے اتنا لمبا ہو گیا ہے میرا بچہ۔ میرا سر ان کے سینے کو چھو رہا تھا۔ اور ایسا تو سر پر پڑا ہوا ہوا اٹھایا تھا اور اس میں ایک چوری نکال کر مجھے دی تھی اور جلدی سے ایک سطر کھلے دروازے پر ڈال کر جس میں سے صحن نظر آ رہا تھا آہستہ سے کہا تھا۔ مجھے ایک بلیڈ لا دو [illegible] اور میں [illegible] کہہ کر دروازے کی طرف لپکا تھا مگر لوٹ کر میں نے چوری میز پر رکھ دی تھی۔ میرے پاس ہیں پیسے۔ [illegible] چھوٹے بھائیوں کے پیسے خرچ کرواتی ہو تو پھر جانے ہم نہیں لاتے۔ اور انھوں نے کہا تھا۔ بڑے [illegible] نہیں کرتے۔ اور میں نے کہا تھا [illegible] اور انھوں نے کہا تھا [illegible] مگر جلدی لانا اور دیکھو، ان کا منہ میرے کان کے بالکل پاس آ گیا تھا۔ کسی کو بتانا نہیں۔ میں [illegible] خوش تھا کہ [illegible] مجھے اپنا رازدار بنایا۔ اور میں دوڑتا ہوا گیا تھا اور دوڑتا ہوا واپس آیا تھا اور میں نے [illegible] بلیڈ [illegible] چھپا کے دیا تھا کہ رازداری کا حق ادا ہو گیا تھا۔ اور جب نیا کرتہ پاجامہ اور تولیہ اٹھا کر غسل خانے میں چلی گئی تھیں تب مجھے خیال آیا تھا کہ پتہ نہیں کہ کیا کریں گی؟

"کیا یہ لوگ بھی پاکستان چلے گئے تھے؟"

"میں نے سنا تھا کہ گھر بیچ کر سب کے پاس لاہور چلی گئی تھیں۔" ساجد نے مڑ کر مکان پر ایک اُچٹتی نظر ڈالی۔ "نیکی خیال [illegible] تھی۔"

چاندی [illegible] کا وقت [illegible] کلائی [illegible] تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا حالانکہ ہمیشہ کھلا ہوتا تھا۔ کھٹکھٹایا۔ [illegible] کی دوسری بیوی نے کھولا تھا۔ آج کیسے راستہ بھول گئے؟ [illegible] کہا [illegible] خط [illegible] لکھا ہے فلاں کی [illegible] کرنا [illegible] چھٹیوں میں [illegible] کی گھر میں [illegible] تھا۔ خالہ کہاں ہیں؟ [illegible] گئی ہیں [illegible] سلام [illegible] خالہ گئی ہیں اور [illegible] گئی ہیں [illegible]

[illegible] اور ایسے موقعوں پر گلی میں لپیٹے ہیں۔" ساجد نے [illegible] سورج کی [illegible] اسلام پھیلا تو بھی [illegible] فارسی کی لفظ ہیں عربی کی [illegible]

[illegible] کوشش کر کے سکیں کہوں مگر [illegible]

[illegible] اور میر [illegible] صاحب کے ہاں [illegible] میں ان کی چھت پر پتنگ اڑا رہا تھا کہ [illegible] سے ان کی آواز [illegible] اور میں جلدی سے پتنگ اتار کر اور ڈور کو [illegible]

جلد سے جلد نہیں لوٹوں گی۔ چنے کی دال کا حلوہ بنا ہے کھاؤ گے؟ اور میں نے جی کہا تھا اور تھوڑا سا کہا تھا نہا لوں۔ پھر شوربے کو گرم کر کے اور انھوں نے گرم پانی سے بھرا ہوا بس حاضر تھی تو میں نے جھپٹ کر بالٹی ان کے ہاتھ سے لے لی تھی، اور لے جا کر غسل خانے میں رکھ دی تھی۔ اور وہ میرے پیچھے پیچھے غسل خانے میں آئی تھیں۔ نئے پاجامے کرتے بنیں۔ تولیہ، صابن اور میں غسل خانے سے باہر آ رہا تھا تو ان سے ٹکرا گیا تھا۔ اور انھوں نے کہا تھا دیکھ کے چلو میاں۔ میں شرما گیا تھا اور وہ مسکرائی تھیں۔ اور میں نے اپنے کمرے میں جا کر کوٹ کی جیب سے بازاری حسینہ نکالی تھی جس پر اخباری کاغذ چڑھا ہوا تھا اور بے تکے بستر پر لیٹ کر مزے مزے سے پڑھنے لگا تھا۔ اور پھر کچھ دیر بعد دروازے میں سے چھل چھل کی آواز آنی شروع ہوئی تھی جسے میں کچھ دیر کان لگا کر سنتا رہا تھا۔ اور پھر میں نے اٹھ کر دروازہ بھیڑ دیا تھا اور مسہری کے پاس پڑی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ کر مسہری پر اوندھے منہ پڑی بازاری حسینہ پھر اٹھا لی تھی۔ مگر چند سطریں پڑھنے کے بعد میں نے بازاری حسینہ کو پھر بستر پر اوندھا لٹا دیا تھا اور بھیڑے ہوئے دروازے کو تکنے لگا تھا۔ اور پھر میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا اور کھلے دروازے میں کھڑا کچھ دیر غسل خانے کے کواڑ کو دیکھتا رہا تھا۔ اور پھر چوروں کی طرح دبے قدموں کواڑ کی طرف بڑھا تھا اور جھک کر کواڑ کی ایک درز میں سے اندر جھانک کر دیکھا تھا۔ اور دیکھا تھا کہ رشتہ دار صاحب کی دوسری بیوی لکڑی کی ایک چوکی پر بیٹھی ہوئی ہیں اور ان کا دایاں ہاتھ اٹھا ہوا ہے اور اٹھے ہوئے ہاتھ میں تانبے کا ٹینک قلعی کیا ہوا لوٹا ہے اور لوٹے کی ٹونٹی میں سے پانی ان کے بالوں پر گر رہا ہے اور ان کے ملگجے اندھیرے میں چمکتے ہوئے اعضا پر سے پھسلتا ہوا نیچے آ رہا ہے اور ان کی آنکھیں بند ہیں اور ان کا منہ تھوڑا سا اوپر کی طرف اٹھا ہوا ہے اور تھوڑا سا کھلا ہوا ہے۔ اور پھر لوٹے کا پانی ختم ہو گیا اور انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور میں سیدھا ہو کر تیزی سے لوٹا۔ اور پیچھے سے آواز آئی، کون ہے؟ مگر میں واپس اپنے کمرے میں پہنچ چکا تھا اور جلدی سے، مگر آہستہ سے دروازہ بھیڑ کر کرسی پر بیٹھ کر بازاری حسینہ اٹھا کر اس سے اپنا چہرہ چھپا چکا تھا۔ اور میرا سانس پھولا ہوا تھا اور میں سہما ہوا تھا۔ مگر میرا جی چاہ رہا تھا کہ پھر غسل خانے میں جھانک کر دیکھوں۔ پھر دروازے کے ادھر سے آواز آئی تھی۔ ساجد! اور میرے جی کے جواب میں دروازہ کھلا تھا اور وہ اندر آئی تھیں۔ اور میں نے کتاب کے اوپر سے ڈرتے ڈرتے جھانک کر دیکھا تھا کہ وہ کندھوں سے گھٹنوں کے نیچے تک ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھیں جو جگہ جگہ سے بھیگی ہوئی تھی۔ اور جہاں جہاں بھیگی ہوئی تھی وہاں ان کے بھرے بھرے بدن سے چپکی ہوئی تھی اور ان کی سڈول پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں۔ اور ان کا چہرہ دمک رہا تھا اور سارا کمرہ ایک مہک سے بھر گیا تھا جو شاید ان کے بدن سے آ رہی تھی۔ اور انھوں نے کہا تھا، کپڑے بدل لوں۔ پھر ملتی ہوں۔ اور اچھا کہہ کر اور کتاب بند کر کے

میں نے جگہ جگہ سے بھیگی چادر کو صحن پار کر کے دالان میں داخل ہوتے اور پھر دالان کے پیچھے جو کمرہ تھا اس میں غائب ہوتے دیکھتا رہا تھا۔ مگر تھوڑی دیر بعد جب باورچی خانے میں سے کھٹر پٹر کی آواز آنی شروع ہوئی تھی تو میں نے بازاری حسینہ کو بند کر کے پھر جیب میں رکھ دیا تھا اور جھجک سے باہر جانے کے ارادے سے اٹھا تھا۔ ٹھیک اسی وقت رشتہ دار صاحب کی دوسری بیوی نے مجھے آواز دے کر بلایا تھا کہ آؤ ساجد میاں حلوہ گرم ہو گیا۔ اور قدم باورچی خانے کی طرف مڑ گئے تھے حالانکہ حلوہ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ انھوں نے کہا تھا بیٹھو اور میں ایک پیڑھی پر بیٹھ گیا تھا۔ اور انھوں نے ایک سینی میں رکھ کر حلوے کی طشتری میری طرف بڑھائی تھی اور میں نے ایک چمچا بھر کر منہ میں ڈال لیا تھا۔ حلوہ بہت گرم تھا۔ میں جلدی سے نگل گیا تھا۔ اور انھوں نے کہا تھا جلدی کاہے کی ہے پھونک کر کے کھاؤ۔ اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی تھیں۔ اور پھر انھوں نے ہاتھ بڑھا کر میرا گال آہستہ سے تھپتھپایا تھا۔ اور دوسرا چمچا میں نے دو تین بار پھونک مار کر کھایا تھا۔ اور وہ ابھی آئی کہہ کر پتیلا صحن پار کر کے باہر کر ڈیوڑھی کی طرف چلی گئی تھیں۔ اور واپس آئی تھیں تو میں پیڑھی چھوڑ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اور انھوں نے طشتری میں بچے ہوئے حلوے پر ایک نظر ڈال کر پوچھا تھا۔ کیوں؟ اچھا نہیں بنا کیا؟ اور میرے منہ میں جو آیا تھا میں نے وہ کہہ دیا تھا۔ نہیں، یہ بات نہیں۔ سر میں درد ہو رہا ہے پھر کھا لوں گا کسی دن۔ اور انھوں نے کہا تھا کہ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اور پھر میری کلائی پکڑ کر کہا تھا۔ آؤ میرے پاس سر درد کی ایک بہت اچھی دوا ہے۔ اور میں اسی مرض سے اور اسی مرض کے خلاف رشتہ دار صاحب کی دوسری بیوی کے ساتھ صحن پار کر کے دالان میں سے ہوتا ہوا اس اندھیرے میں داخل ہو گیا تھا جس میں میں نے پندرہ منٹ پہلے جگہ جگہ سے بھیگی چادر کو غائب ہوتے دیکھا تھا۔ اور انھوں نے میری کلائی چھوڑ کر سامنے کی دیوار میں بنی ایک چھوٹی سی الماری کھول کر اس میں سے ٹوٹی اسٹل بام کی ایک شیشی نکالی تھی اور مجھ سے کہا تھا۔ لیٹ جاؤ۔ اور میں بستر پر لیٹ گیا تھا جس کے سرہانے رکھے ہوئے تکیے کے غلاف پر موری کے بیچ میں لال گلاب کڑھا ہوا تھا۔ جس کی پیشانی چھپا ہوا ریشمی لحاف تہہ کیا رکھا ہوا تھا۔ حالانکہ جی میرا یہ چاہ رہا تھا کہ بھاگوں اور جا کر سڑک پر دم لوں۔ وہ آہستہ سے ہنسی تھیں۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے ساجد میاں؟ کوٹ تو اتارو۔ اور میں نے کوٹ اتار دیا تھا اور وہ بستر پر سرہانے کی طرف میرے سر کے پاس بیٹھ کر اور مجھ پر تھوڑا سا جھک کر میرے ماتھے پر بام ملنے لگی تھیں کہ پڑھ رہے تھے؟ کورس کی کتاب۔ اور میں نے جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا کہ کوٹ جیب کا ویسا تہہ کیا ہوا پاس ہی ایک کرسی پر رکھا ہوا تھا۔ اتنا مت پڑھا کرو۔ زیادہ پڑھنے سے بھی سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اب مجھے اپنی پیشانی اور کنپٹیوں پر ان کی نرم چکنی انگلیوں کا لمس بھلا لگ رہا تھا اور میری

Scanned with CamScanner

آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ ور ی کی کھڑکیوں سے مس کے عطر کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ انہوں نے پوچھا تھا، کچھ فرق پڑا۔ اور میں نے جی اب بالکل ٹھیک ہو رہا کہہ کر ان کی کانچ کی چوڑیوں سے بھری کلائی پکڑ کر ان کا ہاتھ اپنی پیشانی پر سے سا دبا دیا تھا۔ اور انہوں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی تھی بلکہ میں نے خود بہت اچھا ہاتھ ہٹ کہہ کر ان کی کلائی چھوڑ دی تھی۔ لیکن جب اٹھنے لگا تھا تو انہوں نے وہی ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر مجھے پھر لٹا دیا تھا اور کہا تھا۔ تھوڑی دیر آرام کر لو پھر چلے جانا۔ اور انہوں نے مسہری پر سے اٹھ کر دروازے کے پٹ ایک دوسرے سے بھڑا دیئے تھے اور کمرے میں بالکل اندھیرا ہو گیا تھا۔ مگر میں خود ہو تو روشنی بری لگتی ہے آنکھیں کھلی اور مجھے یہ بھی لگا تھا کہ میں بھی کمر سیدھی کر لوں تھوڑی دیر۔ اور وہ اسی بستر پر لیٹ گئی تھیں اور اسی میں تپ گیا ہو لحاف کھول کر اپنے اور میرے اوپر کمر تک کھینچ لیا تھا۔ حالانکہ کمرے میں اس مسہری سے تین چار گز کے فاصلے پر ایک اور مسہری بھی تھی۔ اور مجھے ایسا لگا تھا جیسے بجلی کی ایک لہر ان کے بدن سے نکل کر میرے جسم میں داخل ہو گئی ہے۔ اور مجھے وہ خواب یاد آ گیا تھا جو دو تین دن پہلے میں نے دیکھا تھا۔ اور جس میں میں نے دیکھا وکیل صاحب کی گھر کی تین کی سیڑھیاں اور دروازے، کھڑکیاں اور بہت چھوٹی کھڑکیوں میں سے ٹیک پر چڑھنا پہنچ کسی نہ کسی طرح بالکل اوپر پہنچ گیا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ پنجوں کے بل ویسے ہی کھڑکی سے چپکا رہوں۔ کہ مجھے محسوس ہوا تھا کہ کوئی شے میرے سارے جسم سے کھینچ کر ایک نقطے پر جمع ہو گئی ہے اور اپنی پیروں کی ناف سے کوئی کی طرح نکلتی گئی۔ اس خواب کی لذت اتنی تکلیف دہ تھی کہ میری آنکھ کھل گئی تھی۔ ویسی ہی تکلیف دہ لذت نے اس وقت بھی مجھے اپنی شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ کروٹ بدلنا چاہا نہیں بدلی گئی۔ کھسکنا چاہا، نہیں کھسکا گیا۔ اٹھ کر بیٹھنا چاہا، نہیں اٹھا گیا۔ چلانا چاہا آواز نہیں نکلی۔ ایک ڈراؤنا خواب میں نے باربار دیکھا تھا کہ کسی بہت اونچی چھت کی منڈیر پر کھڑا ہوں کہ پیر پھسل جاتا ہے اور میں گرتا ہوں اور گرتا چلا جاتا ہوں گرتا چلا جاتا ہوں مگر گر نہیں چکتا۔ چیخنا چاہتا ہوں پر آواز نہیں نکلتی۔ بالآخر میری آنکھ کھل جاتی ہے اور میں بستر پر چت لیٹا جلدی جلدی سانسیں لے رہا ہوتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب اور کیسے میں شکنجے سے آزاد ہوا تھا مگر میں نے اپنے آپ کو مسہری کے پاس کھڑا جلدی جلدی سانسیں لیتا پایا تھا۔ اور دوسرے ہی لمحے کرسی پر ٹپ کر رکھا ہوا کوٹ اٹھا کر اور بھڑا ہوا دروازہ کھول کر کمرے سے باہر تھا۔ اور پھر صحن، ڈیوڑھی اور باہر کا دروازہ اور اس کی چٹخنی۔ اور میں نے سڑک پر جا کر دم لیا تھا۔ اور تب مجھے یاد آیا تھا کہ جس وقت میں گھر میں داخل ہوا تھا اس وقت نہ بیبی نے نہ انہوں نے دروازے کی چٹخنی چڑھائی تھی۔ سڑک سنسان تھی۔ اور میں نے کوٹ پہننے کے بعد جیب ٹٹول کر اطمینان کر لیا تھا کہ بازاری حسب اس میں ہے۔ اور جیب میں پڑے

لگا تھا تو میری نظر مکان کے اوپر لہراتے ہوئے ہرے جھنڈے پر پڑی تھی۔ اور سید مسجد سے عصر کی اذان کی آواز بلند ہونی تھی۔

ٹرین کی پبلک ایڈریس سسٹم پر کسی بھجن کا ٹیپ بجنا شروع ہوا تو ساجد نے سوچا کہ شاید اب پاکستان کی ٹرینوں میں بھی اسی قسم کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ حمد یا نعت سے سفر کا آغاز۔ حمد یا نعت پر سفر ختم۔ اس نے حافظے پر زور ڈالا۔ مگر اسے کسی حمد یا نعت کا کوئی شعر یاد نہیں آیا۔ سوائے ہر ایک مقبول اشعار کے جو جمعرات کو مزار کی گلی گایا کرتے تھے۔ ساجد کو میلاد کی محفلوں ہو گا کر پڑھی جانے والی اور ایک سلام بھی یاد آئی۔ مگر اسے ہو ایسے اشعار کی تلاش تھی جن کا ادبی مقام اور رتبہ بھی ہو۔ اسے تعجب ہوا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اردو میں اتنی اہمیت کی کوئی حمد یا نعت موجود ہو اور مجھے اس کا قطعاً علم نہ ہو۔ منتخبات شکستگی میں بدل گیا۔ یعنی اردو کا سارا نہیں تو بیشتر اعلا شعری سرمایہ سیکولر ہیا۔ مرثیے، قصیدے البتہ۔ "مدوجزرِ اسلام"، "شکوہ"، "جوابِ شکوہ"۔ وہ ورق پر ورق الٹتا چلا گیا۔ ٹرین کی رفتار دھیمی ہو رہی تھی۔ ساجد نے جلدی سے فیصلہ کیا کہ اسے اپنی رائے بدلنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن عین اس وقت اس کا حافظہ اچانک حالی کی مناجات کی طرف مڑا اور اسے مطلع یاد آیا۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

وہ مسکرایا۔ حالی بھی کمال کے شاعر تھے۔ ان کی بہت سی نظموں اور ملی شاعری کی مانند یہ شعر آج بھی اتنا ہی برمحل ہے جتنا سو سوا سو سال پہلے تھا۔

ساجد نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ عورت اب سامنے والی سیٹ پر پیر لٹکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ باہر اجالا ہو چکا تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر شاہد کا کاندھا ہلایا۔

"ہوں؟"

"اٹھو، الہ آباد آ رہا ہے۔"

اور جب ساجد نے برتھ پر بیٹھ کر سگریٹ سلگائی تو اس مغرور شعر نے جو اتنی دیر سے اس کے حافظے کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا، اپنے آپ کو اس کے ذہن کے حوالے کر دیا۔

تھا تبسم صبح بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

مگر اس کی آنکھوں میں صرف جلن تھی، بےخوابی کی جلن۔

Scanned with CamScanner

جانوس

The world, unfortunately, is real
Jorge Luis Borges

عرصے ہوئے مرا، مرحوم آنکھوں سے گم
طالب علی خاں عیشی

آندھی کے آثار تھے۔ دور شمال کی طرف آسمان زیادہ تاریک ہو گیا تھا اور ہوا میں ہلکی ـــــ سی تھی۔ ہوا کی رفتار تیز ہو چکی تھی لیکن ابھی اس میں ناہمواری نہیں آئی تھی۔

اس وقت بھی مجھ کو نیند نہیں آ رہی تھی مگر میں نے بستر پر لیٹ کر بجلی بجھا دی۔ کمرے کا مشرقی دروازہ کھلا ہوا تھا اور کمرے میں باہر سے زیادہ اندھیرا تھا۔ اس لیے باہر کا اندھیرا کمرے کے اندر روشنی — بہت مدھم، مگر روشنی — کی طرح داخل ہو رہا تھا۔ میرے جونہی کروٹ لی پھر میرا منہ مشرقی دروازے کی طرف تھا۔ دروازے سے دو قدم آگے کھلے آسمان کے نیچے میرا [illegible] کتا منہ بنا بیٹھا تھا۔ میں دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آندھی کے آثار شروع ہوتے ہی کتے کی حالت رہ رہ کر بدلنے لگی تھی۔ وہ عام کتوں سے بہت بڑا تھا۔ مجھ کو یہ سوچ کر ہنسی آئی کہ دو سال پہلے میں اسی کتے کو اپنے اوورکوٹ کی جیب میں رکھ کر لایا تھا۔

"جانوس!" میں نے آہستہ سے کتے کو پکارا۔

کتے نے بیٹھے بیٹھے دو تین مرتبہ دُم ہلائی۔

"جانوس!"

کتا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک جگہ پر کئی چکر کاٹے، پھر ذرا آگے بڑھ کر دروازے سے اپنا چہرہ رگڑنے لگا۔ اسے کمرے کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

"بیٹھ جاؤ، شاباش!"

کتے نے پھر دو تین چکر کاٹے اور اس بار دروازے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ مجھ کو اب کمرا بہت محفوظ معلوم ہونے لگا اور اب میری آنکھوں پر نیند کی ہلکی تاریک جھلی سی منڈھ گئی۔ میں نے نیم غنودگی میں کروٹ لے کر دروازے کی طرف پیٹھ کر لی۔ سر کے نیچے سے تکیہ ہٹا لیا اور میرے خیالات بے ربط ہو گئے۔ یہ نیند کی علامت تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور

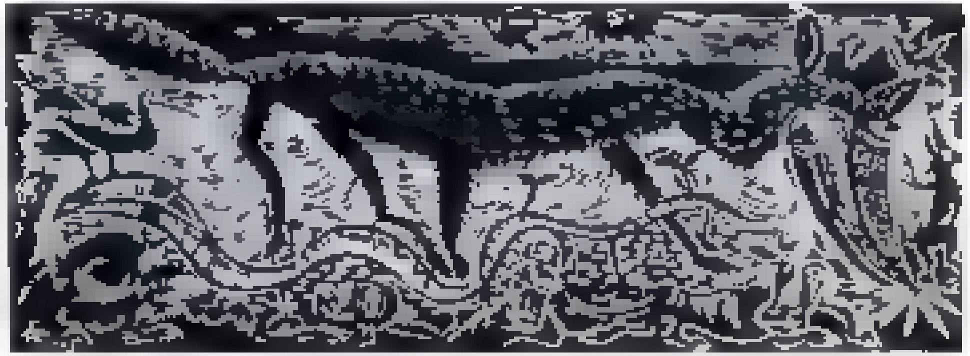

Scanned with CamScanner

بند کر لیں۔ لیکن جب میرے حواسوں کی بیرونی مصیبت کی حد کو پہنچ چکی تھی، وہ مہمل خیال بھی مجھے ایسے تھے کہ اندھیرے میں لوٹتے معلوم ہو رہے تھے۔ اسی وقت مجھ کو آندھی کی آواز بہت قریب سنائی دی۔

آندھی آ رہی ہے، میں نے سوچا۔ پھر یہ خیال بھی واہیات ہوتا ہوا ڈوب رہا تھا کہ میری پشت پر کتا گرج دار آواز میں بھونکا۔ مجھ کو ایسا محسوس ہوا جیسے میری انگلیوں اور ناخنوں اور جسم پر سے کھالیں سی کھینچ لی گئی ہوں۔ میں نے تڑپ کر دروازے کی طرف کروٹ لی۔ مجھ کو کتے پر غصہ آ گیا تھا، لیکن کتا اب اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ وہ بھونکتا ہوا سیدھا جا رہا تھا اور اس کی دم بہت تیزی سے ہل رہی تھی، آواز سے ظاہر تھا کہ اسے کوئی آہٹ ملی ہے اور وہ سیدھا اس آہٹ کی طرف جا رہا ہے۔ اسی وقت کھلے ہوئے دروازے کے باہر غبار کی ایک چادر سی گری اور باہر کا اندھیرا بھی گہرا ہونے لگا۔

"ہوا!" میں نے اپنی جگہ سے کہا۔ "لیکن میں عناصر سے مرعوب نہیں ہوں۔" مجھے پھر کتے کی آواز آئی لیکن اس بار اس کی آواز بھی ہوئی سی تھی اور اس میں اس کی مخصوص ہوک بھی شامل تھی۔

اس نے کچھ دیکھ لیا ہے، میں نے سوچا۔ اسی کے ساتھ آندھی نے غراہٹ کے ساتھ کمرے کی شمالی دیوار پر ٹکر ماری اور دروازے کے اوپر والا روشن دان کھل گیا۔ کچھ سوکھے پتے روشن دان سے داخل ہو کر کمرے کی جنوبی دیوار سے ٹکرائے اور پھر کھڑکھڑاتے چھت کی سمت دیوار سے گھستے ہوئے میرے فرش پر آ گرے۔ ان سب آوازوں پر کتے کی آواز حاوی تھی۔ وہ لگاتار بھونک رہا تھا اور ہر بار اس کی ہوک زیادہ لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہوا سے لڑ رہا ہے، لیکن اچانک مجھے شبہ ہوا کہ میں نے ایک سانس ... سنی۔ کتے کی آواز اور تیز ہو گئی۔ میں نے کانوں پر زور دیا۔ شک کی گنجائش نہیں تھی۔ ایک گھٹی گھٹی سی لیکن بھاری آواز کتے کو چپ کرانے جتن رہی تھی۔

میں بستر سے کود پڑا۔ میں بلاوند کی مصروفیت سے واقف تھا۔ اس وقت آنے والا کون ہو سکتا ہے، میں نے یہ نہیں سوچا۔ اس لیے کہ مجھے جو کوئی بھی تھا اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ مجھ کو ابھی ابھی یاد آیا تھا کہ میں نے آج برآمدے میں کھلنے والا دروازہ بند نہیں کیا ہے اور جسے باہر کھلنے والا سلاخوں دار پھاٹک بھی ابھی تک کھلا ہوا ہے۔ میں نے جلدی سے اپنی چپلیں، شلوار اور جمپری کو لے لی، سنبھالتا ہوا کمرے سے باہر آنے لگا۔

"بلاوند!" میں زور سے چیخا۔ "نہیں بلاوند!"

مجھے برآمدے میں پہنچ کر میں نے پھر کتے کو آواز دی۔ پھاٹک سامنے نظر آ رہا تھا۔ کسی نے اسے بند کر دیا تھا۔ آندھی ابھی زمین کی طرف نہیں جھکی تھی اور وہیں کے مقابلے میں ہوا کا زور کم تھا۔ پھر بھی چمن کے درخت بار بار جھک رہے تھے اور ہوا ان کی شاخوں میں الجھ رہی تھی۔ مجھے پھاٹک کے باہر اتنا چمکدار روشنی تھی، ... کہ سامنے سڑک کی ...

آندھی کی گونج کے حلقے میں سی بھی ہر دو دھیا روشنی کا بنسنا سا گنا تھا۔ پھاٹک کی سلاخوں کے سائے لمبے ہو کر برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچ رہے تھے اور ان سیاہ دھاریوں کے بیچ میں کتا پچھلی ٹانگوں سے مٹی اڑا اڑا کر مسلسل بھونکے جا رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دو ہی چھلانگوں میں وہ میرے پاس پہنچ گیا اور میرے گرد چند چکر کاٹ کر پھر واپس جانے لگا لیکن میں نے بڑھ کر اس کا پٹا پکڑ لیا۔

"کون ہے؟" میں نے پکار کر پوچھا۔ میری نظریں پھاٹک کے باہر جمی ہوئی تھیں۔ کتا پھاٹک کی طرف جانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ میں برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر کچھ دور تک اس کے ساتھ آگے بڑھا۔

"کون صاحب ہیں؟" برآمدے اور پھاٹک کے درمیان رک کر میں نے پھر پکارا۔ لیکن پھاٹک کے باہر کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی میں پھاٹک تک گیا اور کچھ دیر تک اس کی سلاخوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر میں کتے کی طرف مڑا۔

"آؤ دوست، واپس چلیں۔" میں نے کتے سے کہا۔ "کوئی آیا ضرور تھا، مگر تمہاری وجہ سے پھاٹک بند کر کے چلا گیا۔"

میں کتے کو پکڑے برآمدے کی طرف واپس ہونے لگا۔ بائیں ہاتھ کے درخت کی شاخوں سے تازہ پتے زمین پر گر کر ناچ رہے تھے۔ میں نے اوپر دیکھا۔ پیپل والا درخت بہت اونچا تھا اور اس کی چوٹی ہوا کی زد میں تھی۔ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں آندھی اس کو نقصان نہ پہنچا دے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ایسی آندھیاں سال میں کئی مرتبہ آتی ہیں اور درخت انھیں جھیل لے جاتا ہے۔

زمین پر پتے ادھر ادھر دوڑنے لگے اور میں نے برآمدے کی طرف قدم بڑھایا، لیکن مجھے ٹھٹھک کر رک جانا پڑا۔ زمین پر پھاٹک کی سیاہ دھاریوں کے درمیان ایک سایہ نمودار ہو گیا تھا۔ میں نے کتے کے پٹے پر گرفت مضبوط کر لی اور گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ باہر پھاٹک کی سلاخوں سے لگا ہوا کوئی کھڑا تھا۔ پیچھے سے پڑتی ہوئی تیز روشنی میں وہ خود بھی کوئی پرچھائیں معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں کچھ سامان سنبھالے ہوئے تھا اور ایک ایسا سیاہ مجسمہ نظر آتا تھا جس کی کمر سینے سے دوگنی چوڑی ہو۔

"کون؟" میں نے اپنی جگہ سے ہٹے بغیر پوچھا، اور کتے کا پٹا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ کتا بھونکتا ہوا پھاٹک کی طرف جھپٹا۔ مجسمہ تیزی سے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے بڑھ کر پھر کتے کا پٹا پکڑ لیا۔

"کون صاحب ہیں؟" میں نے پھر پکار کر پوچھا۔ لیکن جواب ملنے سے پہلے ہی آندھی زمین پر جھک آئی۔ پھاٹک کے باہر کی بھربھری مٹی پر ہوا کا پہلا طمانچہ پڑا۔ غبار کا ایک بھنور سا اٹھا اور مجسمہ اس کے پیچھے چھپ گیا۔ ادھر ادھر سے کئی بگولے دوڑتے ہوئے آئے اور اس بھنور کے ساتھ مل کر ناچنے لگے۔ ہوا ناہموار ہو چکی تھی۔ ایک اور جھونکے نے

Scanned with CamScanner

جالی کو سامنے سے ہٹایا تو مجسمہ پھاٹک سے لگا نظر آیا۔ اس کے بال لمبے تھے اور ہوا سے اڑ رہے تھے۔

"کون صاحب ہیں؟" میں نے ہاتھ بڑھا کر پھاٹک تھوڑا سا کھول دیا۔ "اندر آ جائیے۔"

مگر پھاٹک کھلتے ہی مجسمہ پھر مڑ کر پیچھے ہٹ چکا تھا۔ اور اب آندھی کا شور اتنا تھا کہ مجھ کو خود اپنی آواز مشکل سے سنائی دے رہی تھی۔

"[illegible]" میں نے چیخ کر کہا [illegible] مجھ کو جواب بھی ملا [illegible]

"کتے نہیں بولیں گے، اندر آ جائیے۔"

میں کتے کو پکڑے پکڑے برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔ زمین پر پھاٹک کی سیاہ جھاڑیوں کی درمیانی فاصلہ کم ہو گیا۔ میری پشت پر نوواردہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر میں ٹھہر گیا۔ اب نوواردہ میرے برابر آ چکا تھا۔ خالی بجلی کی روشنی برآمدے تک آتے آتے پھیکی ہو گئی تھی۔ مگر یہ پھیکی روشنی بھی یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی کہ آنے والا بہت خستہ حال شخص ہے۔ اس کا لباس تک سالم نہیں تھا۔ اس کا رنگ اتنا کالا تھا کہ برآمدے کی مدھم روشنی میں اس کے ناک نقشے کا ٹھیک پتا نہیں چلتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رسی سے بندھا ہوا ایک بستر تھا اور دوسرے ہاتھ میں ٹین کا کنستر جس میں کبھی بناسپتی گھی رہا ہو گا لیکن اب ٹین کا کنارےدار ڈھکنا اور کنڈا لگا کر اس کو زیادہ کارآمد بنا لیا گیا تھا۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کی نظریں کتے پر جمی ہوئی تھیں۔

"کہاں سے آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کاٹتا تو نہیں؟"

"نہیں۔ کہاں سے آئے ہو؟"

"ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔"

"میں ہی ہوں۔"

اب اس نے مجھ کو سلام کیا۔ سلام کا انداز شائستگی سے خالی نہیں تھا۔

"حضور ڈاکٹر صاحب،" اس نے ذرا رک کر کہا، "مجھے جانی محمد نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

"جانی محمد؟"

"جو چار سال آپ کی ملازمت میں نوکر تھا۔ مجھے وہ کانپور میں ملا تھا۔"

"جانی محمد کانپور میں کیا کر رہا ہے؟ اندر آ جاؤ۔"

میں نے برآمدے سے ملحق ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر بلب روشن کر دیا۔

"ہوٹل میں نوکر ہے۔" نوواردہ دروازے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

بجلی کی تیز روشنی میں وہ اور زیادہ خستہ حال معلوم ہو رہا تھا، اور ڈرائنگ روم کی آرائش نے اس کی شکستگی کو اس قدر نمایاں کر دیا تھا کہ میں اس سے صوفے پر بیٹھنے کو کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے پائجامے کی موریاں کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھیں اور قمیص کی آستینیں گھس گئی تھیں۔ اس کے بالوں کی لٹیں کندھوں سے کچھ اوپر جھول رہی تھیں۔ چھوٹی مگر گھنی داڑھی اس کی سیاہ جلد میں مل کر اس کے چہرے کو اور بڑا دکھا رہی تھی۔ چوڑی ہڈی اور لمبے قد کا وہ جسیم جوان آدمی یقیناً مرعوب کر دینے والی شخصیت کا مالک تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔

"جانی محمد نے آپ کو سلام کہا ہے اور بغیر کہے نوکری چھوڑ دینے کی معافی مانگی ہے۔ حضور ڈاکٹر صاحب، وہ آدمی برا نہیں ہے۔ آپ کے پاس رہتا تو پھر سکتا تھا۔ وہ اس کے موہے بچے بھجوائے ہیں۔" اس نے پائجامے کے نیفے میں سے ایک کاغذ میں لپٹے ہوئے نوٹ نکال کر مجھ کو دے دیے۔ "اس نے کہا تھا لکھیو بھیجیو، ڈاکٹر صاحب کو یہ دے دینا۔ اس لیے ناوقت آپ کو تکلیف دی۔"

مجھ کو جانی محمد کی ایمانداری پر ذرا حیرت ہوئی۔

"حضور، کتے کو روک لیں تو میں چلا جاؤں۔"

"ابھی آندھی تیز ہے، کچھ دیر بیٹھ جاؤ۔" میں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"حضور کو زحمت ہو رہی ہو گی۔"

"نہیں، کوئی بات نہیں۔" میں نے اسے پھر صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نوواردہ کچھ دیر ہچکچانے کے بعد بڑے صوفے کے سرے سے لگ گیا۔ اس کا سامان اس کے ہاتھ میں تھا۔ اب اس نے بستر اپنے زانوؤں پر اور کنستر سامنے جوتے کی چھاتی پر رکھا اور پہلی بار کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ میری نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

اس شخص میں کوئی بات تھی جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"تم جانی محمد کو کیوں کر جانتے ہو؟"

"ہم دونوں ایک ہی ہوٹل میں کام کرتے تھے۔"

"تم بھی ہوٹل میں کام کرتے ہو؟"

"اب الگ ہو گیا ہوں۔"

"اب کیا کرتے ہو؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر اس کی گردن جھک گئی اور آواز دھیمی ہو گئی۔

"جانی محمد نے کہا تھا اپنے لیے بھی ڈاکٹر صاحب سے بات کرنا، وہ کوئی کام ضرور دلوا دیں گے۔"

"کانپور سے چلے کیوں آئے؟"

"دل نہیں لگتا۔"

Scanned with CamScanner

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"یہیں لکھنؤ کا۔ مدت ہوئی باہر رہا، لیکن حضور ڈاکٹر صاحب، لکھنؤ والے کا اور کہیں دل بھی تو نہیں لگتا۔"

"یہاں تمہارا مکان کہاں ہے؟"

"اب کہیں نہیں۔ خاندانی مکان لڑکپن ہی میں ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ والد صاحب کا انتقال شاہ میر کی سرائے میں ہوا۔ والدہ مجھے لے کر نورباغ کے خیرات خانے میں اٹھ آئیں۔ وہ بھی گزر گئیں تو میں شہر چھوڑ کر نکل گیا۔"

یہاں پہنچ کر وہ سیاہ فام شخص اونگھ گیا۔ وہ کچھ اور بھی بڑبڑایا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آیا، البتہ "نواب سیوا... کی حویلی" کے لفظ میرے کان میں پڑے اور میں نے پوچھا:

"نواب سیوا... کی حویلی کیا؟"

"حضور ڈاکٹر صاحب" سووارہ نے ہوشیار ہو کر کہا، "نواب سیوا... کی حویلی تو بہت ... ؟"

"ہاں، اس کو منظور صاحب نے خرید کر ٹھیک کروایا ہے۔"

"یہ منظور صاحب..." اس نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا، "نواب ہیں؟ نواب منظور علی خاں؟"

"نہیں، تاجر ہیں۔ منظور شاہ نام ہے۔"

"لکھنؤ ہی کے ہیں؟"

"مجھے ٹھیک معلوم نہیں۔"

"کاہے کے تاجر ہیں؟"

"یہ بھی ٹھیک نہیں معلوم۔"

اس کے بعد دیر تک خاموشی رہی اور باہر تیز ہوا کی ہلکی ہموار آواز سنائی دیتی رہی۔

"یہ جو سیوا... کی حویلی ہے،" سووارہ کہتے کہتے رکا، پھر بولا، "ہماری تھی۔"

میں نے ... کی طرف دیکھا۔

"بہت ... بگڑ گیا،" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "والد صاحب کی زندگی حویلی ... شاہ میر کی سرائے میں ہو... مجھے یاد بھی نہیں حویلی کے اندر کیا تھا۔ والدہ بتاتی تھیں..." وہ پھر اونگھ گیا اور اس کا سر جھکنے لگا۔

میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"حضور ڈاکٹر صاحب" اس نے پھر ہوشیار ہو کر اپنا جھکتا ہوا سر اٹھایا۔ "آندھی کا زور گھٹتا جا رہا ہے۔ کتے کو روک لیجئے، کل جس وقت حکم دیجئے حاضر ہو جاؤں۔"

مجھ کو محسوس ہوا کہ اس کی بیماری واقعی کچھ کھل سی ہو گئی ہے۔ مجھے یہ

بھی محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے نظریں چرا رہا ہے اور مجھ کو ہر طرف دیکھتے دیکھ کر پریشان ہو رہا ہے۔

"حضور کی مہربانی سے کوئی کام مل جائے تو..." اس نے بستر کو داہنے ہاتھ میں دبائے، سامنے رکھے ہوئے کنستر کو بائیں ہاتھ سے اٹھا کر صوفے سے اٹھنا چاہا مگر نہ اٹھ سکا۔ دوسری کوشش میں بھی نہ اٹھ سکا۔ آخر تیسری بار اس نے جھٹکے سے خود کو اچھالا اور اس کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی جسے اس نے فوراً ہونٹ بھینچ کر روک لیا۔

اب میں نے دیکھا کہ اس شخص کا بدن کانپ رہا ہے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اٹھ کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"جی؟" اس نے قدرے گھبرا کر پوچھا۔

"تم کانپ رہے ہو۔"

"جی نہیں تو"

"بیٹھ جاؤ، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں، حضور ڈاکٹر صاحب، کتے کو روک لیجے،" اس نے کسی ضدی بچے کی طرح کہا۔

پھر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے جانے دیا جائے۔ میں نے دروازے کے قریب جا کر کتے کو اوپر جانے کا اشارہ کیا۔ کتے نے فوراً تعمیل کی۔ میں سووارہ کی طرف مڑا۔

"ٹھیک ہے،" میں نے کہا، "کل صبح نو بجے مطب میں آ جانا۔"

سووارہ نے مجھ کو سلام کیا اور دروازے سے باہر نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ ایک نظر اوپر کے زینوں کی طرف دیکھا اور برآمدے کی سیڑھیاں اتر گیا۔ چند لمحوں میں اس کا سایہ بھی برآمدے سے غائب ہو گیا۔

میں نے بلب بجھانے کے لیے سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ باہر ایک دھماکا سا ہوا اور ابھی میں اس آواز کو سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ زینے پر سے کسی کے کودنے کی آواز سنائی دی اور اسی کے ساتھ کتا برآمدے سے اتر کر ... کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ میں فوراً باہر نکل کر برآمدے سے نیچے اتر آیا۔ سامنے پھاٹک کی سلاخوں کے سائے میرے قدموں تک آ رہے تھے اور مجھ سے کوئی پندرہ قدم آگے وہ شخص ایک سیاہ ڈھیر کی طرح زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے گرنے سے گرد کا ایک چھوٹا سا بادل اٹھا تھا جو ابھی تک اس پر منڈلا رہا تھا، اور حالانکہ ... کی چاندنی کی روشنی اس کی وجہ سے کچھ دھندلا گئی تھی۔ کتا خاموش مگر بے قراری کے ساتھ اس بے حرکت پڑے ہوئے انسان کو ہر طرف سے سونگھ رہا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی کتا میری طرف لپکا، منہ سے کچھ باریک آوازیں نکالیں اور پھر اس جسم کی طرف دوڑ گیا۔ میرے وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ ... جھکا ...

میں اس کے قریب پہنچ کر جھکا۔ وہ زمین پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ بستر اس کے ہاتھ سے

چھوٹ گیا تھا لیکن کنستر کا کنڈا ابھی تک اس کی انگلیوں میں پھنسا ہوا تھا۔ کنستر کا ڈھکنا کھل گیا تھا اور روشنی سیدھی اس کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ کنستر خالی تھا۔ رسی پر پڑے ہوئے آدمی کا داہنا ہاتھ آگے کی طرف پھیلا ہوا تھا اور اس کی مٹھی اس طرح بھنچی ہوئی تھی جیسے اس نے رسی کو پکڑ رکھا ہو۔ پھر اس کا ہاتھ سخت اور بدن ڈھیلا ہو گیا۔ پھر اس نے کنستر کو چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے رسی پر زور دیا اور اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کا سر اور کندھے دو بالشت اوپر اٹھ کر پھر رسی سے لگ گئے۔ اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی اور میں نے ایک کھنا جھٹکا کر اس کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ ذرا سی کش مکش کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا لیکن اس کی ٹانگوں میں دم نہیں تھا۔ اس نے جھک کر ایک ہاتھ سے کنستر کو پکڑا اور پھر بیٹھ گیا۔

"چکر آ رہا ہے۔" اس نے یہ ظاہر نہیں ایک کو بتایا۔ اب اس کی آواز بہت کھوکھلی ہو چکی تھی۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھایا۔ کنستر بھی کچھ دور تک اوپر اٹھا پھر چھوٹ کر رسی پر گر گیا۔ کتا، جو مستقل ہم دونوں کے گرد چکر کاٹ رہا تھا لپک کر قریب آیا اور کنستر کو سونگھنے لگا۔

"چکر آ گیا تھا۔" مریض نے مجھ کو بتایا۔

میں اس کو سہارا دیے ہوئے برآمدے کی سیڑھیوں تک لایا۔ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اس شخص پر بے ہوشی طاری ہونے لگی اور جب تک میں اس کو ڈرائنگ روم کے صوفے پر لٹاؤں وہ بالکل غافل اور بے حرکت ہو چکا تھا۔ مجھ کو اس کے زندہ ہونے میں شک تھا۔ اس کا سیاہ چہرہ اور بال گرد میں اٹ گئے تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ کی مٹھی کھل گئی تھی اور اس میں سے مٹی نکل کر صوفے کی چادر پر گر رہی تھی۔

میں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا، پھر تیزی سے اوپر گیا۔ کتا بھی میرے پیچھے ہو لیا۔ اوپر سے اسٹیتھوسکوپ لے کر میں واپس نیچے آیا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے بند کر کے میں مڑا۔ مریض اب بھی صوفے پر بے حرکت پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کا معائنہ کیا اور اسی معائنے کے بیچ میں اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن یہ آنکھیں شیشے کی سی تھیں اور ان میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے خد و خال اچھے تھے۔ اس کی آنکھوں کے گرد باریک جھریاں تھیں۔ اگر یہ جھریاں اس کے سیاہ رنگ میں چھپ نہ گئی ہوتیں تو وہ زیادہ عمر معلوم ہوتا۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر مہمان تھیں اور اس حالت میں ایک لاش کی طرح پڑا ہوا وہ بہت مطمئن اور آسودہ حال معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس کی آنکھوں میں ہوش جھلکنے لگا۔ اس کی پلکیں تھرتھرائیں۔ اس نے مجھ کو پہچاننے کی کوشش کی، اور پہچان لیا۔ پھر اس نے اٹھنا چاہا اور اس کی آنکھوں سے کرب ظاہر ہونے لگا۔ میں نے اس کے سینے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روکا۔

"لیٹے رہو۔" میں نے کہا، "کیا تکلیف ہے؟"

"میں چلا جاؤں گا۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، اور پھر اٹھنا چاہا۔

"ابھی تمہاری طبیعت نہیں ٹھیک ہے۔" میں نے اسے سمجھایا اور اب … دوپہر … کی تکلیف ہے؟

"تھکن، چکر، اور …" وہ رک گیا، پھر بولا، "بہت تکلیف ہے۔"

میں معائنہ ختم کر چکا تھا۔

"اچھا لیٹے رہو۔" میں نے کہا "دوا دیتا ہوں، ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے مڑ کر ایک نظر مریض کو دیکھا اور میرا ہاتھ ہینڈل پر رکا رہ گیا۔ باہر سے دروازے پر دھکا پڑا، دروازہ پورا کھل گیا۔ کتے کا سر اندر داخل ہوا۔ وہ ہوا کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ میں مڑا اور تیز قدموں سے مریض کے سرہانے پہنچا۔

"سنو۔" میں نے مریض پر جھک کر آہستہ سے پوچھا، "آج تم نے کیا کھایا تھا؟"

"کچھ نہیں۔"

"کل؟"

مریض خاموش رہا۔

"کل تم نے کچھ کھایا تھا؟"

مریض خاموش رہا۔

"کب سے بھوکے ہو؟" میں نے ذرا درشتی سے پوچھا۔

میری آواز بظاہر مریض کو سنائی نہیں دی۔

"تم کب سے بھوکے ہو؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

مریض کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی تھیں لیکن وہ ہوش میں تھا۔ اس کے ادھ کھلے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ اب میں نے بہت نرم لہجے میں اس سے پوچھا،

"تم نے کب سے کچھ نہیں کھایا ہے؟"

مریض نے کوئی جواب نہیں دیا۔

دروازے کے اندر منہ ڈالے کتا ہانپ رہا تھا اور باہر ہوا ٹین کے خالی کنستر کو ادھر سے ادھر لڑھکا رہی تھی۔ میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر … کے … کمرے میں پہنچ کر میں نے سوچنے کی کوشش کی کہ مجھے کیا کرنا ہے … بستر پر بیٹھ کر تکیے سے ٹیک لگا لی اور ذہن پر زور دینے لگا۔ مجھے چاروں طرف … سے نکلتی محسوس ہوئی۔

شمالی روشن دان میں سے گرتے ہوئے سورج … کی کھڑکھڑاہٹ سے میری آنکھ کھلی۔ میں اٹھ بیٹھا اور چہرہ … ہوا نیچے اترا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ باہر سے بند تھا

میں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ پھر میں برآمدے کی کھلی ہوئی دروازے سے نیچے اترا۔ سلاخوں دار پھاٹک بھی کھلا ہوا تھا۔ میں نے پھاٹک بند کر دیا اور کچھ دیر وہیں کھڑا رہا اندھیرا ہو گئی تھی۔ مجھ کو پس پردوں کے پاس کتے کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"دوست، واپس چلیں" میں نے کتے سے کہا اور برآمدے کی طرف مڑ گیا۔ برآمدے کا دروازہ بند کر کے میں اوپر اپنے کمرے میں پہنچا

بستر پر لیٹتے ہی میرے خیالات مربوط ہو گئے۔ ایک خیال میری رہائی پر لپکا

"وہ ہیں حاضر سے موجود نہیں تھا۔" پھر یہ خیال طرح طرح کی مہمل شکلیں اختیار کرتا گیا

"پھر بھی جاسوس تم نے انکار نہیں کیا" میں نے کہا اور سو گیا

اکرام اللہ

کتنا پانی

گاڑی لیٹ ہوتے ہوتے شام آٹھ بجے کی بجائے رات ساڑھے دس بجے راولپنڈی سے لاہور پہنچی۔ رحمٰن کو جب بھی لاہور کا ریلوے اسٹیشن دیکھنے کا اتفاق ہوتا تو وہ اسے ایلس کی طرح اڑا کر خوابوں کی سرزمین میں پہنچا دیتا۔ اسے لگتا جیسے وہ اسٹیشن نہ ہو بلکہ کسی پرستان کی شہزادی کا قلعہ نما پرشکوہ محل ہو، ایسے عجائبات اور اسرار سے بھرا ہوا جو ابھی دریافت ہونے کو ہیں اس کے منتظر ہوں۔ وہاں چلتے پھرتے اس کے دل کے ایک کونے میں یہ احساس بھی کروٹیں لیتا رہتا جیسے وہ عالیشان محل اور اس کی مالک شہزادی دونوں اس کے اپنے ہی ہوں۔ سنگ مرمر کے فرش والے بہت بلند اور کھلی شہ نشینوں کے دونوں طرف اونچے مخروطی بُرجوں والی سرخ اینٹوں کی عمارت دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔ پلیٹ فارموں پر ٹرینوں کی ڈھولتی لمبی سیاہ چادروں کی چھتیں تھیں۔ انہی پلیٹ فارموں کو آپس میں ملاتی گئی ان کھلے کھلے بہشت سے پلیٹ فارموں پر بیک وقت چھ چھ ٹرینیں نیلی اور گہری بھوری انگلی کالی پھنکارتے انجنوں سے جتی مسافروں کی فوج میں سگنل کی لیے تیار کھڑی ہوتیں۔ گو کہ وہاں میلوں کی سی بھیڑ بھاڑ کا منظر آتا تھا لیکن میلوں میں جو اس قدر افراتفری، بدنظمی اور گرد بھرے مسافروں کا نظارہ نہیں ہوتا۔ وہاں ہر ایک طرح سے پنجاب میں بسنے والے مختلف مذہبی، معاشی اور سماجی گروہوں کے رہن سہن کی زندہ نمائش منعقد ہو رہی ہوتی۔ پگڑیوں اور بے داغ کپڑے سنبھالے ایک دائرے میں بیٹھے خط پہنے لباس اداس اور لاہور کی بساطیں سے خریدے گئے سرخ رومی ٹوپیوں کے سیاہ پھندے ہلاتے بےفکرے شہری مسلمان۔ سفید لانگڑ دھوتیوں میں موٹے موٹے سینے پٹاریوں والے بوجھاری۔ رنگین پگڑیوں اور کرپانوں والے سکھ۔ ہونٹوں میں سگریٹ دبائے، سر پر ہیٹ لگائے ایک اعتماد سے مٹکتے پھرتے اینگلوانڈین۔ سیدھی آسمان سے اتری ہوئی سنہری بالوں والی مغرور میمیں۔ کوہ وقار سی صاحب بہادریں۔ ٹخنوں تک لمبے، ٹوپی والے برقعوں میں بند گرتی پڑتی مسلمان عورتیں۔ ساڑھیوں میں بدن سنبھالی ہندو عورتیں۔ رنج عدیت کرتے سچے ڈھونڈ ہو چھیں صاحب، نہ سو جوڑے مٹکے والک سے نیرکتے ہوئے لوگ۔ چھچھے چلاتے خوانچہ فروش۔ سرخ قمیضوں اور سرخ پگڑیوں والے سامان قلی بانہیں اٹھائے۔ میں ورداں میں ایک شاہ سپہ داری سے خراماں خراماں چلتا پھرتا ریلوے کا مجلا عملہ یہ سب آپس میں

وہاں یوں خلط ملط ہو رہی ہوتی جیسے ریلوے اسٹیشن کوئی بہت بڑا ہرا بھرا آبادی ہوتی دیگ
ہو جس میں کوئی نہ جانے اجرا ڈال گیا، ایک بڑے کفگیر سے خوب زور زور سے ہلاتے ہوئے
جس کا جسم پک رہا ہو۔ لیکن اس کی ذاتی فی ذمہ داری کسی کی بھی نہ ہو۔ آج جب اس کی
گاڑی لاہور کے ریلوے سٹیشن پر پہنچی تو بجلی کی روشنی تو دور دور تک اسی طرح
جگمگا رہی تھی رات کو دن بنانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ لیکن ہر طرف خاموشی،
اداسی اور ویرانی کا دور دورہ تھا۔ اس شام کی آخری گاڑی کے استقبال کے لیے صرف آٹھ
دس قلی جھولوں میں ہاتھ دیے دیوار سے پیٹھ لگائے کھڑے تھے۔ کل کوئی سو سوا سو مسافر
ہوں گے جو بہار ختم ہونے والی گاڑی میں سے اتر کر ٹھٹھرتے ہوئے اپنی گٹھڑیوں کے بوجھ
تلے دبے دروازے سے گزرتے ہوئے ڈیوڑھی میں پہنچ رہے تھے۔ ان کے چہروں سے یہ عیاں
ہو رہا تھا کہ لاہور تو خیر پہنچ گئے لیکن اتنی رات گئے آرام اور گرم کھانے اور سکون
کی منزل، گھر پہنچنے کا کیا ہو گا۔ ڈیوڑھی کے دروازے سے ذرا ہٹ کر پلیٹ فارم پر
خوف اور سردی سے کانپتا ہوا ایک مریل سا پلا کھانے پینے کی بند سٹال کے سامنے بکھرے
ہوئے پتوں کے گندے دونوں کو کسی ٹکڑے کی تلاش میں سونگھتا اور احتیاطاً چاٹتا چلا جا
رہا تھا کہ شاید۔ مگر اس کی قسمت چھن ہو تو ایک بار منہ بھر دیں وہاں لقمے کی خاطر
سکڑ جی۔ وہ اپنے کام میں مصروف، ادھر ادھر چوری آنکھ سے دشمن پر ایک عاجزانہ سی
نظر بھی ڈال لیتا ہے۔ اس وقت ہر کوئی اپنی مصیبت میں پھنسا ہوا تھا۔ ڈھونڈے لیرے بھی
[illegible] اپنے بستے کے بوجھ تلے [illegible] والدین کے سہارے بیزاری کے عالم میں الٹے سیدھے
قدم اٹھاتے چلتے جا رہے تھے اس وقت وہ ایک ٹیوشن کی لائن میں نہ تھا۔ وہیں فرسٹ کلاس
کے ڈبے سے اترا تو ایک قلی نے آگے بڑھ کر پوچھا "صاحب، قلی؟"

"نہیں" اس نے سیری موچھ والے چوہدری افسر نے [illegible] سے لپٹ کر بوٹ پر بجلتی اور
آگے بڑھ گیا۔ اس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ کل شام اسے اپنے ساتھی افسروں کے ساتھ
[illegible] سے گلگت چلے جانا تھا اور وہاں سے پھر شاید برما محاذ پر جانا ہو۔ وہ
کرنل ربرٹ سے ایک دن پہلے کی خصوصی اجازت لے کر لاہور چلا آیا تھا تاکہ
والدین کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزار لے۔ مگر گاڑی لیٹ ہو کر وقت کو جو پہلے ہی کم
تھا اور کم کر دیا جس کا اسے افسوس ہو رہا تھا۔ پورچ کے اندر اور باہر کل ملا کر آٹھ
دس تانگے کھڑے تھے اور شدید سردی کی باعث ان کے گھوڑے پابہ زنجیر ہی کھڑے ہو کر
[illegible] کھیسوں کی بکلوں میں اپنی سیٹوں پر سمٹے [illegible]
مری مری آوازیں لگا رہے تھے "ہے کوئی شاہی سواری کا سوار؟"

[illegible] مشرقی عشرہ ہوا کے ہاتھوں پاگل سا ہوا جانے، کبھی دائیں کبھی بائیں
دوڑے دوڑے جاتے تھے [illegible] بادلوں کا نقاب پہن کر خود بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا مگر
سیاہ بادلوں کو سرمئی سی پہچان دے گیا تھا۔ [illegible] آسمان پر ٹھہرے ہوئے
[illegible] ہونے کے گرنے کے انتظار میں دم سادھے کھڑے تھے۔ لیفٹیننٹ رمیش نے ایک تانگے والے

کو چٹکی کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "خالی ہے؟"

"جی صاحب"

اس نے اپنی کیپ اتار کر ہاتھ میں پکڑی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"کدھر صاحب؟"

وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے تو اسے گھر پہنچنے کی اسی جلدی میں کہ ایک ایک
منٹ جو گاڑی لیٹ ہوئی وہ اس پر گراں گزرا۔ گوجرانوالہ ریفریشمنٹ روم نے جو کھانا
دیا گیا وہ بھی اسی رنج میں اسے اچھا نہ لگا۔ آدھا کھایا واپس کر دیا۔ اور اب جیسے وہ
گھر جانا ہی نہ چاہتا ہو۔ اس کا گھر تو ٹمپل روڈ پر، نہر کے پل کے پاس، مگر اس کے
منہ سے نکلا میکلوڈ روڈ۔ دراصل لاہور پہنچ کر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے پورا شہر اس
کا اپنا گھر ہو۔ اس کی سڑکیں، بازار، سینما ہال، کلب، ریسٹورنٹ، مقبرے، گلیاں، سکول،
کالج اس کے گھر کے مختلف حصے ہوں۔ کوئی ایک خاص مکان اس کا گھر نہ ہو۔ کوچوان نے
چابک ہوا میں لہرایا اور منہ ٹیڑھا کر کے ٹک ٹک کی آواز نکالتے ہوئے نیم خوابیدہ گھوڑے
کو چلنے کا حکم دیا۔ پیچھے کھسکتی جاتی، جگمگاتی ڈیوڑھی اور پورچ اندھیرے کی سڑک
کے دوسرے کنارے سینما میں چلتی خاموش فلم کی مانند نظر آئیں۔ اب تانگا دور ہوا تو وہ
دوڑ سے پیچھے پھسلنے لگے۔ اب وہ اس ہجوم سے کٹ کر الگ ہو چکا تھا جو اپنی گٹھڑیوں
سمیت وہاں سے جلد کہیں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دفعتاً اس کے ذہن نے پتا نہیں کیوں، ان سے
انسان ہونے اور ساتھی ہونے کے جتنے بھی ممکنہ رشتے ہو سکتے تھے اپنے آپ کو ان سب
سے یکسر قطع کر کے دیکھنا شروع کر دیا۔ ان کی رات کی مسافتیں، موسم سے پناہ، کھانے
کی جلد بازی اور ایسی ہی تمام ضرورتوں کے لیے تگ و دو، اضطراب، بےبسی، مبہم سا
خوف اسے عجیب ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز بھی نظر آئی۔

ڈیوڑھی اور پورچ اور اسٹیشن کی دیوہیکل عمارت کسی پہاڑ کی مضبوطی کی طرح
جہاں کھڑی تھی۔ کیا خبر نہ ابھی لیے بوجھ تلے ان بےبسی اور مجبور تلملاتی جانی و بے
کیڑے مکوڑوں کو پیس کر رکھ دے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بھدی سی مسکراہٹ پھیل جو
چہرے کے نقوش میں کوئی اجلی چمک یا کوئی معصوم سی لہرانے کی بجائے یوں آپ سا
لیں گے جیسے CONCAVE آئینے میں عکس جھلک گیا ہو۔ اس نے سیری موچھ والے چوہدری
ہونٹ پر زور سے ایک بار پھیلائی، بےبسی سے رخ موڑ لیا اور سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔
افسر بننے کا نشہ آج بطور افسر لاہور کی زمین پر پہلی بار قدم رکھنے سے دوچند ہو گیا
تھا۔ اپنا شہر اپنی سڑکیں اور ان پر لیفٹیننٹ رمیش شرما اپنی کمائی سے سالم تانگے میں
ہر طرح کی پابندی سے آزاد گھوم رہا تھا اور کسی کو جواب دہ نہیں تھا۔ کچھ گورے فوجی
ہرکر ہونے کے لوہے کے گیٹ میں سے گزر کر ان کی صحن کو جھومتے جھامتے عبور کرتے
ہوئے پہلی عمارت کے لمبے برآمدے کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔ پلازا یا ریگل سے انگریزی

Scanned with CamScanner

فلم دیکھ کر آ رہے ہوں گے یا مصروف سے ہو کر آ رہے ہوں گے، یا مستقبل میں دور تک دیکھ رہے ہوں گے یا سینما ہال میں جا بیٹھے ہوں گے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی اسکول میں پڑھنے والی لڑکیوں کی کھڑکیوں سے دیکھ رہے ہوں جو چند روپوں کی خاطر ہی کی راہ تکا کرتی ہیں۔ پھر سڑک کے موڑ پر رکی ہوئی ہوٹل کی کھڑکی کی اونچی عمارت کے پیچھے سب کچھ چھپ کر رہ گیا۔ تانگے کی گھوڑی کی چھت پر بیٹھے سے ایک بوند گری۔ رمیش نے سر باہر نکال کر آسمان پر نظر دوڑائی۔ کچھ ستاروں میں سے چمک رہے تھے۔ تانگے والے نے چابک لہراتے ہوئے کہا شاہدرہ پہنچ وہی وقت ہے۔ کیا یہ پوچھا وہ کون ہے؟ رمیش نے کوچوان کے چہرے کو دیکھا کہ وہ کس سے کہہ رہا ہے یہ گھوڑے سے مخاطب ہو

پھر کیا ہی ہو سوچ کے تانگہ بھی طرف گھوما جا جاتی تو پہلے پرانی روڈ اس کی حس کی پیچھے رہ گئی تھا۔ پھر شاہ عالمی پھر لوہاری، پھر بھاٹی دروازہ بازار پیچھے رہ گئے۔ لاہور کی گلیوں سے جو کون تھا جو سائیکل پر گھومتے پھرتے اچھی طرح اس کا دیکھا بھالا نہیں تھا۔ سے جیسی صاف ستھری مال روڈ کی بلند و بالا اور وسیع دکانیں اور دیر رات تک سائیکل کے پہیوں سے روندی جانے والی جیل روڈ، لارنس روڈ، کوپر روڈ، ورث روڈ اور ان پر واقع اونچی سبز لائنوں والی، انگریزوں کے دور کی بنی درختوں کی چھاؤں میں گھرے مکانات جو اب تک لمبے لمبے ہر مدوں والے کوٹھیوں کی صحبت کی شکل یاد آتے وہیں اتنی ہی شدت سے تنگ گندی گلیاں اور کبھی کبھی بدبودار محلے بھی یاد آتے جہاں بلند شاہی چھوٹی اینٹوں کی بوسیدہ ہوتی ہوئی ایک دوسرے میں گھسی جاتی ہو منزلہ سہ منزلہ اندھیرے مکان واقع تھے ان کے لٹکتے چوبی والے چھجوں پر بدرنگ ہوتی لکڑی کی منقش کھڑکیاں اور بیل بوٹوں والے جنگلے پر گرونانک شاہ اور ان کے حسن پر نثار ہونے والے مکانوں اور بانے والوں کو موروں جیسی آنکھیں مستعمل اور مات کھاتی ہوئی خاموشی سے یاد آ رہی ہیں۔ مکانات جن میں تصویروں کا اپنی جگہ ہو سکتا ہے جو گزر چکا وہ کون جانتا ہے کہ کسی سے ہی ساتھ ہی میں ہو معاہدہ کیا۔ زندگی کی بنیادی جبلت جیسے ہم تصویروں کو صرف اپنی دوسرے ہی سے بیگانہ ہوتے ہیں۔

ہر شہر کے ستون کھنڈر سے سرے سے شروع ہوتا ہے۔ مکین و مکاں، زمین و زمان سب بدل جاتے ہیں۔ جو ہوں لگا کہ اونچی محرابی ڈیوڑھیاں جن پر کبھی سرخی ملی چونے سے پھرے ہیں اور جن میں بنائی گئی ہوں گی اب وقت کے ہاتھوں عاجز ہیں۔ لیس کرتی کٹتی رہ جاتی ہیں۔ کہیں کوئی شاخ کے بیچ کا ٹکڑا گرنے کا منتظر الگ کھڑا ہے۔ لکڑی کے دروازے، جنگلے اور کھڑکیاں جن پر کبھی عمدہ ریزی سے نقش و نگار بنائے گئے ہوں گے اب عمر میں پرانے بڈھے کی طرح سمٹ اور بھربھرے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرے جا رہے ہیں۔ اب یہ سارے مکان سیمنٹ اور سریے کی سپاٹ، بیکھر زاویے کاٹنے والی عمارتوں اور لکڑی پر چمکتے ہوئے رنگوں اور روغنوں سے شکست کھا کر ماتم سے منہ چھپاتے کھڑے ہیں، محض

اس لیے کہ ان کا وقت بیت چکا ہے اور وہ اب بھی موجود رہنے پر مصر ہیں۔ ماضی، ہوا اور خاک کی مانند ہر طرف نامعلوم انداز میں بکھر اور پھیلا ہوا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی کھنڈر کے پیچھے ہر جو حال کے اندر در آیا ہو اور اسے پھاڑتا ہوا آگے نکل جانے والا ہو مگر وہ بہت کی دیوار ثابت ہوتا ہے۔

پروہت سیٹھ کی پوشاکوں میں گھر خاموش کھڑا تھا۔ خواجہ فروش اور نان جھانک کے شوقین آج غالباً موسم کی سختی سے گھبرا کر غائب ہو گئے ہیں۔ دیواروں پر فلم پاگل کے رنگ برنگے پوسٹر سجے تھے جن پر پروموٹ راج ڈزنی اور سر کے بال سیکم طور پر بڑھتی پاگلوں کی سی صورت بنائی مختلف پوزوں میں نمایاں تھا۔ آخری شو چل رہا تھا۔ چند تانگے ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے۔ رمیش جو اس زمانے کے ان سوشل مندروں کا متوالا تھا، غور سے اسے گھورتے دیکھتا رہا جیسے اسے اس میں کبھی دیکھی ہوتی فلمیں اور جس جس کے ساتھ ساتھ جب جب دیکھی تھیں وہ سب یاد آ رہا ہو۔ پھر پیچیں دیں اور جھوٹا سینما گروپ، پروہات جیسی ہی کیفیت ہو گئی تھی اور وہی عالم اس پر کرون ریجنٹ سینما کی بالمقابل، سڑک سے کوئی دس بارہ فٹ بلند ایک ٹیلے پر، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کا ہوسٹل تھا۔ سڑک کے رخ کھلنے والی بہت سی کھڑکیاں روشن تھیں۔ اس نے سوچا کہ اگر ایف ایس سی میں اچھے نمبروں میں پاس کر لیا ہوتا تو آج وہ اپنے پتا کی خواہش کی تکمیل میں پڑھائی میں مشغول انہی لڑکوں کی طرح اس وقت مطالعے میں مصروف ہوتا اور تین سال بعد ڈاکٹر بننے والا ہوتا۔ باپ تو خوش ہوتا ہی، لیکن ماں کا سر بھی فخر سے اسمانی جتنا اونچا ہو جاتا جس نے اس کی ناکامیوں کی وجہ سے سارا عمر کلیجا چھلنی کر لیے۔ ان طعنوں کے بعد جیسے سب رمیش کے سر میں تو لٹو کی طرح گھس بیٹھا ہے بلکہ بھس بھی بھرا ہے سوچ سوچ کا ستیا ناس ہو گیا ہے۔ ونگ الودہ ایسی باتیں سن کر وہ بے حد ملول اور افسردہ ہو جاتی۔ ایک ٹھنڈا سانس بھرتی اور دوسرے کمرے میں جا کر ساڑھی کے پلو سے چھپ کر چپ چاپ اپنی آنسو بہایا کرتی۔ پھر اسی اداسی اور مایوسی کے عالم میں تھکی تھکی قدموں سے پھر کام میں مصروف ہو جاتی۔

رمیش گندمی رنگ کھلے ہاتھ پاؤں اور متناسب مضبوط بدن کا صحت مند لڑکا تھا۔ اسے زندگی کی چاشنی کے علاوہ ہر خوبصورت چیز سے پیار تھا مگر کتابوں سے دور بھاگتا تھا۔ باپ کے خوف سے ٹیوٹر کی موجودگی میں مارے باندھے کچھ پڑھ پڑھا لیتا باقی وقت دوستوں کے ساتھ گھومتا پھرتا، گپ شپ لگاتا، ہنستا ہنساتا، جیسے بھی ہو نئی فلم دیکھنا، لڑکیوں کے قریب کے لیے بیقرار رہتا۔ نانک جھانک تو چلتی ہی رہتی لیکن اسے ہی سے ملنے اور باتیں کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اندر کی سہیلیاں کبھی گھر پر آتیں تو مختلف بہانوں سے ان کی کمرے کے چکر پر چکر لگاتا۔ معصوم معصوم فقرے کستا رہتا۔ وہ ان کی باتوں سے محظوظ ہوتیں ہنستیں اور اس کی موجودگی سے خوش ہوتیں۔ انہیں دیکھ کر سے

ہی سے پیدا ہوتے وہ احساسات بہت عجیب سے لگتے مگر سمجھ میں کبھی نہ آسکے۔ یہ حسینائیں جن کی سکھیوں کے سامنے گرگٹ کی طرح موڑ سے رنگ بدل جاتا اور ہر بار جن کی گرفت سے چکنی مچھلی کی طرح پھسل جاتے۔ اسے لگتا جیسے وہ انسانوں سے لطیف تر معصوم سی بار یہ جو کوئی ماورائی مخلوق ہیں جو پتا نہیں کہاں اور کیسے اس دنیا میں چلی آئی ہیں اور ابھی جو یہیں اپنے دھنک جیسے رنگوں سمیت تحلیل ہو جائیں گی۔ وہ اسے کچھ کچھ اڑتی ہوئی تتلیوں کی سی اور کچھ کچھ جھومتے ہوئے پھولوں کی سی لگتیں۔ ہر جسم میں وہ کہاں ہیں یا جسم ہیں یا ان کی سمجھ سے جو ہیں اور جاتی ہیں، حلق سے نیچے نہیں جاتی کیونکہ نہ تو ان کا کوئی نظام ہضم ہے اور نہ انہیں غذائیت کی ضرورت ہے۔ وہ تو سب موسم، دھنک اور فرشتوں کی مانند کوئی غیرمرئی چیز ہیں جنہیں چاہا تو جا سکتا ہے مگر چھوا نہیں جا سکتا۔ بد دو کہیں "تم یہاں سے جاؤ ہم نے ابھی سبق کرنا ہے۔" اگر ضد کرو تو وہ ماماجی سے جا کر شکایت کریں۔ وہاں سے ڈانٹ سننی پڑتی۔ "رمیش، تمہارا لڑکیوں میں کیا کام ہے؟ چلو وہاں سے۔" لڑکیوں کی ہنسی کی گونج وہ ہمیشہ کو وہاں سے لے گیا۔

یہ رومانی بات جن کی ذہن میں پورے جسم ... کے اردگرد بلاامتیاز نہیں پھیلا ہوا تھا۔ ... عمر کی عورتیں اور بچوں کی بدصورت لڑکیاں خوبصورت بن سے مستثنیٰ ہوتی چلی جاتی تھیں۔ ان کے ذہن میں یہ صورت ذرہ بھی اس بات کا گزر نہ ہو سکا کہ لڑکیاں بھی اچھا ... جیسی اور سر سے سر تک ... والی شخص کی یہ سب کچھ ... ہیں ... کہ وہ کوئی غیرمرئی دھنک ہی یا ... وہ ایسی تھی جسے صرف چھو ہی جا سکتا تھا چاہا نہیں جا سکتا۔

—٭—

وہ تیرہ برس کا ہوا تو ... کمرے میں بند رہنے والی کتابوں کی سی زندگی سے اسے نفرت ہوئی۔ وہ زندگی کو یوں کھلی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا جیسے کوئی بچہ کھڑکی کی بند ... نہ صبح ڈھونڈتے ہیں ... سے انہوں کو دیکھنا چاہتا ہو مگر زندگی کھڑکی کی مثل کوئی ایک چیز ہو ... نہ ہو ... نظر آئے ... واپس آ گئے ... چوری گاہ ہو ... ایک نئی چیز ... کام ... اس کے لیے ناقابل برداشت ... ہوتا۔ ... سے کسی چیز پر پابندی لگائی جاتی اس کا شوق اسے کر گزرنے کے لیے ... سگریٹ پینے پر ... جماعت میں تھا تو دوستوں کو بہ اصرار سگریٹ پینے پر ... مل کر سگریٹ پیتے پکڑے گئے ... گھر جا کر اس کے باپ ... جواب طلبی ہوتی رہی۔ شریک گنہ ساتھیوں ... کر جن کے ماں باپ سے جو گلے کیے کہ تمہارے بیٹے نے ہمارے بچوں کو

بھی خراب کیا۔ وہ اس کے لیے الگ ندامت اور خفت کا باعث ہوئے۔

سینٹ انتھونی اسکول کے ہیڈماسٹر نے اسے اس کی علمی استعداد میں کمی کی وجہ سے سینیئر کیمبرج کے امتحان کے لیے نااہل قرار دے دیا۔ لامحالہ اسے پنجاب یونیورسٹی کا میٹرک کا امتحان دینا پڑا۔ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گیا۔ سائنس مضمون کالج میں ایف ایس سی میڈیکل گروپ میں بڑی مشکل سے داخلہ مل سکا۔ والد ہر قیمت پر اسے ڈاکٹر بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ دو سال بعد امتحان ہوا تو انگریزی کے سوا سب مضامین میں فیل۔ تیسرے سال تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ اب کیا ہو گا؟ اسے پہلی بار مستقبل اپنے اصلی گھناؤنے اور بھیانک رنگ روپ میں دکھائی دینے لگا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ تعلیمی قابلیت اس میں نہیں یکسر جس ... درجے کی زندگی کا وہ عادی ہے اس کو بہتر بنا بھی محال ہے۔ ایف اے پاس تو کلرک ہی بن سکتا ہے، یا پھر بی اے کرنے کے بعد وکیل بننے کی کوشش کرے اور مقدر کے ساتھ اپنے آبائی شہر جہلم میں وکالت کرے۔ شاید باعزت گزراوقات کا ذریعہ نکل آئے۔

دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی۔ برٹش اتحادیوں کی پسپائی اور جاپانیوں اور جرمنوں کی فتوحات کی خبروں سے بھرے ہوئے سرکاری ریڈیو پر ہی کچھ پتا چلتا مگر یوں کہ پسپائی جنگ آمیز اور مایوس کن نظر نہ آئے۔ ضرورت کی چیزیں روز بہ روز مہنگی ہوتی جا رہی تھیں۔ دیہاتی آبادی تیزی سے شہروں کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ روزگار کے نئے مواقع سامنے آ رہے تھے لیکن عام شہریوں کی زندگی پر سوائے گاہ گاہ کے بلیک آؤٹ کی تکلیف کے جنگ کے کوئی خاص اثرات نہ، خوف، گھبراہٹ، بوکھلاہٹ یا بھگدڑ نہ موجود نہیں تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جنگ ہو تو رہی ہے لیکن کسی اور سیارے پر۔ بعض اوقات کسی ناگہانی حادثے کی طرح خبر آتی کہ اسکول کا فلاں پرانا ساتھی برما فرنٹ پر جبار گریسی کی ... مصر کے محاذ پر جرمنوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ ریلوے اسٹیشنوں پر فوجی اسپیشل ٹرینیں دیکھنے میں آتیں۔ ان سے ریلوے کا عملہ مخصوص سلوک روا رکھتا۔ عام لوگ فوجیوں کو دیکھ کر افسوس کرتے کہ پتا نہیں بے چارے زندہ گھر لوٹیں گے بھی یا نہیں۔ فوج میں بھرتی دھڑادھڑ جاری تھی۔ عام گھرانوں کے میٹرک اور ایف اے پاس، بلکہ ... لڑکے بھی فوج میں کمیشن پانے لگے تھے۔ اس کے لیے نہ کسی خصوصی خاندانی بیک گراؤنڈ وغیرہ جیسی شرائط باقی نہ رہی تھیں۔ رمیش کے سینٹ انتھونی اسکول کے کئی ساتھی فوج میں کمیشن پا چکے تھے۔ اس نے بھی عزیز کی دیکھادیکھی درخواست بھیج دی اور باپ کو بعد میں خبر کی۔ انہوں نے دو بار لذت میں سر ہلاتے ہوئے کہا "تم جیسوں کے لیے مناسب پروفیشن ہے۔" عزیز کو ڈیرہ دون ملٹری اکیڈمی سے کال ملی تو رمیش سائیکل دوڑاتا ہوا گھر پہنچا اور سائیکل پر سوار ہو کر دالان میں چلا آیا۔ اس نے کمرے میں کھلنے والے دروازے کے بند کواڑ کو دھڑدھڑ پیٹا اور گدی پر بیٹھے بیٹھے اچک کر دروازے کے قریب لگے ہیٹ اسٹینڈ میں جڑے شیشے میں اپنی صورت دیکھی۔ جو ...

کی مرضی تھی۔ شاید مارک موجود ہیں۔ بکھرے بال۔ اسے پتا تھا کہ ابھی ساڑھے بارہ بجے ہیں اور ان کی بیٹا ڈاکٹر شرما ہسپتال سے ابھی لوٹی نہیں ہوگی۔ بس وہ جتنا چاہے غل غپاڑا کر سکتا ہے۔ [illegible] گھنٹی کا بٹن دبایا اور بانگ لگائی۔ "او رامو کی بچی، دروازہ کھول۔" اندر سے خورشید کی رسیلی آواز [illegible] سے باہر [illegible] پہنچیں [illegible] نکلی۔

پکی ہوئی مٹی کی سوندھ [illegible] کی اس بڑی کوٹھی کے وسیع صحن [illegible] رنگ رنگ گلابوں کی کیاریاں تھیں۔ سرکنڈوں اور ہری مٹی کی سلوں پر گھاس اور ننھے پھول [illegible] کی گرم گرم مہک ہر طرف پھیل رہی تھی۔ اور پھر سڑک سے چند گز کے لیے کھلے [illegible] باہر سنبل کے وسیع پھیلے ہوئے درختوں کی قطار [illegible] سروں سے [illegible] ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ سڑک کے پار کنیئرڈ کالج کے [illegible] پر چند تانگے کھڑے تھے جن کے گھوڑے اور کوچوان سردیوں کی خوشگوار اچھی دھوپ تاپتے ہوئے [illegible] کے انتظار میں اطمینان سے اونگھ رہے تھے۔ سڑک پر ایک مریل سا گھوڑا [illegible] گردن ڈالے [illegible] اور سفید داڑھی والے بوڑھے کوچوان کی چابک کے زور پر [illegible] تانگے کو پل کی ابتدائی چڑھائی پر کھینچے لیے جا رہا تھا۔ اس [illegible] کو گھوڑے کی [illegible] سی کوشش کر رہی [illegible]

[illegible] ہو کر [illegible] تانگے کو [illegible] دیکھا۔ گھوڑے کی ٹپ ٹپ کو [illegible] کرکٹ کے بلے کی طرح [illegible] وہی تانگہ اور وہی گھوڑا اور وہی بڈھا کوچوان [illegible] چند کالج [illegible] انارکلی [illegible] اور واپس گھر [illegible] رمیش کو [illegible] کی زندگی کی [illegible] پر حیرت ہوتی کہ [illegible] کیا ضرورت تھی۔ اس [illegible] قریب ہی مہر کی پکی [illegible] مختلف [illegible] رمیش کو [illegible] کبھی [illegible] شادی کے [illegible] کی خاطر [illegible] توجہ [illegible] کی کوشش کی۔ [illegible] حیرت [illegible] چمک [illegible] چہرے پر رونق پیدا ہو گئی لیکن دوسرے لمحے [illegible] اور [illegible] سی ہو گئی [illegible] مذاق سمجھتے ہوئے فوراً وہیں

چھوڑ دیا اور دوبارہ ایسا کرنے کی جرأت نہ کی۔ لیکن اس کے بعد جب بھی اس سے آمنا سامنا ہوتا تو وہ منہ پھیرنے سے پہلے ایک بار ہلکا سا مسکرا ضرور دیتی۔

شانتی نے دروازہ کھولا۔ اس کے جامنی مسوڑھوں میں ٹھکے ہوئے سفید مضبوط دانت رمیش کو دیکھ کر کھل اٹھے۔

"رامو کہاں مر گیا؟"

وہ جواب میں مسکرائے جا رہی تھی اور رمیش کو ایک بار بھی اس سے آنکھ ملانے کا حوصلہ نہ ہو سکا۔

"تم کہاں تھیں؟"

"میں آپ کا کمرہ جھاڑ پونچھ رہی تھی۔"

اتنے میں رمیش کی ماتا اندر کے برآمدے سے دروازہ کھول کر کمرے میں آئیں۔ وہ سبزی کے چھلکوں سے بھرے ہاتھوں میں چھری پکڑے ہوئے تھیں۔

"رمیش، کیا بات ہے؟ کیوں اتنی تیزی دکھا رہے ہو؟"

"ایک گھنٹے سے چلا رہا ہوں۔ ابھی کوئی دروازہ ہی نہیں کھولتا۔"

"تو دوسرے دروازے سے آ جاتے۔ غصہ تو ہر وقت تمہاری ناک پر دھرا رہتا ہے۔ اب تم اتنی بھی تیزی نہ دکھاؤ۔ جاؤ پہلے سائیکل برآمدے سے ہٹاؤ۔ تمہارے پتا آنے والے ہیں۔ ناراض ہوں گے۔"

"ایک تو یہ اندو کی بچی ہر وقت ریڈیو لگائے رکھتی ہے اور اتنا اونچا جیسے بہری ہو۔"

"چھوڑو اب خواہ مخواہ کی لڑائی نہ چھیڑو۔ بس کی سیٹی سنو۔ آتی ہوتی ہے پہلے سائیکل اٹھاؤ وہاں سے۔"

"میری کوئی چٹھی آئی ہے؟"

"نہیں۔ تمہاری کوئی چٹھی وٹھی نہیں آئی۔"

"ماتاجی، عزیز کو تو آج چٹھی مل گئی ہے کہ فوراً ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون ٹریننگ کے لیے پہنچو۔ ہم دونوں نے اکٹھے انٹرویو دیا تھا۔ حیرانی ہے کہ اسے آ گئی مجھے نہیں آئی۔"

ماتاجی کے چہرے سے خفگی تو اڑ گئی مگر ساتھ ہی رنگ بھی اڑ گیا۔ انہوں نے کھانے کے کمرے میں ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ لگی کرسیوں میں سے ایک کرسی کھینچی اور سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ "او اندو، پرماتما کے لیے ریڈیو بند کر دے اور ادھر آ۔ [illegible] ڈاک [illegible] کی چٹھیاں ہسپتال تمہارے پتا کو بھی پہنچا دیتے ہیں۔ ابھی آئیں گے تو پتا چل جائے گا۔ میرے تو دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ رمیش، فوج میں جانا کیا ضروری ہے؟ تو نے ایف اے پاس کر لیا ہے بی اے پاس کر کے وکالت کر لینا۔ جو لوگ ڈاکٹری پاس نہیں کرتے وہ کیا زندہ نہیں رہتے؟ تیری زندگی ہو ٹھیک رہے۔ جب سے [illegible] گا تو کچھ نہ کچھ کر ہی لے گا۔ ابھی کون سی تیری

Scanned with CamScanner

"اچھا اچھا تو چپ رہ۔ اب بھوجن تھالی میں [illegible] کی [illegible] ہو [illegible] کیا جا سکتا۔ رامو بیٹے اسے کھانا دے دے۔ پھر کوٹھی اور کام کرنے چل دے شاسی۔ شانتی [illegible] پھر اندو سے کہا "چل بیٹی، دیر ہو رہی ہے، جلدی سے کوئی بنا کر رامو کو دے دے۔"

شانتی، جو پہلے ابھی صرف [illegible] پندرہوں تک [illegible] بغیر چھری کے سارے گھر میں [illegible] رہی تھی۔ اب اندو کی [illegible] جگ جگ سے [illegible] ہوا [illegible] کا دوپٹا بدن پر لپیٹے روٹی مانگنے کی شرم سے [illegible] جیسے [illegible] میں [illegible] سے [illegible] پر [illegible] کھڑی تھی۔ رمیش کو آج وہ بڑی معصوم سی بھی لگی، بڑی معصوم اور پیاری لگی۔ رمیش کی [illegible] نظروں کی [illegible] سیدھی جا کر شانتی کے دل پر پڑی۔ اس نے چونک کر رمیش کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں سے جو طلب اور چاہت زندگی میں پہلی بار [illegible] دکھائی دی وہ گویا اس کی باقی عمر کے لیے کافی تھی۔ احساس تشکر اور ایک گونہ خود اعتمادی سے ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ وہ کرتی کو [illegible] دے کر تفاخر کے عالم میں، فرش پر چلتی ہوئی نہیں، ہوا میں اڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ جب تک کمرے سے نکل نہیں گئی اسے اپنے کولہوں پر اس کی نظروں کی سوئیوں کی چبھن محسوس ہوتی رہی۔ [illegible] ہوئی کدرائے ہوئے کولہوں سے [illegible] میں [illegible] لہراتی۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو اسے بار بار بلاتا اور جانے کے لیے کہتا، کسی مہاراجا کی طرح۔ [illegible] کی ہے تو وہ مہاراجا ہی تھا۔ وہ یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار اس کی [illegible] سے متعارف ہو رہا ہو۔ شانتی کو ابھی پتا نہیں چلا تھا کہ رمیش لاہور چھوڑ کر ٹریننگ کے لیے دہرہ دون جا رہا ہے ورنہ اس کی آنکھوں میں [illegible] کی بجائے آنسو بھرے ہوتے۔

ماتاجی کرسی پر اسی طرح افسردہ بیٹھی تھیں۔ رمیش نے کہا "ماتاجی، آپ اتنی دکھی [illegible]"

"تو جگ جگ جیو بیٹا۔ میری زندگی بھی تجھے لگ جائے۔ میں تو یہ سوچتی ہوں کہ اب ہر صبح تو اس بستر سے نہ اٹھے گا نہ ہر رات اس میں سوئے گا۔ میں ہر روز اسی طرح رسوئی بنایا کروں گی مگر کسی کھانے پہ تیرا انتظار نہ ہوا کرے گا۔ پتا نہیں اب میرا [illegible] اور شہروں میں جاتا ہو گا۔ تیرا بیاہ ہو گا، تیرے بچے ہوں گے۔ تیرا اپنا گھر ہو گا جہاں تو ان کے ساتھ مل کر رہا کرے گا اور میرا گھر تیرے گھر سے الگ ہو گا۔ کیوں، یہی چاہتی تھی نا تم اور تیرے پتاجی؟ اب تو کبھی کبھی مہمانوں کی طرح آیا کرے گا اور چند دن رہ کے واپس اپنے گھر چلا جایا کرے گا۔ آج سے ہمارے رستے الگ ہو گئے۔ اب ہم پھر کبھی اس طرح اکٹھے نہیں رہیں گے جیسے آج تک رہتے آئے ہیں۔ اب اگر یہی جیون کی ریت چل پڑی ہے تو کوئی [illegible] نہ چاہے [illegible] پر چلنا ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگیں۔ رمیش نے پیچھے سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور چہرہ ان کے سر پر رکھ دیا۔

بس، عمر ہو گئی ہے۔ میرے ماموں ابھی باپ دادا کے گھر میں رہتے ہیں۔ وکالت کرتے ہیں، [illegible] کانگرس کی سبھا میں، پورے ضلع میں بچہ بچہ انھیں جانتا ہے۔"

[illegible] اس کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے [illegible] خاموش کھڑی ہو گئی۔ ماتاجی نے چھری اس کے سامنے ہوئی میز پر رکھ دی جیسے ہتھیار ڈال رہی ہوں۔ "جا، کوئی بنا کے رامو کو دے دے [illegible] واپس آئیں، سب کچھ [illegible] دیکھنا! کبھی لال مرچ نہ [illegible] صرف کالی مرچ ڈالی ہے، وہ بھی ذرا سی۔" اندو نے چھری اٹھاتے ہوئے آہستگی سے پوچھا "کیا بات ہے ماتاجی؟" رمیش نے ہنستے ہوئے کہا "کچھ نہیں، مجھے شاید ملٹری [illegible] میں [illegible] مل جائے جس [illegible] ہیں۔ میرے سکول [illegible] میں سے بہت [illegible] فوج میں [illegible] مل بھی گیا [illegible] ماشیکل گورنمنٹ۔۔۔ کسی کسی [illegible] کو بھی [illegible] جنگ ہے۔ [illegible] میرے [illegible] کیپٹن [illegible] ہو کر [illegible] سے سفر ہو گا۔ [illegible]

[illegible] کی ارلی فوج کی نوکری کیا کرتی تھی۔ [illegible] والے [illegible] کبھی [illegible] ہوتی ہو [illegible] کو [illegible] کو [illegible] کے [illegible] سے خود گاندھی [illegible] ہوا ہے [illegible] میں [illegible] ہو [illegible] کوئی [illegible] ہو بھی [illegible] سکے [illegible] ہیں۔

[illegible] چھوروں کو [illegible] میں [illegible] کے پوچھا [illegible] کے چہرے پر [illegible] جیسے [illegible] سی [illegible] ماتاجی [illegible] دلا دیں۔

[illegible] صبح [illegible] روٹیاں [illegible] ہے کیا؟ [illegible]

[illegible] ہو [illegible] ہوں، یہ بھی ایک [illegible] پہنچ گئی۔

[illegible] ماتاجی نے کتنی بار کہا ہے کہ [illegible] کھانا دیا کریں۔"

وہ ہاتھ اونچا کر کے اس کے سر پر پھیرتی رہیں۔ رمیش کو پتا نہیں کیوں ایسے موقعوں پر ماضی کی بے اولاد بیوہ یاد آ گئی جسے سب ہی مہابھی کہتے تھے اور جو اسکول میں پڑھ کسی غیرمسرور اور بھولی بسری چیز کی طرح ہسپتال میں سن کے چھوٹے ماضی کے مکان کے ایک کونے کی جھونپڑی سی اندھیر کوٹھری میں پڑی رہتی تھی۔ گھر والا کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ کوئی رشتے دار اگر باہر سے آتا تو پوچھ لیتے ہیں۔ ایک بار ہی مل لیتا اور پھر رخصت ہوتے ہوئے انہیں سلام کرنے کا فرض پورا کرتے جاتا۔ وہ دونوں مرفقوں پر دھانسی دبی جاتیں اور آنسوؤں کی بہتی ہوئی دھاروں کو اپنی گاڑھی کی میلی سی چادر سے پونچھتی جاتیں۔ رمیش کو حیرت ہوتی کہ جب انہیں پتا ہے کہ ملاقاتی ان کا ہمدرد اور بہی خواہ نہیں، محض دکھاوے کی رسم پوری کرنے آیا ہے تو وہ روتی کیوں ہیں۔ اتنی سی کار کا بوجھ سنبھالے ہوئی طور زندگی کو الوداع کہنے کے لیے ماتاجی کو بس اتنی ہی مہلت مل سکی۔ بہوں نے گھر بنانے میں جلدی سے سر پونچھنے اور کھانا بنانے کے لیے اٹھ گئیں

سو پر مصنف کھانے بیٹھ گیا۔ کابیرکے پکنے والے گوشت کی بھی ایک ڈش آج موجود تھی ۔ کو جنت کے نام سے پکارا جاتا۔ دستور کے مطابق صرف مرد اور لڑکے اسے کھا سکتے تھے۔ عورتیں تو اسے ہاتھ لگانا بھی پاپ سمجھتیں۔ اندو ماں کی نہ پر ماتاجی کی نظر بچا کر کچھ نہ کچھ میٹ چکھ لیتی۔ ماتاجی کو پتا چل جاتا تو بہت خفا ہوتیں۔ ڈاکٹر شرما خلاف معمول آج کھانے کی میز پر خوب چہک رہے تھے لیکن یہ تسلیم کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا کہ وہ رمیش کی ملٹری اکیڈمی میں ٹریننگ کے لیے منتخب ہونے پر خوش ہیں۔ مگر رمیش سے ڈیرہ دون اکیڈمی اور فوج کی نوکری وغیرہ کے بارے میں سوالات کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔ اگر کسی سوال کا جواب رمیش سے نہ بن پاتا تو ڈاکٹر شرما اس کا جواب دے لیتے۔ بیٹے کا جوش و جذبہ عراضی سماج بچوں کی مانند پورے ماحول کے مزاج کو مستکن کر رہا تھا

اندو چاہتی تھی کہ سروج جیسی خوبصورت لڑکی کو اپنے کمرے میں کھانا کھلاتے مگر ماتاجی کے کہنے پر اسے سروج کو تو گھر تک پر آنا پڑا۔ سروج مرگ پتلی تیتری جیسی سی لڑکی تھی۔ جب چلتی تو اس کے سرخ گالوں میں بجلی کی طرح بنکنی سی تھرتھراہٹ پیدا ہوتی جو بہت بھلی لگتی اور اس کی معصومیت میں اضافہ کرتی۔ گزشتہ سال میٹرک میں وہ سر گنگارام ہائی اسکول جیل روڈ میں اندو کی کلاس فیلو تھی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اندو نے لاہور کالج فار ویمن جیل روڈ میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا اور سروج کے باپ نے جو میونسپل سیکریٹریٹ میں اپر ڈویژن کلرک تھا اسے گھر بٹھا دیا اور ایک چالیس سالہ رنڈوے ٹھیکیدار سے اس کی منگنی کر دی۔ وہ کرشن نگر میں اپنے چھ سات بہن بھائیوں اور ماں باپ کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی جس کی زمین کی قیمت آدھی ہو کر چوتھائی رہ گئی تھی کیونکہ جنگ کی وجہ سے قیمتوں میں جو ایک دم اضافہ ہو گیا بچوں

کے لیے تکمیل ممکن نہ رہی۔ یہ مکان جو باہر سے کھنڈر نظر آتا تھا اس کے باپ کی ساری عمر کی کمائی کا ثمر تھا۔ پہلے تو وہ محلے کی لڑکیوں سے بھرے تانگے میں سکول آتی جاتی رہی۔ جب میٹرک میں پہنچی تو اس کے باپ نے سائیکل خرید دی۔

اندو کی بہت سی سہیلیاں تھیں۔ کچھ اس کے ساتھ کونونٹ میں پڑھتی رہی تھیں۔ کچھ اڑوس پڑوس کی لڑکیاں تھیں۔ سب ہی امیر گھرانوں سے تھیں اور تیری طرح کے علاوہ خوداعتمادی بھی رکھتی تھیں۔ رمیش کی فلرٹیشی کو کسی نے فلرٹیشی سے زیادہ کبھی کچھ نہ سمجھا اور ہنسی ہنسی میں وہ اسے باتوں میں اڑا دیتی تھیں۔ وہ ان سے دبتا تھا۔ البتہ سروج غریب طبیعت اور حجبو تھی۔ اس کے پیغام محبت کو سنجیدگی سے لے بیٹھی۔ پھر اسے شاید ایسے پریمی پینگ کشمیری پوسی ہونے کا گمان تھا۔ سمجھی کیا خبر بات لگی مدت تک جا پہنچے۔ دو بار وہ اپنی ہمت اور حوصلے کی آخری رمق تک کو بروئے کار لا کر اکیلی لارنس گارڈن کے تنہا گوشوں میں اس سے ملنے آئی۔ ایک دوپہر وہ اس کے ساتھ لارنس گارڈن کی ایک سُونی پہاڑی کے اوپر بھی گئی جہاں سے رمیش نہ پہلی بار ہونٹوں پر چوما۔ اسے کسی لذت، لطف یا دیرینہ پیاس کے بجھنے کا کوئی احساس نہ ہوا۔ الٹے خوف، گھبراہٹ اور گناہ کے احساسات کے درمیان اس کے سینے سے لگ کر ایک اچھنے تحفظ کا احساس ذہن میں ابھرنے ہی پھر سے کہیں غائب ہو گیا۔ رمیش کو محض بدنی تصوروں کی سنگینی اور سینہ کچھ جلد کر گزرنے پر وحشیانہ اصرار تھا، اور ادھر سروج محبت میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہر مشکل اور کٹھنائی سے لڑ مرنے کے تصورات میں گم تھی۔ ان کے مابین ان ملاقاتوں میں مفاہمت کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ اس کے بعد رمیش کئی بار کرشن نگر کی کچی گلیوں میں گندی نالیاں پھلانگتے اس کے گھر اندو کا پیغام پہنچانے کے بہانے گیا اور اسے ہجر و فراق کے دکھوں سے بھرے خط دے آیا۔ کئی بار سائیکل پر پیچھا کرتے ہوئے اسے راہ میں ملا، مگر وہ بس اتنا ہی کہتی، "آپ جیسی کوئی لڑکی ڈھونڈیے۔ میں آپ کے قابل نہیں۔" وہ چند دنوں میں سروج کی ضد کے سامنے اپنی چاہت کی ہر بھول بھال گیا لیکن اب بھی کبھی اس سے آمنا سامنا ہو جاتا تو سوال وصل کرنا نہ بھولتا اور وہ بھوری کو ٹالنے والی مسکراہٹ مسکرا کر چل دیتی۔

تانگے والے نے پوچھا، "صاحب میکلوڈ تو ختم ہو رہی ہے اب کدھر چلنا ہے؟"

"ہاں، اچھا ریگل چوک کی طرف چلو۔"

چوک میں واقع ڈاکٹر پیر محمد خان کی نئی طرزتعمیر کے مطابق بنی کوٹھی کے سامنے سے تانگا بائیں طرف مڑتا ہو ذرا سی کھائی اتر کر مال روڈ پر چل پڑا۔ اندھیرا، خاموشی اور گیلی سڑک پر سست قدم گھوڑے کی ہلکی ہلکی ٹپ ٹپ وقفے وقفے سے یک تال کی صورت میں آ رہی تھی۔ اسکول کا مال روڈ پر کھلنے والا دروازہ گھنے درختوں میں گھرا، تاریکی میں دھنسا ہو تھا۔ اس کے سامنے لاہور کالج فار ویمن کا دروازہ تھا۔اس کے چھوٹے

Scanned with CamScanner

بوڑھے مدن کو اس اسکول میں داخل کرایا گیا تھا کیونکہ اس کی ماں سمجھتی تھی کہ ویسٹن کی ملازمت رہ جانے میں سینٹ انتھونی اسکول بھی برابر کا قصوروار ہے۔ خوبصورت مکان مسلسل سے گھورتے بارش میں بھیگ رہے تھے۔ کہیں کہیں کوئی روشنی کھڑکی سے باہر [illegible] دور تک دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوتی۔ کبھی بجلی پر سوار گھات سڑک کے دائیں بائیں نکل کر اندھیرے میں کہیں چلی جا رہی تھی۔ ان مکانوں میں لوگ اپنے مکانوں میں کیسے گرم بستروں کی سانس میں تو لے دبکے ہوں گے۔ [illegible] بستر چھوڑے نہیں۔ سامنے چند [illegible] کی چرچ پر مینار [illegible] بارش بند ہونے کے باوجود ڈھلان میں وائی ایم سی اے ہال روڈ پر اس [illegible] سامنے ریگل چوک کی روشنیوں میں چمک رہا تھا۔ ریگل کو جانے والی گلی کے [illegible] روشنی [illegible] "ٹاور بوم" ٹک ٹک [illegible] جس میں [illegible] "انگریزی ترکیبوں" کی منتظر [illegible] کی بہت بڑی دکان کا بورڈ [illegible] گھر میں سو رہے ہوں گے۔ [illegible] ہال روڈ اور لارنس روڈ [illegible] وہ مسروحی سے گھبرا کر سیاہ [illegible] عمارتیں [illegible] بولا "صاحب! یہ قصور چلوں؟"

"دیکھو تم مجھے جیل روڈ پر ریس کلب کے قریب چھوڑ دو۔"

[illegible] صاحب اس قدر [illegible] کوئی سواری بھی نہیں ملے گی۔

[illegible] واپسی کے لئے [illegible]

بہت صاحب، موسم خراب ہے اور گھر دور ہے میں [illegible] جانور صبح سے جتا ہے [illegible] اور تانگا مل جائے گا۔

[illegible] لارنس روڈ پر ہی [illegible] کوئینز روڈ کے چوک پر چھوڑ دینا۔ ساتھ ہی [illegible] وہاں سے تانگا مل جائے گا۔

وہ [illegible] کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ جیسے ہی ہو گیا کہ [illegible] تو وہ [illegible] پر مجبور ہو [illegible] وہ بچپن [illegible] وہ سال بسال اس سے ملحق اسکول میں پڑھنے کے لئے ہر روز آتا رہا تھا۔ [illegible] ایک بڑی سی [illegible] اونچی عمارت نظر آتی رہی جس کا [illegible] جیسی اسے نظر آ رہا [illegible] کھینچ کر چھوڑ دیا۔ کھمبے کی روشنی میں فر

سی بھاپ ہوا میں اڑ کر غائب ہو گئی۔ اس نے سیکرڈ ہارٹ کیتھیڈرل کی پرہیبت عمارت کے آگے سر جھکا کر سینے پر کراس کا نشان بنایا کہ خداوند علیم کی رضا سے ہی [illegible] کے بیچ ایک ڈھنگ اس کے ذہن میں باقی تھا۔ پھر تانگے کی سیٹ پر بیٹھ کر بولا "چلو۔" وہ اسی اسکول کے آگے سے اسی سحر میں مبتلا گزر گیا۔ اسے یہ مجبوری اور احساس یہی یاد ہے سے کوئینز روڈ کے چوک پر آ کر تانگا رک گیا۔ بارش تھم گئی تھی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر بادل ایک بڑے سے روشن دھبے کے آگے مشرق کی سمت تیزی سے دوڑے جا رہے تھے۔ اس نے بائیں طرف دیکھا۔ پلازا کے سامنے کوئی تانگہ نہیں تھا۔ غالباً شو ختم ہو چکا تھا۔ اس نے تانگے والے کو پانچ روپے کا نوٹ دیا۔ اس نے پہلے تو نوٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اسے زندگی کی دعا دی۔ اس نے [illegible] بند کیے۔ چھوٹا سا [illegible] ہاتھ میں پکڑی [illegible] مسافت پیدل طے کرنے کی [illegible] محسوس ہو رہا تھا کہ جب وہ لاہور پہنچا تو لاہور خراب موسم کی وجہ جلد سو گیا تھا۔ اس نے سوچا لاہور بھی عجیب سی موجی شہر ہے۔ پہچاننے پر آئے تو سوتے میں کسی اجنبی کو پہچان لے [illegible] اور نہ پہچانے تو برسوں سے چاہنے والے [illegible] کو جاگتی آنکھ میں [illegible] دے۔

وہ لارنس روڈ پر پیدل آگے بڑھا تو بائیں ہاتھ خوبصورت عمارت تھی جس میں کبھی ایک انگریز خاندان رہا کرتا تھا۔ شاید اب بھی رہتا ہو۔ اس نے ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں میں جب سائیکل پر اکیلے ٹیوٹر کے گھر جانا شروع کیا تو وہ ہر صبح اس عمارت کے سامنے پہنچ کر کئی کئی منٹوں تک کھڑا پانچ فٹ اونچی چاردیواری کے اندر عمارت کے سامنے والے بڑے کھلے صحن میں ایک انگریز بچی کو گھڑسواری کی مشق کرتے دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھی [illegible] چھوٹے گھوڑے پر ننھی بچی کے کمر تک لمبے، بھورے سنہری بال [illegible] رہے اسے بہت خوبصورت لگتے۔ اس کے بھولے بھالے چہرے پر ہمیشہ کچھ تاثرات [illegible] رہ گئے تھے۔ کچھ شوق اور کچھ خوف کے علاوہ بہت سی بے بسی وہاں پھیلی ہوتی کہ آیا وہ ٹرینر کے معیار پر پوری اتر رہی ہے یا نہیں۔ بچی کی نظر ہر لمحے کسی کونے میں کھڑے ٹرینر پر بار بار پلٹ کر جاتی۔ ٹرینر کی انگریزی میں دل دہلا دینے والی ہدایات کبھی اونچی اور کبھی نیچی آواز میں مسلسل آتی رہتیں مگر اس کی صورت ریسٹن کو کبھی نظر نہ آ سکی [illegible] سمجھ میں آ سکا کہ وہ کب کیا رہا ہے۔ لیکن ٹرینر کی آواز میں جو تحکمانہ [illegible] سے وہ محسوس کرتا اس سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ لڑکی کا باپ ہو گا۔ گھوڑا جب [illegible] کر سواری چھوڑتا ہوا اس کے سامنے سے گزرتا تو اس کی سیاہ [illegible] اور ماتھے پر پھیلا [illegible] ریسٹن بعض اوقات گھڑسواری کی مشق دیکھنے میں ایسا ڈوب جاتا کہ اسے ٹیوٹر کے پاس پہنچنے میں دیر ہو جاتی۔ وہ چاہتا تھا کہ کبھی سنہری بالوں والی لڑکی بھی اسے فٹ پاتھ پر کھڑے نظارہ کرتے دیکھے۔ لیکن وہ اپنے ٹرینر کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش میں اس قدر منہمک ہوتی کہ کبھی اس کی طرف آنکھ

بچا کر نہ دیکھ سکی۔ رمیش کو موقعات سے محروم بھی، ان سب موقعات سے جو دوسرے اب
کو یہی سمجھ کر جو معیار پر پورا اترنے جیسے کے لیے ترسے ہیں۔ اس کا جی چاہتا کہ ننھی
لیو ر کی ساتھ کھڑے سمبل کے بھاری بھرکم درخت سے ایک چھڑی کھینچ کر توڑے، بھنبھوڑ
بند ہونے والی اس پھاٹک کی پٹ کھولے، اندر جا کر سرسبز میں چار چھڑیاں اس ٹریسر پر
برسائے اور تبھی لے بند کر دے توقعات کا کاروبار۔

آج وہ خوبصورت لڑکی پتا نہیں کہاں ہو گی۔ اب تو وہ ایک عورت بن چکی ہو گی۔
ایک حسین عورت سنہری بالوں اور گلابی ہونٹوں والی عورت۔ مجھے تو بھلا وہ کیا پہچانے
گی میں بھی اسے پہچان سکوں گا یا نہیں؟ کب وہ گھوڑسوار بن سکی ہو [illegible] موقعات
موقعات پکڑتا رہ رہمی چلا گیا؟ اس نے دیوار کے اوپر سے اندر نظر ڈالی کہ شاید آج بھی وہ
لڑکی اس صحن میں اپنے سنہری بال اڑاتی کالے گھوڑے کو دوڑا رہی ہو گی۔ وہاں اسے صرف
[illegible] کا ہیولا سا کہیں نظر آیا باقی اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

بائیں ہاتھ پر چڑیاگھر کی فصیل شروع ہو گئی اور دائیں ہاتھ پر نیم دائرہ بناتی
ہوئی ایک چھوٹی سی جیسی روڈ نامی سڑک بڑے بڑے [illegible] اور اونچی
اونچی جھاڑیوں اور درختوں سے گھنے [illegible] گورنمنٹ طرزتعمیر کی بڑی
بڑی کوٹھیوں کی چاردیواریوں کے بیچوں بیچ [illegible] ہوئی۔ جہاں گنگارام ہسپتال [illegible]
ہے وہاں یہ [illegible] روڈ کو کاٹتی ہوئی ذرا سا بل کھا کر مختصر لائنوں والی [illegible] چھوٹی
کوٹھیوں کے حصار میں جا گھسے گی جو [illegible] اور ہر زاویہ قائمہ ہے، اور
پھر اس بستی میں گھومتی پھرتی [illegible] لارنس روڈ پر آ نکلے گی۔ [illegible] کی کوٹھی بھی اسی
بستی میں تھی۔ دائیں ہاتھ پر ڈاکٹر [illegible] داس کی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر اس نے پتا
نہیں کیوں [illegible] کی دوسری کوٹھی کو [illegible] کی ناکام کوشش کی۔ اگر
[illegible] سے وہ کوٹھی کیونکر نظر آ سکتی تھی؟ بائیں ہاتھ پر چڑیاگھر کی
[illegible] درختوں کی ایک [illegible]
[illegible] لیکن اس کے پاس بلکی پھوار تلے لیمپ جیسی چھاؤں لگتی اور کبھی پھر سے
خاموش ہو جاتے اس [illegible] پتا نہیں جنگل کے کون کون ارادہ رو چرندے اور
پرندے [illegible] توقعات کی تکمیل کے لیے [illegible] لارنس باغ کا دروازہ
گیا۔ [illegible] کیونکہ [illegible] جاتے ہوئے یہاں پہنچنے پر پہلی بار [illegible]
[illegible] کا مخروطی مینار ایک دم اس کے سامنے نمودار ہوتا اور [illegible] میں ڈوبتا ہوا
دکھائی دیتا۔ [illegible] کیونکہ اس کا مطلب ہوتا تھا کہ کوئی دم
میں [illegible] اس کی منزل میں واقع [illegible] پہنچ جائے گا جہاں اس کی [illegible] کی طرح بات
بات پر [illegible] ہو گی۔ [illegible] اس کے لیے بھی اور [illegible] جا سکتا اس کے لیے بھی
[illegible] جب اسے [illegible] کی ضرورت [illegible] تو وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ پوری سڑک پر

صرف ایک دو کھمبے روشن تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اندھیرے میں سڑک کی روشنی جسے
بارش کی پانی کی [illegible] سے اس مختصر مہلت میں جھٹ پٹ کچھ دیکھ چاہ رہی
ہوں، لیکن کیا کیا جائے، آج اتنکھ ملی تو سب کچھ اندھیرے میں لت پت ہو کر رہ گیا۔
لارنس باغ کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر جاتی ہوئی سڑک پر دور تک کھمبے روشن تھے مگر
[illegible] جیسی باہر والی سڑک پر [illegible] درختوں پر [illegible]
پرکھوں جیسے رکھ کھڑے تھے جن کے سیاہ ہوئے [illegible] روشنی [illegible]
والی، [illegible] کی سبز شاخیں اس وقت بالکل سیاہ رنگت اختیار کیے ہوئے تھیں اور
[illegible] کی طرح تنگ رہی تھیں یوں خاموش بارش میں کھڑے بھیگتے وہ بہت بے بس
نظر [illegible] کے جیسے مرضی کے خلاف زندہ رہنے پر مجبور ہوں۔ درختوں کی [illegible]
اتنی گہری تھی کہ انہیں دیکھ کر رمیش پر بھی اداسی چھانے لگی اور اسے یہی لاہور پہنچنے
کی خوشی کو برقرار رکھنے کے لیے [illegible] لینی پڑی۔ [illegible] رمیش کی
بائیں طرف مصنوعی پہاڑی تھی جو [illegible] درختوں اور سبزے [illegible] سکی مگر
تب اس کی اونچ نیچ کو اس نے پتا نہیں کتنی بار دوستوں کے ساتھ ناپا تھا۔ انکھ مچولی
کھیلی تھی پرندوں کا غلیل سے شکار کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک گرمیوں کی چھٹیوں
میں [illegible] بندوق [illegible] لارنس کی پہاڑیوں پر پرندوں کے شکار
کرنے کی کوشش میں مارے مارے پھرتے رہے اور [illegible] کو ایک کبوتر انہیں نصیب ہو۔ کبھی
والی [illegible] کے بارے میں فکرمند رہے کہ کہاں گم ہو گئے۔ [illegible] جو ہوئی تھی سو
ہوئی مگر شام ہوتے ہوتے دونوں کو سر بخار ہو گیا۔ رمیش [illegible] کو پکا یقین ہے کہ
[illegible] کا کاری ہوا ہے جب کہ ڈاکٹر [illegible] کہتے تھے کہ لو لگنے سے ہوا ہے۔

لارنس کے دوسرے دروازے کے سامنے پہنچ کر اس نے چلتے چلتے اندر نظر دوڑائی
پورے باغ کی چوڑائی ختم ہونے پر مال روڈ کے کنارے واقع لارنس ہال [illegible] اندھیرے میں
کچھ دکھائی دیتا۔ اس جنگل [illegible] دور کی کہکشاں میں جھلملاتے ننھے سے ستارے کی
مانند ایک روشنی بھی کبھی نظر آتا کبھی غائب ہو جاتا۔ چند قدم آگے لارنس روڈ ریس
کورس روڈ میں جا ملتی ہے۔ [illegible] پہنچ کر وہ [illegible] سڑک کی [illegible] نے پوری
پوری لگتا تھا جب سے دنیا بنی اس وقت سے لے کر آج تک [illegible] چلی آئی ہیں۔ اردو اور
انگریزی میں لکھے لمبے لمبے بورڈوں کے ساتھ ساتھ گولائی میں دائیں طرف گھومتا ہو
سڑک پر لگے ارجن اور سمبل کے بڑے بڑے چکداری درختوں کی اونچی محراب کے نیچے
نیچے چھوٹی سی سڑک پر تیز تیز چلنے لگا۔ اس کے اندر کہیں جلد پہنچنے کا احساس تھی
میں جاگا تھا۔ ایک میل بھر لگاتار چلتے رہنے سے اس کا بدن گرم ہو کر خودبخود بھڑکے
ہوئے گھوڑے کی طرح خودمختار ہو گیا تھا۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے لاہور سے
اور ان سب یادوں سے جن کے مجموعے سے اس کا اپنا ایک خاص لاہور بنتا تھا کلی مل رہا

ہوۓ اس کے اندر ہیجانی رولیں برق رفتاری سے چل رہی تھیں اور ان کے باعث اس کے اعصاب تنے ہوۓ تھے، اسے مبہم سے انداز میں لگتا جیسے ابھی کوئی بہت عمدہ، اچھی اور دل پذیر سی بات ایک دھماکے سے واقع ہو کر اس کی زندگی کو دائمی مسرتوں سے بھر دے گی۔ وہ خوش تو تھا لیکن اس کی خوشیوں کے ساتھ ساتھ کسی انجانے خوف کا سایہ بھی چل رہا تھا۔ کبھی اسے لگتا جیسے ابھی کہیں سے کوئی جانکاہ خبر پہنچے گی اور سب ختم ہو جائے گا۔ لاہور سے بھکر ہونے کا اس کی سڑکوں پر چلتے رہنے کے سوا اور کوئی طریقہ نہ تھا، اور اس شوق کی تکمیل کے لیے اسے صرف کل شام تک کی مہلت ملی۔ اتنا لمبا فراق اور اتنا مختصر وصال! کل غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی گاڑی اسے لاہور سے لے کر کلکتے روانہ ہو جائے گی۔ وہاں سے شاید برما جانا ہو اور کون جانے وہاں سے کدھر جانے اور کب واپسی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ واپسی کبھی نہ ہو۔ یہاں صرف خبر ہی پہنچے کہ میدانِ جنگ میں کام آیا۔ لاہور کی تو [illegible] سکے۔ لیکن نہیں جو کسی کی موت پر رو سکے۔ یہ تو یوں ہی [illegible] میں چلتے رہنے والا شہر، مست متوالا ہے جو وقت کی طرح سدا جاری ہے۔ ہر روز [illegible] سے [illegible] چلا آ رہا ہے اور سدا [illegible] کب کسی کا ماتم کرتا ہے۔ اس طرح سے وہ [illegible] سے چلتا ہوا پُراعتماد [illegible] شخص [illegible] تک کانپ اٹھا۔ وہ سڑک سے اتر کر ایک پیپل کے درخت کے تنے کی طرف بڑھا، اسے دونوں ہاتھوں سے [illegible] پھر جھک کر اس کی جڑوں میں سے انگلیوں سے مٹھی بھر مٹی نکال کر

[illegible]

[illegible] کا جھونکا اٹھا۔ درختوں کے پتوں پر جمع پانی یک دم سڑک پر برس پڑا۔ افسردگی مترشح کرتی ہوئی موت کی پرچھائیں آگے گزر گئی۔ وہ گانے لگا۔ چل چل رے نوجوان۔ مدھوک دھیر میں [illegible] کہ یوں سڑک پر اونچی آواز میں گانا [illegible] کے خلاف ہے، سو پھر خاموش ہو گیا۔

سامنے جیل روڈ کے پار، سڑک سے کچھ دور پیچھے ہٹ کر جیل کی بلند و بالا پیلی ڈیوڑھی کھڑی تھی جو درختوں کے جھنڈ میں گھری، اندھیری رات میں اٹھی ہی کالی تھی جس کے لیے کا لوہے کا [illegible] اونچا بند سیاہ پھاٹک تھا۔ پھاٹک میں ایک چھوٹی کھڑکی تھی جس میں سے ہو جانے [illegible] جھک کر گزرے۔ اس وقت وہ بھی سختی سے بند تھی۔ پھاٹک کے اوپر ڈیوڑھی کی چوڑائی جتنی لمبی سنگ مرمر کی تختی تھی جس کے اوپر موٹے سیاہ انگریزی حروف میں "سنٹرل جیل لاہور" لکھا تھا۔ اس کے نیچے ایک بلب روشن تھا جس سے پھاٹک نظر آ رہا تھا لیکن روشنی زیادہ تر چھوٹی کھڑکی پر مرکوز تھی۔ ڈیوڑھی کی ایک طرف [illegible] لنگوں کا [illegible] تھا جس کے درمیان میں کانسی کا موٹا تھال لٹک رہا تھا۔ ہر [illegible] کے بعد سپاہی کھڑکی کھول کر نکلتا اور اس پر ضرب لگاتا تاکہ قیدی [illegible] گنتی کے حساب سے ہی رہائی کے وقت کا شمار رکھ سکیں۔ دماغوں کے قریب

ایک سپاہی ہر وقت اسی پنجرے الٹی شی کھڑا رہتا اور وقفے وقفے سے ڈیوڑھی کے سامنے مارچ کرتا ہوا ایک دو چکر لگا کر پھر اپنی جگہ پر آ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس وقت بھی ایک سپاہی معمول کے مطابق خاکی پگڑی سر پر رکھے، رمش جیسی مرمندی اور پٹیاں پہنے ساتھ سا بناۓ رائفل سنبھالے اس جگہ الٹی شی کھڑا تھا۔ رمیش نے اپنی سرکاری وردی کی پراندی، پگڑی، جوتوں پر نظر ڈالی۔ ایک واضح مشابہت ابھر کر اس کے سامنے آئی۔ یوں لگا جیسے وہ سپاہی وہ خود ہے جو رائفل سنبھالے قیدی بھگوڑوں کو اسیر بند کر کے چالیس روپے ماہوار کے عوض ان پر پہرا دے رہا ہے۔ گھبرا کر کبھی، اسے یوں لگا جیسے بیس سال پہلے پھانسی پا جانے والے بھگت سنگھ، راج گرو اور سرخ گلابوں کے ہار پہنے قیدیوں جیسے گھٹنوں تک پہنچی نیکروں اور کمر تک آتی کرتیوں میں ملبوس (جو ہر سہا بکتروں سے بڑے بڑے حاشیے ہوئے ہیں) ننگے پاؤں پھنسے ہوئے کھڑکی سے یک ٹک دیکھ رہے ہیں۔ ہر طرف کالے کالے انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہجوم پھیلا تھا جو انقلاب زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا، جس میں ایک طرف ریس کورس روڈ کے آخری سرے پر مال روڈ کے کنارے بسے ہوئے گورنر ہاؤس اور دوسری طرف [illegible] اور [illegible] ردگرد کی سڑکوں پر واقع بنگلے۔ جن کا سرورندگی [illegible] میں سلطنت برطانیہ کی عظمت کو بہت وقتی سراج کی انانیت کا ایک انداز تھا۔ بدل کر وہ گئے۔ خاکی پراندے والے سپاہی نے رائفل اٹھا کر جیب سے سیدھی کی۔ ٹھاٹھیں، قیدیوں بھستے ہوئے چہرے منہ کے بل لوٹ کر اندھیری سیاہ زمین میں جذب ہو گئے۔ اژدہام ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ ایک سپاہی گھنٹی پر ایک ضرب لگا کر کھڑکی کے اندر واپس داخل ہو رہا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ کا گجر بجا تھا۔ ٹھنڈی تیز ہوا اس کی پراندی میں گھس آنے پر اصرار کر رہی تھی۔ کالے بادل گم ہو گئے تھے اور ان کی جگہ ہلکے سرمئی بادل تیزی سے کبھی [illegible] رہے تھے۔ چاند شریر بچے کی طرح بادلوں میں منہ [illegible] میں چھپا ہوا تھا۔ پردوں میں چھپی اس کی کھلکھلاہٹ غور سے دیکھنے پر صرف نظر ہی نہیں آتی تھی بلکہ سنائی بھی دیتی تھی۔ تب شرمائی شرمائی چاندنی پھیلنے لگی تھی۔ ریس کورس روڈ اور جیل روڈ کے سنگم پر، چوک کے دائیں ہاتھ پر کسی مخیر نے قیدیوں کے ملاقاتیوں کی سہولت کے لیے ہینڈپمپ لگوایا ہوا تھا۔ دودھ دہی کی ایک [illegible] سی دوکان تھی جو اس وقت بند تھی۔ کوئی بھی بارہ مربع گز سرکاری رقبے کسی نے لیپ کر اس کے ردگرد ایک ایک کھڑی پست بنسب کر کے حدبندی کرتے ہوۓ نماز کے لیے ایک مخصوص جگہ بنا دی تھی جہاں کبھی کبھی کوئی مسلمان ملاقاتی نماز پڑھتا ہوا نظر آ جاتا۔ دائیں طرف جیل روڈ پر کوئی سو گز چلنے پر سر گنگارام ہائی اسکول کا گراؤنڈ تھا جہاں اندر اور سورج [illegible] پڑھا کرتی تھیں۔ تھوڑی دیر میں صبح کے دو بجیں گے تو ہر طرف سے گہرے نیلی قمیص ورسیہ شلوار دوپٹہ میں پہنی ننگی پاؤں میں [illegible] ہر عمر کی لڑکیاں

Scanned with CamScanner

ستون کے بوجھ سنبھالے ہوئے در جوق کھڑا ہی گھوم ... جلدی جلدی چلنا پہنچ شروع ہو جاتیں گی۔ وہ چوک میں آ کر بائیں طرف مڑ گیا۔ سڑک نیم دائرے میں جیل کے گرد گھومتی چلی گئی تھی۔ اب اس کی دائیں جانب ہو، سڑک کے متوازی، گھاس کا کھلا میدان تھا، اس کے بعد سرخ اینٹوں سے بنے، جیل کے افسران کے بنگلے قطار میں کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے جیل کی کوئی بیس فٹ اونچی کچی دیوار چل رہی تھی، جس کی مرمت اور لپائی وغیرہ خود قیدی ہی ہیں سرانجام دیا کر رہے ہوں جس سے صورت حال عجیب مضحکہ خیز اور ساتھ ہی اداس سی نظر آتی۔ لگتا جیسے کوئی سر پر اپنی سواری کندھے پر لادے مصروف سفر ہو۔ پوری انسانی زندگی شاید اسی طرح کی ہے وہ اب ذرا اور تیز چلنے لگا۔اس کے بائیں ہاتھ پر بڑے بڑے لانوں والے پرانی وضع کے بنگلوں کی قطار چل رہی تھی۔ ہر ایک میں، آباد ہونے کا بھرم رکھنے کو ایک آدھ بلب ادھر اُدھر روشن تھا۔ ان بنگلوں کی پشت پر گھڑدوڑ کا وسیع میدان تھا جو [illegible] اسٹینڈ بلکہ بہشت کے کناروں تک پہنچتا تھا جہاں کسی دورِ سواری سے اتری ہوئی مخلوق اس پوری پاکیزہ ماحول کی مہک محسوس کرتی۔ [illegible] پنجاب کے تیز مہ‌دوروں اور ملاحت میں کنلائی کرروں جیسے ستاروں کی شعاعوں پر منعکس کرتی۔ اس میں بسنے والے ہندوستانی خاندانوں کے کرداروں میں بھی سکریپ‌سی ہی یوں ڈوبتا ہو جھلکتا جیسے بھرے تالاب کی مشترک سطح پر کسی چیز کا عکس بھری ہوئی لہروں کے بطون میں ابھر کر ٹیڑھا میڑھا ہوتا ہوا قطعی غیر حقیقی اور بے‌سیاہ نظر آتا ہے۔

ایک روز اس کے باپ نے اسے بتایا تھا "جیل کی یہ دیوار کو مٹی کی کھمبا سی کچی دیوار نہ سمجھو۔ یہ کیے پیچھے انگریز نے ہندوستان کا مستقبل قید کر رکھا ہے۔ قاتل اور ڈاکو تو سے کیڑ گرے کے لیے محض ایک بہانہ ہیں۔ اس کا اصل کام تو کچھ اور ہے سیاسی حقوق مانگنے والوں کو عبرت ناک بنانا، یہ ایک خوفناک مشین ہے جو غلامی کو دائمی بنانے کے لیے ان غلاموں کے خلاف استعمال کرتے آئے ہیں۔ یہ نہ سمجھنا جیل کی اپنی مخصوص دنیا ہے جو ہماری دنیا سے مختلف ہو گئی ہیں۔ کہیں زیادہ ظالمانہ بھی ہے۔ پھانسی کی کوٹھڑیاں ہیں۔ تنہائی کی کوٹھڑیاں ہیں، مشقت ہے، کوڑے ہیں۔ دشمنیاں ہیں، دوستیاں ہیں، مخبریاں ہیں۔ کمینگیاں ہیں۔ نشے ہیں، لذتیں ہیں، پکے مجرم ہیں، اور ہر کا محض مشق بنے والے معصوم و مجبور ناکردہ گناہ دوسرے قیدی ہیں۔ یہاں ظلم ہے، جبر ہے تشدد ہے، ملی بھگت ہے، بلیک میلنگ ہے۔ غرض ہر صفت اپنی بدترین اور ظالم ترین شکل میں یہاں موجود ہے۔ محض ہمدردی طور جیسی سلوک وہ سب علاالعام جیل سے انسانیت عبارت ہے اس کو یہاں کرنے میں سمجھنا۔ بقا کی یہ جدوجہد اپنی ننگی اور بدترین صورت میں یہاں نظر آتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ رمیش نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ان کی صورت سختی سے محسوس ہوئے تھے اور ایک بنائی کی کڑواہٹ ان کے

چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ ان بظاہر سرد مہر، کم گو اور دوسروں سے اپنے معیار کے مطابق اعلا کارکردگی کا سختی سے متقاضی شخص اندر سے اتنا سخت نہ تھا جتنا اس کا خیال تھا۔ اس کو پتا ہے اسے پتا کہ آزادی کیا چیز ہوتی ہے۔ گاندھی، نہرو سبھاش اس کو بے کس طرح بے‌غرض ہو رہے ہیں۔ وہ جبر کا سامنا نہ کر پاتا تھا۔ ان کے دل میں اس کے خلاف شدید نفرت تھی۔ اس لیے اسے ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنے والے لوگ اچھے لگنے لگے۔ اسے گاندھی اور نہرو کی نسبت سبھاش زیادہ پسند تھا کیونکہ وہ جبر کے خلاف ٹکرا جانے کا درس دیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود آج تک، باپ کی پابندیوں سے لے کر ملازمت کی بندشوں کے جبر تک، سب کچھ سہتا رہا تھا اور ٹکرانے کا حوصلہ اپنے میں پیدا نہ کر سکا تھا۔

اب اس کے بائیں ہاتھ پر منعم چھندی ہی کا جج بیس کی مقدمتاً لگی، دو منزلہ سفید عمارت نمایاں طور پر چمک رہی تھی۔ یہ اسے بہت پسند تھی۔ ادھیڑ عمر عورتوں جیسے پھیلے ہوئے بھرے بھرکم جسموں والی برس کرتیوں کے درمیان یہ سکھی ہوئی ہی کاسے جیسے تیز زاویوں اور چوڑے سے بنی سفید نقش و نگار کے باعث یہ عمارت ایک سرو قد سمارٹ لڑکی کی طرح کھری دکھائی دیتی جس سے پرانی وضع کے چاندنی کے گہنے پہنے ہوئے ہوں۔ وہ سوچتا کہ جب کبھی اس کے ہاتھ پیسا لگا تو وہیں کے لیے بالکل ایسا ہی بنگلا تعمیر کرائے گا۔ اس سے آگے ریس کلب کا دروازہ تھا جس کے اندر اس نے جھانک کر تو بارہا دیکھا تھا مگر اسے عبور کبھی نہ کیا تھا۔ دروازے کے بالمقابل اور سڑک کے پار میدان تھا جس میں گھڑدوڑ کے دن تانگوں کا ایک ہجوم لگ جاتا، اور جو غروب آفتاب کے ساتھ ہی خالی ہو جاتا۔ وہ جیل روڈ ایک بار پھر سنسان ہو جاتی۔ سامنے ذرا فاصلے پر دائیں جانب زنانہ پاگل خانے کی دوسری عمارت کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ اوپر کی منزل پر کمروں کے سامنے بنا برآمدہ یہاں سے نظر آ رہا تھا جس کو لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگا کر بند کرنے کی کوشش میں جانوروں کے پنجرے کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس سرد بھیگی رات کے سناٹے میں، جو ابھی سے زیادہ گہرا چکا تھی وہاں قفس کی چیخ جیسی زنانہ آواز ابھری:

بکھیاں نت قدر ہوسی

اوس ویلے آ ملسو جدوں گئی تیار ہوسی

وہ ٹھٹھک کر لمبی قدموں پر رک گیا۔ نسوانی آواز نے یہی بول اسی انداز میں گاتے ہوئے تین چار دوہرائے اور پھر ایک فلدوز نعرہ لگایا۔ باقی او مار ختم جب وہ کھڑا سوچتا رہ گیا کہ یہ شکوہ اس نے کس کے خلاف کیا تھا۔ خدا کے، محبوب کے، دشمن کے، زمانے کے یا زندگی کے خلاف؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا۔ اسے یاد آیا کہ پہلے کسی نے اسے بتایا تھا کہ رات گئے زنانہ پاگل خانے سے کوئی عورت پرسوز آواز میں ماہیا گایا کرتی ہے اور پھر

سینٹرل جیل سے اس کا محبوبہ جو اسے بھگا لے جانے کی کوشش میں قتل کر بیٹھا اور اب عمرقید کاٹ رہا ہے اس کے جواب میں جانے گاتا ہے اور یوں ان کے دلچسپ سوال جواب دیر تک چلتے رہتے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ عورت پاگل واگل نہیں ہے، صرف محبوب کا قرب پانے کے لیے پاگل بن کر یہاں پہنچی ہے وہ کچھ دیر سینٹرل جیل کی جانب کان لگائے کھڑا رہا۔ وہاں سے کوئی جواب نہ آیا نہ پاگل خانے سے پھر سے گانے کی آواز آئی ور نہ کوئی ہلڈوور مرہ بند ہوئے۔ ہر طرف وہی سناٹا پھر سے طاری ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی کوئی بوند پتوں سے پھسلتی ہوئی، سڑک پر ادھر ادھر گڑھوں میں جمع پانی میں ٹپک کر گرتی۔ چاند کا گویا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ وہ لمبے لمبے وقفوں کے لیے بادلوں سے باہر رہنے لگا۔ جل تھل ہوئی کالی بھیگی سڑک پر درختوں والا شیشہ سا کچھ ہوا چمکتی تھی۔

رمیش نے سوچا کہ کیوں وہ جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہوتا تو ان بچھڑے ہوئے پریمیوں کو ملا دیتا۔ مگر ان خاموشیوں نے اسے اٹھا کر پٹا دیا جہاں پہنچنا تھا کہ اب ایک کی آواز بھی دوسرے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ رمیش کورس ختم ہو جانے پر جیل روڈ میں سے ملٹری روڈ کے درختوں میں سے گزرتی جانے والی شیت کو جا رہی تھی۔ سکم نے اس کورس پر ریس کورس کے گرد گھوم کر لمبی دوڑ میں شامل ہو کر دیوار بنا دی تھی۔ دو ماہ سڑکوں پر لوگوں کو دوڑتے ہوئے گھوڑے مفت میں دیکھنے کا موقع نہ مل سکے۔ مگر ہر بار دوڑ کے دن عام لوگ دور بیچ میں دیوار پر بیٹھے ملاحظت گھڑدوڑ کا لطف اٹھاتے رہے۔ رمیش نے بھی اس دیوار پر سے کئی بار ریس دیکھی تھی۔ مجبوری کے لمحے گھوڑوں کی چمکیلی جلدیں، سواروں کے ہوکروں کی سی مختلف رنگوں کی ریشمی قمیضوں سے سجی وردیاں پہنے، اترے گھوڑوں پر بیٹھے، دور سے مدھم مدھم رمیش کو دھندلاتی ہوا کی طرح ان کے سامنے سے گزر کر آگے موڑ پر غائب ہو جاتے۔ لیکن ان کی دھمک کچھ دیر تک رہتی۔ سامنے سے گزرتے ہی ٹھہرے ہوئے لوگ ان کے زیر خاموش، اکڑوں بیٹھے لوگوں کے دلوں میں سراہٹ کرتی رہتی۔ وہ اداس ہو کر اپنی کھوپڑیاں ساتھ گھٹنوں پر رکھے لمبے انتظار میں دائرے کی پرلی موڑ پر وہی گھوڑے پھر نمودار ہوتے۔ پورے میں کھلبلی مچ جاتی۔ گھوڑے بھی رمیش کا زور لگاتے آگے بڑھتے۔ رہے ہوئے، پورے میں غلغلہ بلند ہوتا۔ ہر شخص یہ جیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوتا۔ اور پھر اور جب کئی گھوڑے سواروں کو لے کر دیوار تک چلے آتے اور پھر سہمے پھرپھراتے، ڈنکی چلتے واپس لوٹ جاتے۔ چلے بہت ہی دور ہو گئے۔ مگر اس میں ریس دیکھنے والی بات کب اور کہاں نکلی، یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

پاگل خانے کے گھنٹے کی آواز ایک بار ابھری، بھیگے ماحول میں تھرائی رہی، اور پھر وہی خاموشی آہستہ آہستہ ماحول پر طاری ہو گئی۔ رات کا ایک بج گیا تھا۔ یہ ساتھ ہی جو سڑک داہنی طرف کو نکل گئی ہے دو سو گز جا کر عین مرقاد پاگل خانے کے بڑے

دروازے میں کھلی جاتی ہے۔ جیل روڈ پر سیدھا آگے زیادہ دور نہیں یہی بس تیس چالیس قدم پر سیل کا ایک مہان پوکھوں جیسا پرشکوہ رکھ دیا۔ ان کی کوٹھی کے لان میں سے اور بند کھڑکی کی بارہ میں سے باہر نکلا کھڑا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کو چھوڑ دیا۔ خاموش رہا۔ رمیش نے جانا سو رہا ہو گا۔ اور سارے جاگ رہے ہیں تو سو رہے ہوں گے۔ بالمقابل کینیرڈ کالج فار گرلز ہے کہ سیاہ پھاٹک کے اندر اس سرخ اینٹوں کی عمارت سنبھالے سنبھل سنبھل اور دوسرے بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ میں چھپا آرام کر رہا تھا۔ چونکہ یہ کالج ہے اس لیے یہاں طالبات کی کوئی وردی مقرر نہیں۔ اوپر جہاں میں سکول اب بھی سائیکلوں پر آتی ہیں مگر سر گنگارام ہائی سکول جیسا طالبات کا اژدہام نہیں ہوتا۔ چند ایک ڈاڑیوں پر آتی جاتی ہیں یہاں کی بیشتر طالبات کے چہروں اور لباس پر ندرت کی عادی سوادگی و صحیح طور نکھری ہوئی پڑھی جا سکتی ہے۔ اس نے نظر کی سمت پھاٹک کے اوپر سے اوپر اٹھا کر اسے لاپ مہر چھوروں کی طرح نظر دوڑائی۔ ہر سمت میں عمارتوں کی قطار لگی تھی۔ ان کے آگے بیدکی کی کٹیا سی چارپائی پر سیاہ ڈھیری سی پڑی تھی۔ چوکیدار بھی لحاف میں سردی سے چھپا سو رہا تھا۔ رمیش کا کالا لیبراڈار نسل کا بڑا سا کتا ٹامی، چمکتی ہوئی چاندنی میں ایک بڑے سے ہوائی سیاہ دھبے کی طرح اپنے ایلی رطلی جیسی سرخک کا خط اٹھاتا، ہر گملے اور ہر درخت کے تنے کا سونگھ سونگھ کر معائنہ کرنے اور کسی مانوس بُو کو دوبارہ سونگھنے کی ہوس میں مصروف تھا۔ اس نے سوچا یہ ابھی ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرے گا۔ پھر اس نے کہا۔ رمیش مسکراتے ہوئے بولا، "ماشاءاللہ سدا سے ایسا ہی ہے۔" ٹامی سے اس کی رفاقت بہت گہری تھی۔ جہاں بھی وہ جاتا ساتھ ہوتا۔ بعض بار رات گئے وہ شانتی سے مالٹوں کے باغ میں مل کر واپس آ رہا تھا تو پتاجی برآمدے میں اس کے انتظار میں ٹہل رہے تھے۔

"تم ابھی کمرے میں روشنی جلتی اور کتاب کھلی چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟"

"جی، میں ایسے ہی ذرا باہر نکلا تھا تو دیکھا کہ یہ ٹامی کسی بلی کے پیچھے بھاگتا ہوا ادھر پچھواڑے نکل گیا۔ میں نے سوچا کہیں کھو نہ جائے۔ اسے پکڑ کر لا رہا ہوں۔"

انھوں نے اس کے بہانے کو شک کی عینک سے جانچنے کی کوشش تو کی مگر کچھ پلے نہ پڑ سکا۔ بوجھ کر کی خاموش ہو گئے۔ پھر بولے، "اچھا جاؤ اپنا پڑھو وڑھو۔"

رمیش کو یاد آیا کہ ایک بار اس کے پتا کے ایک دوست نے ٹامی کو اپنی سی رنگ و نسل کی کتیا سے ملانے کے لیے مانگ کر لے گئے تھے تو دو دن کے بعد وہ اسے واپس چھوڑ گئے۔ اس کے بعد سے اس کی یہ عادت تھی کہ گاڑی ہو یا کسی مہمان کی ذرا دروازہ کھلا رہا اور وہ جھٹ سے داخل ہوا۔ وہ ایک پُراشتیاق مسافر کی صورت، سیٹ کے پیچھے کی سمت میں پچھلی سیٹ پر اکڑوں بیٹھ جاتا اور کسی طور باہر نکلنے پر راضی نہ ہوتا۔ آخر کھینچ کھانچ کر بدقت نکالا جاتا۔

Scanned with CamScanner

اس نے سوچا کہ میں صرف سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ہوں، دیر اب ہو ہی چکی ہے
کیوں نہ اسے بھی دیکھ آؤں۔ ویسے بھی کوٹھی والے سب لوگ اندر نرم اور گرم بستروں
میں بے خوف و خطر پڑے سو رہے ہیں، کچھ دیر اور سو لیں۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہو کہ
وہ پھر ویسی ہی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ ساتھ ہی افسوس نے بھی سر اٹھایا کہ اس
کے وہاں سے مستقل چلے جانے پر کہیں بھی کسی کمی کا کوئی شائبہ نہیں۔ یہ حرامی تاس
میں جس کا ہر رات کا ساتھ تھا اپنی کھال کے اندر ویسا ہی سنسنی اور خوش، لان کی
گھاس میں ٹوبوں لگاتا پھرتا ہے جیسے ہمیشہ لگایا کرتا تھا۔ اس پر اوس سی پڑ گئی۔ پورے
جسم میں بیٹھی مار مردگی کا احساس جاگا۔ اس نے نرامدی کے کانو چہرہ گر گلہ کا پتی ہی
بند کر لیا۔ نہر کے پل پر پہنچے کہ سے سڑک ارد گرد کی سطح سے اونچی اٹھنی شروع ہو
گئی تھی۔ وہ بھی سا جھک کر چڑھائی چڑھنے لگا۔ سڑک کوئی سات آٹھ فٹ اونچی ہو چکی ہو
گی تو سی سڑک سے بہت نیچے بنگلے کی بیرونی دیوار کے اندر میں، بنگلے کو
پیچھے ٹیپے شامی کے باپ لالو کے کوارٹر کی چھت نظر آئی۔ اس کے ساتھ ایک کمرہ خوشبوں
لیے بنا ہوا تھا۔ کوارٹر کے آگے پر مالٹوں اور امرودوں کے باغ کی بیل سارے بنے تھے
ونچی کچی دیوار باغ کے ساتھ ساتھ اور پیچھے کو دور تک چلی گئی تھی۔ اس سے آگے سکھ
نالہ تھا جو نہر کے پیچھے سے گزر کر ادھر آتا اور تمام سال گمنام نالے کی طرح رستا اور
ہوکی جھجکی رانا رہتا مگر برسات میں بپھر جاتا۔ اس کے پرے کنارے پر پاگل خانے کے
سپاہیوں اور سٹاف کے دوسرے آدمیوں کے کوارٹر تھے جو نہر کے کنارے کنارے بنی ہوئی
پکی سڑک تک پہنچے تھے جہاں باغ کا ایک ذرا سا گوشہ دکھائی دیتا تھا، باقی باغ اس کے
تصور نے اسے پورا کر کے دکھا دیا، جس کے چپے چپے سے وہ خوب واقف تھا۔ یہ سونا باغ اس
کا پرانا ہمدم و ہمراز اور پناہ گاہ تھا۔ سبھی درخت اس کے دوست تھے اور ان پر بیٹھے
ذرا پرندے اس کے ہمسفر تھے۔ بچپن میں باپ سے پٹتا تو سیدھا یہیں آتا۔ اپنی بیبسی پر
غصہ کر روتا تو ایسے لگتی کہ جیسے میں کے زخم چاٹنے کے لیے یہ اچھی جگہ تھی۔ مشکل
سے جیتی ہو تو تب خاص اصطلاحوں کی بیماری بھی نہیں ہوئی۔ وہ گھنٹوں کسی سے کم
گانٹھ جوڑوں میں گم رہتا۔ قبل ہونے کے بعد اکیلے سوچنے کے لیے ٹھیک مقام تھا۔ جوانی ہو
تو ہر نئی محبت ہی رنگ نئی طرح کی میٹھی دکھن کا لطف یہیں اٹھاتا۔ یہ گویا اس کی
سلیمانی ٹوپی تھی جسے پہن کر وہ نہ صرف لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا بلکہ یہاں
کر اسے دل کے اندر سے ایک سہارا اور ہمت پیدا ہوتی محسوس ہوتی۔
گرمیوں کی کئی دوپہریں اس نے وہاں شوخ گلہریوں کی اچھل کود دیکھنے میں گزاریں
برسات کی کئی شامیں جلتی بجھتی فضا میں ہوتے پھرتے جگنوؤں کی آنکھ مچولی دیکھنے
میں بتائیں۔ پچھلی سردیوں کی بہت سی راتیں شانتی کے اور اپنے جوان جسموں کی
مسحورکن بھول بھلیوں کو دریافت کرنے میں صرف کیں۔ وہ ایک عجیب حیرت انگیز تجربہ

تھا جیسے لمس کا کھیل کھیلنا چاہیے ہاتھوں کا لمس، ہونٹوں کا لمس، سینے کا لمس،
جسموں کے اندر ایک خاموش تلاطم ابھرتا چلا آتا۔ بدن کا تشنج، اعصاب کا کھچاؤ زندگی
کا تناؤ بڑھتا چلا جاتا، پھر اس میں آسودگی پیدا ہونے لگتی اور اندر طوفان تھم جاتا
اعصاب اتر جاتے۔ اس کے بعد اس کے بدن کا سودا ہی اور گہرا ہو جاتا۔ سانس گونجنے لگتا۔
سپاٹی اس کے اندر ایک عجیب آواز میں بولنے لگتی۔ اسے لگتا جیسے اس کا بدن ایک خالی
گنبد ہے جس کے اندر سانس اب بھرپور سنگ سی ہے جو اس طرح جیسی ہوئی باندھ
ناچ رہی ہے اور اس کے چھ ہاتھوں میں خون میں جاتے ہوئے چھ انسانی سر ہیں، اور ہر سر
اسی کا سر ہے۔ وہ اپنے گرتے سنبھالتا ہو شانتی سے کوئی بات کیے بغیر فوراً اٹھ کر گھر کی
طرف چل دیتا۔ مجبور تم پہنچوں بھاگ ۔۔۔
میں چل پڑتا اور ہر چند قدم کے بعد مڑ کر اسے دیکھتا جاتا۔ جب وہ یوں معانی سا شانتی
کو سنگ بیٹھی چھوڑ کر پیٹھ موڑے سر نیہوڑائے آہستہ آہستہ چلا جا رہا ہوتا تو شانتی کا
دل چاہتا کہ وہ کسی طرح سے ہار کر کہا چلے اور پھر سے اپنی آسیبوں میں سے گزار کر
ملاطفت کا ایسا قصر بنا دے جیسے غلاظت کا ایک ڈھیر دنیا کی نظروں میں وہ خود ہے پھر
تو یہ کہیں نہ جا سکے گا۔

وہ سرگوشی میں پوچھتی، "کل آؤ گے؟"

اس کی آواز کان میں پہنچتی تو وہشت کا نیں اب گویا شانتی کے جسم کی ٹھوس
حقیقت سے اور نشہ کی اترنے کی کیفیت سے گھبرا کر جھنجھلا اٹھتا۔ وہ سختی سے کہتا
"نہیں۔ کبھی نہیں۔"

دوسرے دن شام تک وہ دل میں یہی عہد پر مرمرلرل تیار میں لگا رہتا۔ جوں جوں شام
رات میں ڈھلنے لگتی اپنے کوارٹر میں بستر شانتی کے بدن کی خاموش بلاووں کو ریشہ
سگنل کی طرح رمش کا بدن پیچ موصول کرتا رہتا۔ رات کی ہر نئی ساعت ساتھ وہ
واضح، شدید اور پراسرار ہوتے چلے جاتے اور اس کا بدن اس کی اپنی اختیار سے باہر اپنی
اپنی اندرونی طور پر جاگتا، پھر سلگتا، پھر بھڑک اٹھتا اور جواباً سگنل بھیجنے لگتا۔ جب
پاگل خانے کا گھنٹہ رات کے بارہ کا گجر بجاتا تو اس کا بدن کسی سیج یا کھوپڑے کی طرح
اس کے قابو سے باہر اس کے واضح حکم کے خلاف، اپنے آپ اٹھتا اور باغیچے میں پہنچ جاتا۔
سنہری چاندنی میں نہر کا مٹیالا پانی جھوٹے جھوٹے بھنور بناتا پل کے نیچے سے تیزی
سے نکلتا اور پھر اپنی معمول کی رفتار پر لوٹ کر آہستہ آہستہ آگے بہتا چلا رہا تھا۔ دائیں
کنارے کے ساتھ ساتھ کوئنٹر کی کچی سڑک تھی جس پر بجلی کے کھمبے نصب تھے جن میں
سے چند ایک اب روشنی بھی تھے۔ بائیں کنارے پر شیشم کے اونچے اونچے گھنے سایہ دار
درختوں کی چھال بچھی ہوئی تھی جس پر صبح شام انگریز اور دیسی صاحب اور میمیں
گھڑسواری کیا کرتے تھے۔ بائیں کنارے سے ہٹ کر سیجھے کیدل پارک تھا جس کے دھول میں

Scanned with CamScanner

سے الگ گھروں سے مجرے راستے تھے جن پر [illegible] سے نہ چل سکتی تھی۔ کچھ
[illegible] ہو رہی تھی۔ کچھ ہو چکی تھی۔ [illegible] کے اشجار کے [illegible] اور
اسد پور [illegible] نام [illegible] پر لگے رہتے تھے ان کے پیچھے کھیتوں کا وسیع
سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ [illegible] کنارے پر سڑک تک پاگل خانے کی ملازمین کے کوارٹر چلے گئے
تھے۔ ان کے سامنے [illegible] پارک کے قریب نہر کے نیچے [illegible] جاتا اور
پھر کوارٹروں کے آگے [illegible] سطح [illegible]
اور پھر رمیش کو بنگلے کے عقب میں واقع [illegible] امرودوں کے باغ کے پاس سے گزرتا
ہو پاگل خانے کی دوسری [illegible] ڈاکٹروں اور کمپونڈروں کی بستی کے [illegible] سے مل جاتا
[illegible]
[illegible] کہاں [illegible] ہے [illegible]
[illegible] رمیش [illegible] کے درمیان میں [illegible]
[illegible] روشنی
[illegible] تھا۔ گر اسے
[illegible]
[illegible] لوہے کا
سیاہ پھاٹک [illegible]
[illegible] کا عالم
[illegible]
[illegible]
[illegible] قبرستان کا [illegible]
[illegible] ہو [illegible]
[illegible]
[illegible] جیسے موت کسی دوسری
[illegible] کہ وہ خود [illegible] جنگ ہو رہا
[illegible]
[illegible] کے پاس [illegible] لیکن
[illegible] کے لیے بہت
[illegible] کے ساتھ اس کی
[illegible]
[illegible] اور پھر [illegible]
[illegible]

کھاس لگے کنارے پر [illegible] عزیز کا ایک چچازاد ہاشم اندرون بھائی گیٹ میں
رہتا تھا اور اسلامیہ سکول میں پڑھتا تھا۔ عزیز کی اس سے بہت دوستی تھی۔ ان کے
والدین غالباً غریب تھے اس لیے ابھی تک وہ لوگ اس [illegible] گلی میں واقع [illegible] گھر
میں رہتے تھے۔ چھٹی کے دن وہ عزیز سے ملنے نہر کے کنارے چلا آتا اور [illegible]
ان لوگوں کو شرارتیں کرتے دیکھتا رہتا اور انگریزی میں [illegible] انگریزی [illegible]
بولتے سنتا رہتا۔ شرمیلا بہت تھا۔ جب کبھی نہر میں نہانے کی [illegible] کے علاوہ [illegible]
سے الگ نہ کرتے۔ اسے زیادہ تیرنا نہیں آتا تھا اس لیے کنارے کے قریب رہتا۔ ایک بار
اصرار کیا گیا کہ ہاشم بھی ننگا ہو کر پل پر سے چھلانگ لگائے وہ نہ مانا تو زبردستی اسے
ننگا کر کے بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ کر [illegible] طرح نہر کے درمیان میں اچھال دیا
گیا۔ ایک عرصہ دوسرے عرصہ [illegible] ہو گیا۔ [illegible]
آتا تھا وہ اتنی ہی کوشش [illegible] کرتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ عزیز نہر میں چھلانگ
لگا کر تیزی سے تیرتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور [illegible] ہاشم کو کنارے کی
طرف زور زور سے [illegible] وہ کنارے کے قریب ہوا تو رمیش نے [illegible] ہاتھ پکڑ
کر دوسرا بازو [illegible] کو اسے بالوں سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔ وہ [illegible]
[illegible] کنارے پر [illegible] لگا۔ اس کی [illegible] پانی [illegible] رہا تھا وہ
[illegible] مگر [illegible]
[illegible]
[illegible] ہو کر پھیلا کر
[illegible] نہیں؟ [illegible]
ہو جاتی۔ انہیں [illegible] افسوس [illegible] ہو گئی

بابو رام پرتھوی پاگل خانے کے [illegible] میں ایک [illegible]
تھا۔ اس کی رہائش [illegible] پارک میں تھی کسی صاحب حیثیت رشتہ دار کے پاس نہیں۔ وہ
تقریباً رمیش اور عزیز کا ہم عمر تھا۔ انہیں نہر میں نہاتا دیکھ کر وہ بھی ان کے پاس چلا
آتا۔ لیکن یہ لوگ اسے [illegible] اس کا نام اور [illegible] دونوں ہی [illegible] اور
[illegible] گرمیوں کی ایک شام [illegible] کالج ہوسٹل کی لڑکیاں کالج کی بس
میں [illegible] کالج کسی تقریب میں شمولیت کے لیے جا رہی تھیں کہ نہر کے کنارے پہنچ کر
بس خراب ہو گئی۔ سب لڑکیاں [illegible] لگیں۔ بابو رام پرتھوی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور
[illegible] انداز میں لڑکوں کو حکم دینے لگا "[illegible] لگاؤ اس
بس کو۔" پھر اس نے [illegible] حرکت دینے لگے
[illegible] بس اسٹارٹ ہو گئی اور وہ بس کے پیچھے [illegible]
نکلتا ہوا بھاگنے لگا۔ جب بس [illegible] ہو گئی تو اس نے [illegible]

اور سر ہاتھوں میں پکڑ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ کسی نے اس سے بات نہیں کی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ [illegible] اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

[illegible] ایک دوپہر کو رمیش باقی دوستوں سے پہلے سیر پر پہنچ گیا۔ وہ کچھ دیر [illegible] اکیلا [illegible] ایک چالیس پینتالیس سالہ آدمی بہت قیمتی سی گاڑی جس کی چھت اتری ہوئی تھی، چلاتا ہوا [illegible] کے کنارے سڑک پر اس کے قریب آ کر رکا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے رمیش کو ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا اور اس سے باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ گاڑی آگے بڑھاتا گیا۔ رمیش ساتھ ساتھ چلتا اس کے سوالوں کے جواب نہایت [illegible] سے دیتا گیا۔ تمہارا نام کیا ہے؟ کہاں پڑھتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ [illegible] پل کے قریب چوک میں پہنچ گئے۔ پھر اس نے کہا، "میرے ساتھ چلو گے؟ اس شاندار گاڑی میں سیر کرا کے تمہیں یہیں واپس چھوڑ دوں گا۔" وہ یہ فرمائش سن کر پہلے تو حیرت زدہ ہوا پھر اسے شک گزرا [illegible]

[illegible]

ڈاکو کی خواہش تھی کہ [illegible] کسی طرح پڑھ جائیں [illegible] تو پہلی جماعت ہی میں اسکول سے ایسا بھاگا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ [illegible]

Scanned with CamScanner

مراعات کی ہے پانچ روپے ماہانہ بند ملتے۔ مگر شانتی جب اٹھویں جماعت میں دوسری بار
میں فیل ہو گئی تو مشنری اسکول کی انتظامیہ نے اسے گھر واپس بھیج دیا۔ لالو کو بہت
دکھ ہوا۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ یہ پڑھ لکھ کر نرس ہو ضرور ہی بن جائے گی۔ مگر مشنری
سکول کی ہیڈمسٹریس نے اسے بلا کر جتایا۔ افسوس سے بتایا کہ لڑکی کا جی پڑھائی میں
نہیں [illegible] دوسرے [illegible] بچوں کی بجائے [illegible] ہو جاتا ہے پھر
[illegible] نہیں [illegible] پریشان ہو گیا کہ اب کیا کرے۔ [illegible] پڑھی لکھی بیٹی کا ہاتھ
کس بھنگی کے ہاتھ میں پکڑا دیتے۔ [illegible] غریبوں میں [illegible] کا [illegible]
جھاڑو [illegible] کا کام [illegible] وہ [illegible] ہوا شانتی گھر
[illegible] اور [illegible] کی [illegible] شانتی نے
[illegible] صاف کرنے سے [illegible]

رمیش [illegible] شانتی [illegible] رنگ [illegible] اور [illegible]
[illegible] گہرا سانولا جسم [illegible] نور [illegible]
[illegible] کیا یہ وہی شانتی تھی؟ [illegible] سال پہلے جب وہ اٹھویں
جماعت میں پڑھتا تھا [illegible] لڑکی میلا کچیلا [illegible] گھر کے پچھواڑے
[illegible] کھوجا کرتی
[illegible]
[illegible] دیکھ کر [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] رمیش [illegible] سے [illegible]
[illegible] جھاڑو [illegible] شانتی [illegible] رمیش
[illegible] ایک بار
[illegible] جیسی کوئی
[illegible] کا عنصر تھا۔
[illegible] کے مالک [illegible] کے آگے میدان جنگ
[illegible] کی طرح [illegible] اور عزت [illegible]
[illegible] سجائی گئی [illegible]
رمیش [illegible] رنگ [illegible] کس کس طرح

کرتا [illegible] رنگ میں رنگنے [illegible] اب تک سنہرے سے گندمی ہو چکا تھا۔ آنکھیں میلا رنگ
کھو کر سیاہ ہو چکی تھیں اور بال سنہرے [illegible] کالے ہو گئے تھے۔ آج پھر وہی گندمی
[illegible] مختلف صورت حال میں کھیلا جانے والا تھا۔ ایک ڈراؤنی صورت جس کی [illegible]
[illegible] کرنے کے بعد [illegible] میں [illegible] کبھی کبھی [illegible]
[illegible] آج ایک [illegible] کے بارے میں
[illegible] شانتی کے [illegible] بدن کی [illegible] رمیش کے [illegible] انداز کے
[illegible] جیسے [illegible]
[illegible] کا جواب [illegible] تھا۔

رمیش شانتی کو دیکھ کر ایک بار پھر حیران رہ گیا۔ کیا یہ وہی شانتی ہے؟ [illegible]
کم عمل میں تو وہ گویا اب سونا بن گئی تھی جو ابھی کٹھالی سے کندن بن کر نکلا ہو
اس کا گہرا سانولا رنگ اب صاف ہو کر [illegible] چہرے پر وقار
اور اعتماد کا اضافہ ہو گیا تھا۔ رمیش کے دل میں شانتی کے خلاف نفرت [illegible]
اس [illegible] عورت نے اچھوت ہوتے ہوئے اسے پیار کرنے پر مائل کیا [illegible]
[illegible] لیکن اس نفرت کے باوجود [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] وہ نفرت اس وقت گویا کہیں [illegible]
ایک بار پھر [illegible] اس کی انگلیوں کی پوروں پر [illegible]
جسم کی چاہت [illegible] اس کے اندر انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی [illegible]
[illegible] وہ اس وقت [illegible] شرمایا۔ اس نے سوچا کہ وہ [illegible] کسی طرح اس
[illegible] بے خبر رہ سکتی [illegible] جیسے [illegible]
[illegible] شانتی [illegible] اس کا ہر قدم
گویا اس کی [illegible] اور گناہ کے [illegible] کو اس کی [illegible] کے قریب [illegible]
[illegible] حقیقت اور اس کے [illegible] میں [illegible]
کا اندازہ [illegible] تھا کہ کسی طرح [illegible]
[illegible] چلا جائے۔ [illegible] کہ شاید [illegible] اور اس کے اندر [illegible] شاید وہ
[illegible] جسم کی [illegible] کے ساتھ [illegible]
[illegible] کی طرح [illegible]
[illegible] کی مانند [illegible]
اور [illegible] اس کی مضبوط قوت ارادی کی [illegible]

تھے۔ ان کی [illegible] مختلف سیاہ آنکھوں کو غور سے تھا۔ چاہت اور محبت میں ڈوبی نظریں ایک لمحے کو رمیش کے چہرے پر جمیں، وہاں کچھ تلاش کریں اور دوسرے لمحے [illegible] میں دونوں اپنی بانہوں کے درمیان سینے سے [illegible] کھڑکی کی طرف پلٹ جاتیں۔ وہ شاید رمیش کے چہرے پر بھی [illegible] ظاہر اور حسد کا کوئی شائبہ ڈھونڈنے لگیں جو شانتی [illegible] میں بچے کی [illegible] تھا۔

شانتی نے کہا۔ "چودھری صاحب، سلام۔"

وہ [illegible] شانتی سے [illegible] وقت ہنستا رہا۔ "بیٹھ کر لو شانتی۔ اور سناؤ بھی [illegible] ہو گئیں؟ بولو جلدی کی [illegible] ہے۔ کیا نام رکھا ہے اس کا؟"

رمیش، [illegible] بچے کا کپڑا ہٹا کر دونوں بازو آگے بڑھاتے ہوئے اس کی [illegible] ہو گئی۔ اس کے بدن کی مہک میں اب نومولود بچے اور چھاتیوں سے رستے دودھ کی مہک بھی شامل ہو گئی ہے۔ وہ [illegible] ہو گیا جیسے ایک [illegible] اور دوسرے میں بالکل خالی کا [illegible] وقت بج اٹھے ہوں۔ [illegible] ضرورت نہیں محسوس [illegible]

[illegible] گئیں [illegible] رمیش کے چہرے کی [illegible] ہو گئی رمیش کی ناک رکھی [illegible] اور [illegible] احساس [illegible] باپ [illegible] اچھوت کی [illegible] ہو گئی کہ [illegible] چلی جائیں گی۔

شانتی نے سرگوشی میں [illegible] رمیش [illegible] پھر کچھ وقفہ [illegible]

[illegible] وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی [illegible] وغیرہ [illegible] شادی کے بعد سے خاص طور پر [illegible] فرش [illegible] لگی ہوتی [illegible] اور نہ رمیش میں اتنی ہمت تھی کہ [illegible]

[illegible] ہوتا [illegible] گود میں [illegible] اور وہ [illegible]

[illegible]

طور آمادہ ہو سکتا تھا۔ مجبوراً وہ برآمدے کے ستون سے کمر لگا کر فرش پر بیٹھ گئی۔

جب شانتی مشرقی سکول چلی گئی تھی تو رمیش کو اس کی غیر حاضری کا کچھ پتا نہ چلا تھا۔ کئی برسوں کے بعد ایک دن جب وہ واپس آ گئی تو [illegible] ہو گئی تھی۔ اب وہ صاف کپڑے پہنتی تھی اور بال سلیقے سے بنانے لگی تھی۔ دیکھنے والوں کو صاف نظر آتا کہ وہ پل بھر کے لئے بھی اپنے بدن کی آگ سے غافل نہیں ہوتی۔ وہ اپنے دلکش بدن کو یوں چرا کر چھپاتی [illegible] جیسے اس پر نادم ہو۔ اسے اپنے کسے ہوئے جسم اور خاص طور پر پھیلی ہوئی قوسوں کا ہر وقت احساس رہنے لگا تھا۔ جوانی بڑی زور کر کے اس پر چڑھی تھی جیسے [illegible] آسمان پر ساون کی کالی گھٹ خودبخود موج درموج دوڑتی چلی آتی ہے۔ بعض اوقات تو وہ خود پریشان ہو جاتی کہ قدرت کو اسے [illegible] کی بھلا کیا سوجھی۔ [illegible] بہت کم میں کام چل جاتا۔ سکول جانے سے پہلے [illegible] نظریں [illegible] کی تلاش میں بھٹکا کرتی تھیں۔ [illegible] تشنگی کی تحریریں پیدا کر دی تھیں۔ جیسے رمیش نے پڑھ کر اسے بلایا۔ کسی [illegible] کے بہانے اگر کبھی [illegible] لگ بھی جاتے تو وہ دنوں میں [illegible] کے خالی ہو جاتے ہیں۔ وہ [illegible] باغ میں اپنے بدن کا سارا خراج [illegible] کر کے ہی [illegible] اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو گئی۔

بہت دنوں کے بعد [illegible] شانتی کے سامنے پھر اس کی [illegible] کا مرکز موجود تھا۔ وہ [illegible] کے گلے سے لپٹ کر خوب رونا چاہتی تھی۔ یہی تو ایک سکھ ہے جو بغیر اپنے پیاروں کے کہیں میسر نہیں [illegible] سکتا۔ [illegible] روپیا [illegible] نہیں خرید سکتا۔ لیکن وہ سمجھتی تھی کہ وہ [illegible] ہو گا۔ اگر وہ چاہے بھی تو اچھوت کو کیسے لپٹ سکتے ہیں۔ مگر اپنی اس حسرت کا کیا کرتا [illegible] اس نے اپنی [illegible] حسرتوں کی مانند [illegible] کے بادبان لگا کر طوفانی سمندر میں دھکیل دیا کہ شاید کسی روز کنارے سے ہمکنار ہو سکے۔

رمیش کے دل میں خیال گزرا کہ اگر شانتی کے ہاں لڑکے کی بجائے لڑکی پیدا ہوتی تو [illegible] ہو جاتا۔ یہ بہت ہو گئی۔ اس جھولے سے بہانے کی [illegible] اس نے [illegible] گرد و غبار [illegible] ڈالا۔ اس کا دھلنا تھا کہ ایک بار پھر شانتی کی دعوت دیتے ہوئے بدن نے اس پر دیوانگی سی طاری کر دی۔ اس کے اپنے بدن سے چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ اس نے چاہا کہ کاش اس وقت رامو اور ماتاجی گھر میں نہ ہوتے تو وہ ایک بار صرف ایک بار شانتی کے بدن سے لپٹ جاتا۔ اس میں اپنا آپ ضم کر دیتا۔ اسے سامنے بیٹھی، چمکتے ہوئے سفید دانتوں سے ہنستی شانتی ایک دم بہت پیاری لگنے لگی۔ رمیش نے آواز اور لہجے میں اپنائیت

[illegible] ہوئے پوچھا "ارے کیوں ہنسے جا رہی ہو پاگلوں کی طرح؟"

"تمہیں کچھ یاد آ گیا ہے؟"

"[illegible] بھی ہو پتا چلے"

"ہاہا میں نہیں بتاتی۔ اس پر پھر ہنسی کا دورہ [illegible]

یہ سنتے ہی رمیش پر چھائی ہوئی چاہت کی دیوانگی وہیں ٹھٹھری رہ گئی۔ چہرہ یک دم سرخ ہو گیا، [illegible] بند ہو گئیں اور وہ شل ہو گیا۔ اسے یاد آیا جب شالنی نے ایک رات اس سے پوچھا تھا کہ اگر کسی طرح [illegible] کی دوستی اندر سے ہو جائے تو تمہیں کیسا لگے گا۔

[illegible]

[illegible]

"میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"یہ شادی تھوڑا ہی ہے، بردکھووا ہے۔ وہ پسند آ جائیں تو پھر منگنی ہو گی، اس کے بعد کہیں شادی کی نوبت آئے گی۔ بیٹا، بڑی سندر لڑکی ہے، بی اے پاس ہے، گاتی بہت اچھا ہے۔ اور پھر یہ کہ بڑے دھرمی لوگ ہیں۔"

شالنی کا اپنی چاہت کے ذکر پر فخر سے مسکراتا ہوا منہ بردکھووے کا نام سن کر کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اسے بچپنے باغیچے میں دور کہیں منڈیر پر کوے کی کائیں کائیں سنائی دے رہی تھی، جیل روڈ پر تانگہ کھینچتے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آ رہی تھی، لیکن ان کے سامنے گویا خاموش فلم چل رہی تھی۔ دو اجنبی چہروں کے صرف ہونٹ ہل رہے تھے پتا نہیں کیا باتیں کر رہے تھے۔ وہ چپکے سے اٹھی، بیٹی کو چھاتی سے چمٹایا اور خاموش فلم کو بیچ چھوڑ کر وہاں سے رخصت ہو گئی۔ آنسو اس کی بےبسی میں آنکھوں سے بہے جا رہے تھے۔ [illegible]

دوپہر کے قریب کھانے سے فارغ ہو کر رمیش اور اس کے پتا [illegible] لان میں نکل آئے۔ باقی لوگ دیوی دیوتا کے گھر جانے کی تیاری میں زور شور سے مصروف تھے۔ لان میں پاگل خانے سے آئے ہوئے دو پاگل کیاریوں میں پودوں کی نلائی کر رہے تھے۔ پھاٹک کے قریب لالو بھنگی پاگل خانے سے چھٹی ہونے کے بعد جھاڑو دے رہا تھا۔ وہ دونوں لان میں ٹہلنے لگے۔ اس کے کاندھے [illegible] گرم سوٹ [illegible] انگریزوں کے ساتھ نوکری کرنے کی ٹھسک پر [illegible] چھوت چھات سے متنفر پتاجی اچھوتوں کی [illegible] خاموشی سے لالو بھنگی کی [illegible] شرم سے پانی پانی ہو گیا

گورنمنٹ کالج میں چھٹی ہو چکی تھی۔ گرم گرم روشنی سنہری دھوپ میں بھیگی ہری گیلی گھاس اور شوخ پھولوں کی مہک میں بسی جیل روڈ خاموش، سنسان ہونے کے باوجود اداس نہیں صرف سوچتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ رمیش بچپن سے پاگلوں کو ایسے لان میں کام کرتے دیکھتا آیا تھا۔ [illegible] جب بھی نظر پڑتی وہ ایسی خواب سی [illegible] جس میں نہ کوئی احساس ہو، نہ تمنا، نہ حسرت، نہ طلب، نہ شعور اور نہ زندگی۔ رمیش ایک پاگل کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ہاتھ کھرپی سے کام میں مصروف تھا اور وہ ساتھ ہی دھیمی آواز میں مگر اتنی ہی تیوری داری سے باتیں کرتا جا رہا تھا۔ رمیش نے سمجھنے کی کوشش کی مگر کچھ پلے نہ پڑا۔ صرف اتنا پتا چلا کہ شکووں کا کوئی طومار ہے۔ اور شکوہ کرنے کا مطلب ہے کہ اس شخص نے امید کی لو، چاہے کتنی ہی مدھم کیوں نہ ہو چکی ہو، ابھی اپنے اندر بجھنے نہیں دی۔ اس نے دوسرے پاگل کی طرف نظر دوڑائی۔ وہ [illegible] مطمئن اور ایک اوسط آدمی کی سی سنجیدگی سے کام میں مصروف تھا۔ اس

Scanned with CamScanner

... نہ چھوٹے دیکھنے سے ہی پتا چل جاتا تھا جیسے وہ تو مختلف [illegible] کی بانس ہوں۔ [illegible] جنوبی میں رمیش [illegible] بالکل سے پوچھا۔ کیوں مجھے یہ [illegible] رہے ہو؟ وہ اپنے آپ میں مست رہا۔ جب وہی سوال بار بار دہرایا گیا ہو تو کسی حد درجہ خوفزدہ انسان جیسی بھیانک طور پر کھلکھلا کے ہنس دیا [illegible] کے انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ [illegible] رمیش واپس [illegible] یہ علاقہ محفوظ ہے لیکن اتنے بھی نہیں [illegible] دشمن [illegible] تمام [illegible] سے گزر چکی ہیں۔ یہ صحت [illegible] کی حفاظت اور [illegible] نہیں ہو گی

[illegible] کا انچارج ڈاکٹر [illegible] رمیش [illegible] مایوسی ہوتی۔ زندگی [illegible] کی قیمت [illegible] اس کی آخری [illegible] ناک [illegible] کرنے چلا آ رہا تھا۔ رمیش [illegible] چہرے پر [illegible] نظر دوڑائی [illegible]

[illegible] سب کو [illegible] جلائے ہوئے [illegible] کے لیے چل پڑے [illegible] افسر [illegible]

[illegible] رجمنٹ [illegible] کلکتے سے ہوتے ہوئے آسام کی برما سے ملحقہ سرحد پر پہنچ گئی۔ ہرے ہرے درختوں سے [illegible] پہاڑیوں کا سلسلہ ہر طرف پھیلتا چلا گیا تھا۔ [illegible] گھاس اور چھوٹی بڑی جھاڑیاں [illegible] جب وہ وہاں پہنچے تھے تو [illegible] کی طرح [illegible] نظر آتی تھیں۔ جنگل کی خاموشی اور ہریالی میں یہ تصور کرنا مشکل تھا کہ کہیں آس پاس جنگ [illegible] لگتا تھا کہ جنگ صرف ہندوستانی اخباروں کے صفحوں پر لڑی جا رہی تھی۔ اگرچہ [illegible] جنگ کے بالواسطہ اثرات سے بری طرح متاثر ہو رہی تھی [illegible] دیگر چیزوں کے [illegible] عام آدمی کی پہنچ سے بہت آگے نکل گئی [illegible] شہروں کی طرف [illegible] مستقل [illegible] جنگ [illegible] منحصر [illegible] جنگ کا [illegible]

راستہ دیکھنے سے بچا رہا تھا۔

رمیش کی رجمنٹ نے ایک پہاڑی کی پشت پر، جو ہندوستان کے رخ واقع تھی، خیموں کی بستی آباد کر لی۔ ایک طرف جوانوں کی رہائشی اور لنگر کے خیمے تھے اور ان سے کوئی سو گز ہٹ کر کمیشنڈ افسروں کے خیمے اور میس تھا۔ دشمن کی ہوائی حملے اور توپ خانے کی فائر سے بچاؤ کے لیے جگہ جگہ خندقیں کھودی گئی تھیں۔ [illegible] کی رجمنٹ دو مہینے سے منتظر تھی کہ ہیڈکوارٹر سے حکم آئے تو آگے بڑھیں یا دشمن حملہ آور ہو تو اسے پسپا کریں۔ لیکن لگتا تھا کہ [illegible] کے ہیڈکوارٹر اور دشمن دونوں نے اس رجمنٹ کو دانستہ ایک لامتناہی انتظار کی اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اور دوسری طرف بار بار تنبیہ کی جاتی کہ ہر وقت تیار رہو، جانے کس صبح کیا ہو جائے۔ ہدایات کے بارے میں ذرا سی بے احتیاطی پر سخت سزا دی جاتی۔ اس اثنا میں درخت ہرے بھرے پتوں سے لد گئے۔ بارشیں بھی ہوئیں۔ پھیلی پڑی ہوئی گھاس نے رنگ بدل لیا۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا کہ اتنی بہت سی گھاس موجود ہے لیکن کھانے کے لیے ایک جانور بھی نہیں۔ چمکتی دھوپ، گرجتے بادلوں اور [illegible] صاف ہواؤں تلے ہریالی کا یہ منظر [illegible] مارتا۔ جس کے ڈر سے خیمے میں [illegible] اور [illegible] پسینہ بہاتے چیونٹیوں کی طرح مصروف رہتے۔ فوجیوں کو بے مقصد طور پر مصروف رہنے کا [illegible] ہر شام [illegible] اور [illegible] پر شراب پیتے ہوئے کچھ دیر کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتے [illegible] پھر تکیوں پر سر رکھ کر روتے اور خوابوں میں وطن کی [illegible] میں پہنچ کر رات [illegible] کے ساتھ بسر کرتے جن کے ہجر میں شام کو آنکھیں نم ہوتی تھیں۔ سو گز کے فاصلے پر افسروں کا میس کرنل [illegible] کی صدارت میں [illegible] خیموں کے سامنے دائرے میں کرسیاں بچھا کر محفل جمائی جاتی جس میں کچھ تو [illegible] کی کارگزاری کی روئداد ہوتی، باقی وقت انگریزی لطیفے اور مزاحیہ [illegible] سنانے میں صرف ہوتا۔ [illegible] کے اندر [illegible] اور [illegible] کا مظاہرہ ہوتا۔ [illegible] وسکی کے گلاس [illegible] پیش کرتے جاتے۔ [illegible] ختم ہونے پر ایک طرح کی خوشی سی ہوتی کہ چلو [illegible] قید کا ایک دن اور کم ہوا۔ کل صبح کا سورج شاید کوئی اچھی خبر لے کر آئے۔ دس بجے کے قریب کرنل صاحب اٹھتے تو سب اپنے اپنے خیموں کا رخ کرتے۔ رمیش سب افسروں سے عمر اور عہدے میں چھوٹا تھا۔ انگریزی اسکول کی تعلیم و تربیت کے باعث اس کا اظہار بیان دیگر [illegible] افسروں کی نسبت زیادہ بامحاورہ اور مؤثر تھا اس لیے کرنل [illegible] اس کی باتوں پر [illegible] اس کا دل بڑھاتا اور اسے بات کرنے کا خصوصی موقع دیتا۔ وہ کبھی کبھی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کلام کرتا تو رمیش کے دل میں اس کے لیے اپنائیت کا احساس اور بڑھ جاتا۔ رمیش کرنل سے چھوٹا موٹا مذاق کرنے کی جرأت بھی کر لیتا تھا۔

[illegible] نہیں پتا نہیں کیوں یہ بول اٹھتی بیٹھتی گھومتی پھرتی، اس کے ذہن میں گونجتے

Scanned with CamScanner

ہر شام کھیلنے کے بعد اڑوس پڑوس کے بچوں کا جمگھٹ ان کے لان میں ایک قطار میں بچھی سفید اجلی چادروں والی چارپائیوں کے اردگرد اکٹھا ہو جاتا۔ کیاریوں پر چھڑکی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اور کچی گیلی جڑوں کی خوشبو رچی بسی ہوتی، رات کی رانی کی تیز خوشبو مشام جاں میں سنجیدہ موسیقی کی مانند ایک ارتعاش سا پیدا کرتی چلی جاتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو شاید بچوں میں سے ایک جانتا تھا، سب کیولی باپتا ہوا ہر کھیل میں جی جان سے منہمک ہوتا۔ چھپنے والوں کے ساتھ چھپتا اور کھوجنے والوں کے ساتھ کھوجتا۔ کوکلا چھپاکی کھیلا جاتا تو بٹنے والوں کے ساتھ اس پر بھی ایک دو کوڑے برستے اور وہ خاموش ہنسی ہنستا گھاس پر لوٹ پوٹ ہوتا چلا جاتا اور اٹھ کر پھر سے بھاگنے دوڑنے لگتا۔ پتاجی اندر کتاب پڑھ رہے ہوتے۔ ماتاجی ان کے کام کاج سے نپٹ کر چارپائی پر بیٹھی مسکراتی رہتیں اور جب خوش مزاجی والا عاجز [illegible] جاتا تو اپنے پاس بلا کے جھڑکی سے کہتیں، "ہیولو، کیراج کے پاس چھپنے کی جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے ہیں، جا پکڑ لے وہاں۔" بچوں کے کھیلنے کا شور دور دور تک جاتا۔ شور سے کو شانتی اور سکت ملتی پاتی، لنگ بھی، ایسے بوسیدہ قبضے کھیت میں سوکھی چوروں کی طرح [illegible] اور بھٹکتے ہوئے برآمدے کے ستون سے کمر لگا کر کھیلتے بچوں کو سہانی نظروں سے دیکھنے لگتی۔ ماتاجی نے کبھی نہ کہا کہ ابھی بھی کھیل میں شامل ہو۔ پتاجی باہر نکل کر ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں لان میں لے آتے اور اندر اور بچوں کو اور بیٹی کو بھی ساتھ کھلاتے۔ ماتاجی ہنسی ہونٹوں پر ڈاکٹر شرما کو یہ ہدایت دیا کبھی نہ بھولتیں کہ اب آپ ہاتھ دھو لیں۔ بچے اپنا کھیل جاری رکھیں۔ وہ دونوں لان میں بیٹھے ہی کھڑے ایک کا منہ تکتے رہتے ان کا کھیل میں شمولیت کو یہ لان میں آنا بھی دو مسلسل سبھی بچوں کو کھلتا تھا۔ سارے بچے ان سے پھر جانے کی خوف سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے ان سے دور دور رہتے۔ ڈاکٹر شرما کی سفارش بیکار تھی کیونکہ شکست کے اثرات کئی دہائیوں کے گزر جانے کے باوجود ثبت ہیں۔ گھر اور دوروس تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ کسی بھی بچے سے بات کرنے کی جرأت کھو بیٹھے، پہلے سے بھی زیادہ مایوس اور دل شکستہ۔ ایک دوسرے سے الجھ کر بھر بوجھل قدموں سے چلتے واپس اپنے گھر پہنچ جاتے جس بچے کی قربت [illegible] کی خوشبو سے او وہی آئی لگتی [illegible]

جانا گیا؟ بھی ایک ایک کر کے بھاری دلوں اور سست قدموں سے واپس چل پڑتے۔ گرمیوں کی شاموں میں تو پورا گھر ڈر میں بسا ہوتا۔ رمیش نے سوچا میرا گھر کیسا خوشیوں کا گہوارہ تھا، لیکن اس شانتی نے میری پوری زندگی میں غلاظت کیوں گھر کر دی۔ ایک رات کہنے لگی کہ تم مجھے ہوشوں پر کیوں نہیں چھوڑتے۔ میں نے کہا کہ مجھے ایسا کرنا اچھا نہیں لگتا۔ کہنے لگی اس لیے کہ میں جھوٹ ہوں؟ میں نے جواب دیا چلو یوں ہی سہی۔ یہ سنتے ہی اس نے دونوں پاؤں میرے چہرے پر رکھ کر ایسا دھکا دیا کہ میں بستر سے نیچے جا گرا

رہی ہو۔ سمندر، گویی چندر، یوں میری سمجھ میں آ جاتا۔ یہ بول جی کا تعلق ان کی بہت پیچھے رہ گئی بچپن سے تھا۔ اب جنگ وہ محاذ جنگ پر جاپانیوں کے خلاف برسرپیکار تھا تو کیوں ان کی پیچھے پڑ گئی تھی؟ اسے پتا نہیں تھا کہ مجھے پرانی بھرپور محبت اور کوششوں کے کرنے سے سپرد کرنے کے لیے ایک بار بہت چاہتی ہو پھر بھی لوٹ کر میں آتے۔ سوالی جوابوں میں ان کی بیگی چادروں سے مطلب نہیں تھا، اسرار سانس کی مکھیاں تھے۔ اگر تو میں بھی ان اور وہ عجیب طرح یادوں سے الجھ کر دماغ میں مسلسل بگولے بنتے رہتے تو وہ وقت بھر کیا رہتا ہے کہ جب میرے اوپر کا یہ بھوت جسم اور دماغ سے مرکر کے گندے پانی کی طرح بہہ جاتا ہے اور وہاں صرف خس میں ایسے پر روس کی طلب باقی رہ جاتی ہے اور وہ بھی کبھی بھوک سے پوری نہیں ہو پاتی۔ اگر بھی ان [illegible] جھونسوں سے پوچھ کر دیکھو تو مجھ پر ایسے ایجاد کی۔ جیتی ہوں اور ان کے مطابق شہر کے بیچ کہیں پاس ہی سے بجلی گزرتی ہے۔ گندے پانی کی طرح ان کے باطن سے ہی جسم بنتی گندم کی سی گودام بنا ہوا کوئی ڈھونڈا۔ تیرا اسے کیا پتا کہ چمڑے رمیش اور اس سے پہلے کیا سب ان کے سے نجات کے لیے ہوتے ہیں؟ ایک دوسری طرف اور دوسرا کھوٹا جس کی ساری رات کی مصروفیت اور میل کی [illegible] رفتار بہت تنہا گئی اور اس کی یادوں میں تم ہو علم وغیرہ اور عقل و دانش کی بات پر ایسے کسی کی نبض مار کے اس کی ڈالی ہوئی ہیں [illegible] ہوتی نہیں سکتے۔ کبھی چھاؤں والے پر سہارے ہوئے جہاں بیٹھ کر بوڑھوں کو بڑی عجیب ہوئے لگ جیسے [illegible] کوشش سہارے ہوتے ہیں۔ سنگ رہتے کہیں اور ٹھوکتا ہوا سنگیت کی رمضان دوپہر کی مہک کو روس رہ گئی اور [illegible] تک سی ہو، میں کھڑی تھی، ان کی ہی سمجھانے صرف میں ان کی ایسی اندر سے ابھرنے والی بھی اور ایسے مارے ہوئے محکم محاذ جو جس کی قسمت کے سانچے اور سوچتی ہیں لوٹ کے بھی نہ آ سکے، بیوی محبوب جیسی ہیں نے بتایا پوچھا معلوم کیا وہ بھی صرف تمہاری پرارتھنائیں سنے لگی اور یہ سرحدوں تک وہ ان صورت کسی کو پکڑنے کا یار ہی نہ رہا، ان کے کان فقط سپاہی حکم سننے کے ہی وقف ہو گئے اور ان کے انگ انگ کو ان کی مانند صرف ان احکام کی تعمیل و تکمیل کے لیے پانچ رکھوں میں تو تو جیسی تک پروڈکٹ لینے لگیں۔ شکست کیا کہانی کہ [illegible]

[illegible] ظاہر نہیں ہو گیا خاندان کے علاوہ سارا علم و [illegible] انسانیت کی بہبود کے تمام امور بیکار کی چیزیں ہیں؟

ہرا سمندر، گوپی چندر، بول میری سمجھ کتنا پایا۔ یہ بول سے کچھ یاد دلانے کی کوشش کر رہے تھے یا محض محاذ جنگ اور دشمن کے استعمار کی ہوسیت سے گھبرا کر بچپن کی رعنائی میں پناہ کرنے ہو جانے کی آرزو کا ایک روپ تھا؟ سے یاد تھا جب رات کا کھانا

مجھے رکھنے پر [illegible] اور وہ بادل مختلف جوڑی [illegible] کہیں چلی گئی۔ وہ واقعی مجھ سے محبت
کرتی تھی اور پھر [illegible] رہی۔

گوریلا [illegible] جنگل میں ایک ایک دن اتنا بوجھل اور طولانی ہوتا گیا کہ لگتا تھا کہ کبھی نہیں گزرے گا اور [illegible] زندگیوں کے راستے میں کھڑا وقت کو [illegible] خلا میں معلق ٹھہر گیا ہے۔ [illegible] رینگتا ہوا [illegible] گزرتا۔ بوریت کا عفریت [illegible] بڑھتا جا رہا تھا۔ جنگ کے درمیانی گالی گلوچ اور [illegible] بوریت [illegible] شمولیت [illegible] جب پچھلے دن نظر آتا رہا تھا۔ تسلسل اور مغرب کی [illegible] چوٹیاں [illegible] [illegible] لپیٹ کر [illegible] [illegible] کبھی [illegible] ہوتے گئے۔ [illegible] جنگل کی [illegible] اور خطرے کی [illegible] [illegible] دھڑکنیں کی رفتار بدل دیتیں۔ مگر [illegible] دشمن کا انتظار کرنا ہی [illegible] بوریت میں جو [illegible] چلی جا رہی تھی۔ [illegible] دشمن سے لطف کو کسی سے [illegible] ہر ایک کا نام [illegible]

[illegible] بدن [illegible] جیسے سرخ رنگ، چھوٹے قد، گھنی بھنویں اور [illegible] [illegible] لاحق [illegible] [illegible] ساتھ [illegible] جا رہی تھی۔ [illegible] کبھی [illegible] اور جنگلی درختوں [illegible] [illegible] خطرے اور خوف کو [illegible] [illegible] علاقے میں رہتے تھے جو [illegible] [illegible] [illegible] باہر [illegible] [illegible] [illegible] دنیا میں [illegible] [illegible] ساتھ ہو جاتے ہیں جو [illegible] رنگ کو دیکھتے ہیں [illegible] طاقت [illegible] ہیں [illegible] کوئی [illegible]

جو کبھی بھی اور بستیاں بیرکوں ویران ہو گئی تھیں۔ تاریخ جب چڑھ جاتی ہے تو فطرت کی مانند جو بھی اس کے قدم کے سامنے جڑ جاتی تہس نہس ہو جاتا ہے۔ وہ کسی قاعدے اور اصول کی پابند نہیں ہوتی۔ ان میں سے ہر ایک یہی کہتا کہ وہ محفوظ علاقے کے شہر میں مزدوری کی تلاش میں جا رہا ہے ان سے دشمن کے بارے میں کبھی کوئی مفید مطلب اطلاع نہ مل سکی اور نہ ان بے چاروں کو کچھ معلوم ہی ہوتا تھا۔ گاؤں کیوں چھوڑ دیا؟ ان کا جواب ہوتا بمباری کے خوف سے۔

کیپٹن ولیمز میرا نیا انگلستانی سی او تھا اور اس رجمنٹ میں پہلی بار پوسٹ ہو کر شامل ہوا تھا۔ اس نے کمیشن سینڈہرسٹ سے لیا تھا اس لیے اس کے [illegible] سے کمیشن لینے والے ساتھی اس کی خصوصی تعظیم کرتے تھے۔ وہ رجمنٹ سے کوئی پانچ سال عمر میں بڑا [illegible] دبلا، لمبے قد کا، ملنسار طبع نوجوان تھا۔ [illegible] پڑھنے اور [illegible] سے پرندے دیکھنے اور ان کی عادات و خصائل کا مطالعہ کرنے کا شوق تھا۔ وہ اپنے مشاہدات کو فارغ وقت میں ایک کاپی میں درج کرتا رہتا۔ احکامات کی بجا آوری میں نہایت مستعد اور ایک ذمہ دار طبیعت کا مالک افسر تھا۔ مجلس میں بھی جچی تلی گفتگو کرتا، بڑھ بڑھ کے بلاوجہ بولتے رہنا اسے پسند نہ تھا۔ شراب پینے میں بڑا محتاط تھا اور بالعموم پوری شام ایک ہی گلاس پکڑے بیٹھا گزار دیتا۔ غیر شادی شدہ تھا۔ لوگ جب اپنے اپنے حالات کے بارے میں جذباتی باتیں کرتے یا خودترحمی کے انداز میں گفتگو کرتے جس میں ہندوستانی افسران پیش پیش ہوتے، تو خاموشی سے بیٹھا سنتا رہتا۔ خودترحمی اس کو [illegible] ناکامیابی کا اعتراف ہی نہیں، بلکہ خود کو سزا دینے کا ایک انداز بھی تھا اور اپنے عزیزوں کی بے محابا جذباتیت کا اظہار کرنا اپنے ذاتی معاملات کو پبلک کرنا تھا۔ سرسری نظر میں محسوس ہوتا جیسے اس کے دل کی جگہ برف کا ٹکڑا رکھا ہے جس میں کوئی نام کو نہیں۔ رجمنٹ کو وہ [illegible] لگتا تھا۔ اس کے لیے [illegible] رجمنٹ کا انداز رجمنٹ کے لیے اگرچہ اوپرا سا تھا لیکن وہ اپنے باپ کے حوالے سے اسی صرف بڑھاپے کی خصوصیت شمار کرتا رہا تھا۔ یہ بات [illegible] حیران کرتی کہ جو شخص عام زندگی میں بوریت کا شکار نظر آیا کرتا تھا اب جب کہ ہر طرف بوریت کا دوردورہ تھا تو ویسا ہی نارمل تھا جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنی باتوں میں اسی طرح دلچسپی سے مصروف رہتا۔ جنگ کا دوسرا نام موت ہے، اور جب جنگ کا انتظار مہینوں پر پھیلا ہوا ہو اور انتظار کے مہینوں کا ایک ایک لمحہ زندگی اور موت کی کشاکش میں کٹ رہا ہو تو انسانی برداشت جواب دینے لگتی ہے۔ رواداری اور پیار ختم ہو جاتے ہیں۔ بدمزاجی عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ لوگ بات بے بات ایک دوسرے سے لڑتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، مارپیٹ کرتے ہیں۔ جنگ کے انتظار اور موت کے خوف کے باعث یونٹ کے افسروں میں بھی نفسیاتی الجھنیں تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک بہ کثرت سے شراب پینے میں اپنی [illegible] پناہ ڈھونڈتی تھی۔ ولیمز پر ان حالات کا کوئی اثر نہ ہو

رمیش خاموشی، خوف، اداسی اور بےبسی سے مجبور ہو کے اس کے ساتھ میں چلا جاتا۔ اس کے ساتھ جنگل میں مقررہ حدود کے اندر پیدل گھومنے نکل جاتا۔ دنیا بھر کی باتیں کرتا رہتا، ہر طرح سے سمجھاتا۔ وہ جب جب اس کی پرندے دیکھنے کی چاہ میں دلچسپی لینے لگا۔ ولیم کے مطابق رمیش ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکا تھا۔ وہ جب سے سکول کی شرارتوں، اور عزیزوں کے لیکچروں کو چکر دیتے اور کلاس فیلوز کے ساتھ لڑنے اور بازاروں میں گھومنے کی کہانیاں اور ماں باپ کے کبھی نہیں جاننے سے پیار (جو ملازمت کے بعد سے زیادہ بڑھ گیا تھا)، ماں سے محبت، شادی سے متعلق خیالات کہیں۔ کملا سے منگنی وغیرہ سب قصے سن چکا تھا۔ ایک دوپہر ولیم نے اسے دوربین سے شاہ بلوط کے ایک گھنے درخت کی ڈال پر مرغِ زریں کا ایک جوڑا بیٹھا دکھایا اور کہا کہ تم نے مور کے علاوہ اس سے زیادہ خوبصورت پرندہ شاید زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔

اس نے دوربین سے دیکھتے ہوئے جواب دیا "ہاں، یہ بہت خوبصورت ہے۔ واقعی بہت خوبصورت ہے۔ اس کے سر پر جو سنہری کلغی ہے اور ... جیسی دم کا جھومر ہے ... اس میں بہت سے رنگ اور ہر رنگ ایسا جیسے مختلف قمقموں کے چمکتے ہوئے ستارے ہوں۔ ساتھ میں اس کی مادہ بیٹھی ہے؟"

"یہ نر رنگ، مادہ کی خاطر ہی تو ناچ رہا ہے۔ آج کل ان کے ملاپ کے دن ہیں۔"

رمیش نے دوربین ہٹا کے ہنستے ہوئے کہا "مادہ نر کے مقابلے میں بہت بدصورت ہے۔ رنگ کی ایک عام سا پرندہ ہے، کوئی دوبارہ دیکھنے کی خواہش نہیں کرے گا۔"

اسی طرح ہنستے ہوئے رمیش نے پھر دوربین آنکھوں سے لگا لی۔ ولیم نے کہا "لیکن مادہ خوبصورت نظر آنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ نر اسے لبھانے کی کوشش کملا موجود

رمیش کہنے لگا "اب اس کی چونچ میں چونچ ڈال دی ہے۔ گویا چوم رہا ہے۔ بیوقوف کہیں کا، ہم جنس کی موجودگی کی پرواہ نہیں کر رہا ہے۔"

"مادہ فطرت، ہمارا ہر جنس نہیں صرف مثالی پرندے ہیں۔ اس لیے ان میں خلقی کوئی جھجھک نہیں۔"

اچانک رمیش نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا جس پر ولیم نے کہا، "آہستہ رمیش، اگر تم فرشتہ ہو تمہارا اور سب کا ہم سارا دوست ہمیشہ میں پہنچ جائے گا۔ یہ شرمیلا پرندہ ہے اور انسانوں سے خائف رہتا ہے۔ خواہ مخواہ اس کا لطف کیوں غارت کریں۔"

رمیش نے دوربین آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے افسردگی سے کہا "تم ٹھیک کہتے تھے وہ از

سفید، پیلے اور گلابی پھولوں کی اٹھ اٹھ دو دو فٹ اونچی، جوڑے جوڑے پتوں والی جھاڑیاں ہر چہار طرف پہاڑیوں پر اگی سبز سبز گھاس پر پھیلی ہوئی تھیں۔ دوپہر میں ان کی ہر خوشبو سے پورا جنگل مہک رہا تھا۔ ولیم نے ... یہ ... ہی ... جھاڑیاں دراصل مصطفیٰ جبرہ کی باسی ہیں جنکی یہاں جڑیں ... ہر وسط ... پھر میں سب سے زیادہ ہی تو حوصلہ کر کے اس بلندی تک بھی چلی آئی ہیں۔ رمیش جھاڑیوں سے مختلف رنگوں کے پھول توڑ توڑ کر اپنی مٹھی میں جمع ... وہ ... ولیم کو ساتھ بھی سنتا جا رہا تھا۔ وہ دونوں پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے بستی کی طرف واپس چل پڑے۔ راستے میں انہیں ایک جھرنا ملا جو پہاڑیوں پر پانی کے کنستر نیچے وادی کی ندی میں سے بھر کر اوپر لا رہے تھے۔ ولیم کہہ رہا تھا "لگتا ہے جیسے فطرت کو ایک جنون ہے زندگی کو قائم و دائم دیکھنے کا، اور اپنی اسی دھن میں اس نے ہر ذی حیات کو جنس کی چابک لگا رکھی ہے۔ سب حیوانات اور اپنی اپنی نسل کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور پھیلانے کی دھن میں مصروف ہیں۔ پودے، پرندے، چوپائے، کیڑے، مچھلیاں، انسان، سب کو ہی ایک لگن لگی ہوئی ہے۔ جنس فطرت کی تمام تخلیقوں میں سب سے خوبصورت تحفہ ہے۔ شاید اس لیے بھی زیادہ خوبصورت بنا دیا گیا ہے کہ فطرت کے پوشیدہ منصوبوں کی تکمیل میں مخلوق کی طرف سے کسی رکاوٹ کے حائل ہونے کا امکان کم سے کم رہے۔ مگر تمہارا کیا خیال ہے رمیش؟"

ہاں، وہ جنس کو متلوِّع کر دینے والا، جھکڑ کی طرح تیز جذبہ ہوتا ہے۔

ولیم بولا، "طاقت ور مردوں نے عورتوں کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے اور جائیداد کو اپنی نسل میں محفوظ کرنے کے لیے اس تیز جذبے پر پابندیوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور صدیوں سے اس پر جو تلے دبے دبے ہی کہ ذہن اس کیفیت کو پہنچ گئے ہیں کہ جنس کی بات پر عام آدمی پھیکی پھیکی ہنسی ہنس کر چپ ہو جاتا ہے، حالانکہ اس میں شرمندہ ہونے والی تو کوئی بات نہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

رمیش نے کہا "تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو کہ دیکھو ... سے کہیں تو ختم ہونا چاہیے۔

"صرف فریقین کی پسندیدگی ہو۔ رمیش! تمہیں اپنا پہلا جنسی تجربہ یاد ہے؟"

"نہیں تک ضمیر کی کچوکیں نے ہی جیسا جرم کیے رکھے۔"

"تمہاری بات دوسری ہے۔ تمہاری دوست اچھوت تھی اور تم نے ہندوستان کی ہزاروں سال پرانی بندھی ٹکی سماجی بندشوں کی جو خلاف ورزی کی وہ ہر طبیعتی کا سبب ہی تھی۔"

"نہیں ہندوستان کی پوری چالیس کروڑ آبادی کی یہی حالت ہے۔ شادی کے رشتے سے باہر جنسی تعلق پر ہر ضمیر چبھتا ہے۔"

"یہ انگریز یا ہندوستانی کا مسئلہ ہرگز نہیں۔ جہاں جہاں بھی شادی کا نظام ہے جو

کہ پوری طرح نہیں ہے۔ یہ کیفیت کم وبیش ضرور پائی جاتی ہے۔ تم میرا سوال نہیں سمجھیں۔ میری مراد جنسی تجربے سے، اس لمحۂ خاص کی جنسی عروج کے وقت کی فوری کیفیت سے ہے۔"

ہاں وہ کچھ ایسا تھا جیسے کئی صدیوں کا پیاسا جی بھر کر پانی پیے۔ گویا میرے اندر کی ساری تضادات ایک دم ہی حل ہو گئے تھے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی ساتھ مکمل طور پر پورا ہونے کا احساس اجاگر ہو کر سامنے گھوم گیا۔"

میں اس سے بھی اہم پہلو کی بات کر رہا ہوں۔ سنو۔ میری ایک دوست تھی۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بہت پیار تھا لیکن اب بھی ہے۔ ہماری خط و کتابت چل رہی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان دکھوں کا میرے پاس جمع ہیں۔ میں نے اس لمحۂ خاص میں جو تاثرات اس کے چہرے پر مشاہدہ ہوئے مجھے خود میں دیکھے۔ تم نے کبھی پیدائشی پاگل دیکھے ہیں؟"

بہت دیکھے ہیں۔

جیسی ایک خاص حالت موسموں کی، جس جواب ہر وقت ان کے چہروں پہ لٹکی رہتی ہے ویسی ہی پاگل پن کی جواب اس وقت اس کے چہرے پر لٹکی ہوئی تھی۔ اس کا نچلا ہونٹ ہلا کسی خیال کی بنا ہوا تھا۔ جبڑے بیکار تھے۔ منہ سے لعاب بہ کر گالوں تک آ گیا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ ... سکتے ہوئے تھیں۔ اس کے چہرے کی جلد سلوٹوں بھرے کپڑے کی طرح ہو گئی تھی۔ ... اتنی گہری نہیں کہ لی جا سکتی تھیں۔ لگتی فطرت اپنے مقصد کی خاطر ... ہمارے ... اور وہ دیکھنے میں پوری لگ رہی تھی جیسے موت قریب سے گزر رہی ہو۔ رمیش، کیا تمہیں اپنے پہلے جنسی اختلاط کے دوران شانتی کے اور اپنے چہرے پر پیدا ہونے والے تاثرات یاد ہیں؟"

"ہم اندھیرے میں ملے تھے، اور ہمیشہ اندھیرے میں ہی ملتے رہے۔"

رمیش، ... وقت میں میرے چہرے پر بھی ویسی ہی جواب ہو گی پیدائشی بیوقوفوں جیسی، احساس جو کچھ کہ بنیادی طور پر وہ ہے ... لمحات یعنی موت اور جنسی لذت کے عروج پر ... لگتا ہے۔ شدید تخلیق اور فنا دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ شے کے سامنے کھڑے ایک ہی چیز ہے۔ جنسی تجربے اور لمحۂ جانکنی دونوں کا ایک ہی ... ہے۔ عالم جذبہ لیکن کسی ... روح کو ان دوسرے سے صرف ایک ہی بار گزرنا ممکن ہے۔ اس میں کوئی دوسری بار نہیں۔"

رمیش نے کہا "کچھ عشرے ایسی ہیں جن سے گزرتے ہوئے موت زندگی سے بہتر نظر آتی ہے۔ ناکامی کیا ہے؟ اپنی اور خاص طور پر دوسروں کی توقعات پر پورا نہ اتر سکے۔ مجھے ... توقعات ... سے بڑی ... یہ بھی اسی فساد کی صورت ہے۔ میرے اور شانتی کے تعلقات میں ایک ہی ... تھی کہ ہم دونوں کے درمیان توقعات کا کوئی ... نہ تھا۔"

ملہوترہ نے کہا "رمیش یہ تمہارے باپ نے اپنی توقعات کی تکمیل پر ضرورت سے زیادہ

اصرار کیا ہو، لیکن جائز حد تک توقعات تو زندہ ہونے کا صحیح احساس کے لیے بہت ضروری ہیں۔ شانتی تم سے اصولی ملاقات میں کبھی رو رہی تھی؟ یہ توقعات کی ناکامی پر جو وہ تم سے لگائے بیٹھی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے ... ذکر نہیں کیا۔ یہ پر کبھی اصرار نہیں کیا۔ ہندوستان کے معاشرے میں وہ بالکل غیرمستوقع ہیں۔ اگر وہ روتی بھی نہیں تو شاید تم اس تعلق کو بڑی حد تک اپنے ذہن سے محو کر چکے ہوتے۔

کیپٹن ویمر شام کو میس میں ملنے کا پروگرام بنا کر رمیش کو خدا حافظ کہہ کر اپنے خیمے میں چلا گیا۔ رمیش کرنل چھکٹی، سوچ میں ڈوبا آہستہ آہستہ اپنے خیمے کی طرف چلا۔ یہ بول پھر کہیں سے ... ہو کر اس کے ذہن میں بجنے لگا، ہوا سمندر، کویی چندر، ... میری سمجھ کتنے پانی۔ اس نے مغرب کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ ... کی چوٹی پر شاہ بلوط کے ... درختوں کے پیچھے سورج کے نور کا سیلاب امڈا ہوا تھا۔ درختوں کے گھنے پتوں اور شاخوں کی ... چمن کے پیچھے سے کرنوں کی ... جھن جھن کر نکل چلی آ رہی تھیں۔ اس نظارے کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کے ذہن نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ وہ حیرت کے علاوہ اس ... کے ... پر اپنا کوئی ردعمل کسی نادر خیال یا مخیل کی اڑان یا کسی جسمانی عمل کی صورت میں کر سکے۔ اسے کچھ نہ سوجھا۔ ٹھیک کو اسی سوچ پر قناعت کرتے ہوئے اس نے وہاں سے توجہ ہٹائی کہ چلو ایک اور ... انجام کو پہنچا۔ ... ایک دن اور کم ہوا۔

ملگجا سا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ رمیش سفید قمیص پتلون پر چوڑا سیاہ ریشمی کمربند باندھے، کلکتے سے خریدے گئے نئے چمکدار سیاہ بوٹ پہنے میس کے سامنے دائرے میں بچھی کرسیوں کے قریب پہنچا تو نوجوان ویٹر نے بتایا "سر! کرنل صاحب آج جلدی آ گئے تھے، اندر خیمے میں بار پر کھڑے ہیں۔ تین چار افسر بھی ان کے ساتھ میں ہیں۔" اس نے پوچھا، "ادھر کیپٹن ویمر ہیں؟"

"جی سر ہے۔"

رمیش نے تین قدم کے فاصلے پر واقع بار کے خیمے کی طرف قدم اٹھایا ہی تھا کہ دیکھا کرنل صاحب ہاتھ میں گلاس پکڑے خیمے سے باہر نکل رہے ہیں۔ اس نے ایک بار وہیں اٹن شن کھڑے ہو کر بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ کرنل نے ہاتھ اٹھا کر اس کی ... کا جواب دیتے ہوئے پوچھا، "واٹس اپ یو ... ٹوڈے؟"

رمیش نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کے پیچھے سنسنی کی آواز آئی اور خالی کرسیوں کے دائرے کے درمیان میں دشمن کی توپ کا گولا پھٹا۔ رمیش گولے کے پیداکردہ چار فٹ گہرے گڑھے کے اندر تھا۔ اس سے بات کرنے والے بیرے کی لاش کے ٹکڑے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ کرنل اور اس کے ساتھ کھڑے افسر زمین پر اوندھے منہ لیٹ کر تیزی سے رینگتے ہوئے خندق میں جا گھسے۔ رمیش کی ایک ایک کا نام لے کر پکارتی ہوئی گھبراہٹ بھری صدائیں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ کرنل صاحب، ویمر، موہن سنگھ، حمید

Scanned with CamScanner

"مجھے ساتھ لے جاؤ۔ مجھے اکیلا نہ چھوڑو۔ میں مر جاؤں گا۔" اس کی کسی صدا کا سوالی گولیوں کی آوازوں کے کوئی جواب نہ آیا۔ گڑھے کے چاروں طرف پھٹتے ہوئے گولوں کی آواز کے ساتھ ہلکی بلند دھماکے تڑ تڑ سے تو پھر جگمگاتی روشنی بھڑک کر ابھرتی اور مٹ جاتی۔ ایک عجیب دھوپ کا سا سماں تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں اڑ گئی تھیں۔ وہ گڑھے میں اسی طرح جامد ہو کر رہ گیا تھا جیسے لکڑی کی تختی پر پن سے گڑی پر ہلاتی تتلی۔ گھٹنوں سے نیچے دونوں ٹانگیں غائب تھیں۔ گو کہ نہ بولوں سمجھتے۔ مگر وہ خود یہ نہیں جانتا تھا۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ کوشش کے باوجود اٹھ نہیں سکتا اور اس کا پورا بدن جو کبھی لطف کا مدار رہا تھا اب درد کا پھوڑا ہے جو پتا نہیں کہاں سے چلتا ہے مگر اسے معلوم ہے کہ ختم کہیں نہیں ہوتا۔ اس کے بدن کی ریشے ریشے کو گیلا ہر تہہ جیسے دھوئیں سارے میں بکھر جانے کی حد تک پل پل ہی میں جا رہا تھا۔ وہ درد کی شدت سے سارے گڑھے کی کیس [illegible] میں ٹوٹ رہا تھا۔ وہ بار بار ہمت کر کے کہنیوں کے بل پیٹ کو اونچا کر کے اپنے ساتھیوں کو پکارنے لگتا۔ اس درد کے باوجود حیران تھا کہ محض ایک سیکنڈ میں سیکڑوں بار کی رفتار سے ذہن پر حملہ آور ہوتا۔ موت آ گئی۔ موت آ گئی۔ ایک کوہ سوال دوہراتا جا رہا تھا۔ کس حد تک؟ کتنی حد تک؟ کہیں سرگوشی تو زہر بھی قریب، قریب۔ اس کے ذہن میں بیک وقت بہت سی لہریں چل رہی تھیں۔ ایک دوسرے میں الجھی اور ہر ایک خودمختار۔ اس کو بعد میں [illegible] موت کی فرصت سے سرشار ہو گیا تھا۔ گو یہ درد ایک ایسی خودمختار [illegible] کی مانند جو ہر عکس سے [illegible] ہو۔ ایک لمحے کے لیے اس کو موت جانے کی حرارت نہیں ملتا تھا۔ لیکن پھر بھی کچھ مربوط ایک دوسرے کے اوپر بار بار [illegible] کا ریلا تھا۔ [illegible] میں بھائی [illegible] کی کروں شبیہیں تھیں۔ [illegible] ساتھیوں کے [illegible] کا افسوس تھا۔ [illegible] لگتا۔ [illegible] والا نہیں۔ صرف اس کی اندر ایک [illegible] کی طرح [illegible] میں مر جاؤں گا؟ [illegible] تھا۔ پھر اس نے ساتھیوں کو پکارنا بند کر دیا۔ تقدیر کو قبول کر لیا۔ موت کو تسلیم کر لیا۔ [illegible] چھوڑ دیں۔ شاید جسم میں سکت نہ رہی تھی۔ سر زمین پر رکھ دیا۔ سامنے بکھرے [illegible] باتیں کرتے ہوئے جیسے چنچل ستاروں کا ایک لامتناہی جھمگھٹا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ درد بھی اب کچھ تھم گیا تھا۔ [illegible] سمجھتا کہ اب اس کے سرہانے آ بیٹھا تھا اور اس کے [illegible] کی جگہ [illegible] اس کے [illegible] کو اپنے سیاہ ہاتھوں میں [illegible] پوچھنے والے نے مترنم آواز میں جھک کر پوچھا [illegible] کا جواب تھا کہیں کہیں

خالدہ حسین

پاسپورٹ

لُبّو کی موت کا واقعہ ایک مدت تک نئے آنے والوں کو سنایا جاتا رہا۔ ایسے میں آسمان یکدم چپ سادھ لیتا۔ اس میں تیرتی چیلیں ساکت ہو جاتیں اور درختوں کی شاخیں جھک آتیں۔ سارے میں کچھ نارنجی مائل روشنی پھیلتی محسوس ہوتی اور ایک لق و دق میدان، کہ جس کا اور نہ چھور۔ اس کی آنکھ سامنے کھلتا، چھپ جاتا۔ بڑا مانوس مگر گم شدہ اسے اپنی باہوں کی روئیں ٹک ٹک اٹھتی محسوس ہوتی۔

لبو بے حد ڈی کلاس کتا تھا کہ خودبخود گیٹ پر آن بیٹھنے لگا۔ ایک بار تاؤجی نے سوکھی روٹی کا ٹکڑا ڈال دیا۔ پھر وہ اپنے مقررہ وقت پر آ کر وہاں بیٹھ جاتا اور انتظار کھینچتا۔ پھر ایک روتی ہوئی آواز گلے سے نکالتا۔ گویا نہ کوئی بھی کبھی روٹی لے کر دوڑتا۔ پھر اس نے ایک ایک قدم حدود کو توڑنا شروع کیا۔ دھیرے دھیرے اس کا سب برامدے کی سیڑھی ہی کیا۔ اب تاؤجی دودھ پانی میں روٹی ڈال کر دینے لگے اور برابر کی سطح پر اس سے مکالمے کی رسم ڈالی۔

"لو، کہا ہے آج تیری دعوت ہے۔ لو، بھئی، یہ چیچڑ کہاں سے لایا بڑا آوارہ مزاج ہے بھئی، ہیں؟" اب وہ چٹکی سے اس کی بھوری کھال صاف کرتے نظر آتے۔ ایسے میں وہ اپنا [illegible] سر ان کے پاؤں سے رگڑتے جاتا۔ [illegible] دم پنڈولم کی طرح ہلتا رہتا۔ پھر وہ [illegible] کے اندر [illegible] کئی دنوں معدوم ہو کر آوارہ کتوں کو مارنے کی مہم دوڑی ہوئی ہے، میونسپلٹی کی گاڑیاں سڑک کنارے پڑے مردہ کتوں کو لاد لاد کر لے جاتی تھیں۔ تاؤجی نے اب ایک سستا سا چاکلیٹی رنگ کا پٹا لبو کے گلے میں ڈالا۔ دراصل اس پٹے کے بعد ہی اس کا نام لبو پڑا۔

اس کی آوارہ مزاجی سے تنگ آ کر تاؤجی نے اسے زنجیر کرنا شروع کیا۔ ہوتے ہوتے وہ تاؤجی کے معمولات کا حصہ ہو گیا۔ دن کا اکثر حصہ لبو بندھا رہتا۔ عصر کے بعد تاؤجی مسجد سے لوٹتے تو اس کی رہائی ہوتی۔ کبھی کبھی لبو چھلانگیں لگاتا۔ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر شیطان بلا بلا تاؤجی کے گلے تک پہنچ جاتا۔ ایسے میں [illegible] ڈرائنگ روم کی جالی کے دروازے سے لگ کر کھڑے ہو جاتے۔ تاؤجی نہایت درشت لہجے میں سمجھاتے۔

"او یارا یوں نہیں کرتے۔ شاباش! چل ذرا گھوم پھر آ۔ جا۔" وہ دم ہلاتا گیٹ کی طرف

Scanned with CamScanner

چل دیتا۔ اس جیسے والوں سے سختی سے بولنی لی۔

"کٹ پال لیا ہے۔ سجنی جانور ہے۔ اس گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آئیں گے جہاں کتا ہو۔"

رحمت کے فرشتوں کے نہ آنے پر "کہتے ہیں" تاؤجی سہانت سنجیدگی سے اطلاع دیتے۔

ڈھو کے اس سے سا مسرور ہو کہ تقریباً گھنٹی بجا کر مانگنے والے اور گھروں کے پتے پوچھنے والے بالکل غائب ہو گئے۔ اس کی سہولت پہلے سے ٹوٹی پر اطلاع دے دیتی۔ "ہم آ رہے ہیں۔ وہ تمہارا ڈھو نام تو نہیں پوچھے گا؟"

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ کمزور، لٹ کلاس ڈھو خوشحالی کیا کیا کہ خوب فربہ ہو گیا تھا اور اس کی کھال سنجیدگی کی مانند چمکنے لگی تھی۔ اس کی سرخ لگی سکھیں روشنی چمکتی۔ پہلے میں عربی مرکا سمجھ داری سے ہر ایک کو دیکھتیں اور بات بات کی سن گن لیتیں۔ روز ور یہ سا ہو گیا تھا کہ اکثر تاؤجی کے کندھوں پر آتا۔ لاکھ زنجیر کھینچیں یہ کو بھی گھسیٹ لے جاتا۔ عجیب عجیب طرح کی وارفی سکانا اس کا مشغلہ بن گیا تھا۔ جس روز وہ زیادہ بدتمیزی فرماتا، تاؤجی اس کی پابندی کے وقت میں اضافہ کر دیتے۔ وہ مالی کو حکم دیتے "آج اس کو پہنچ میں ساڑھے پانچ کھولنا۔"

اور پھر آج ہو تاؤجی کو مزاج کر دیا۔ کمرے میں ٹھیرے" مالی نے سیاہ چمکتے چہرے پر کی دیسی لمبی لمبی سکھوں میں پسند۔ جس پہلے روز فریدہ نے مالی کا نام سنا تو اس کا چہرہ غلاموں کی طرح تنگ ہو گیا تھا۔ بڑی باجی مالی سلیم کو کو ناونڈی کے کھلی رکھنے کی ہدایات رہی تھیں۔

"یہ تمہارے مالی کا نام سلیم ہے؟" اس نے نہایت رنجیدہ بلکہ رحم خوردہ ہو کر پوچھا۔

"کوئی اچھا سا نہیں۔"

"سا چھا نام اور مالی یہ آیا کہاں سے ہے؟"

"معلوم نہیں۔" اور واقعی انہیں کچھ معلوم نہ تھا۔ یہ جنوبی افریقہ سے بدحال سے مہاجرین کسی ٹھکانے، سرونٹ کوارٹر کی تلاش میں گھر گھر گھومتے پھرتے۔ مالی سلیم اباجی کی نظر پہنچ گیا تھا اور وہاں سے گھر، ختم اور گھر دوسرں جگہ مالی گیری کرتا۔ خاک باغ کی سالہ سالہ کو زمروں کی لمبی قطار بھی۔ تعداد میں کل نہ کرتے یاں نہیں۔ ایک ادھ کے سوا سارا بنگلہ جس کے فرش والی، ابھی میں کوارٹر خالی پڑے تھے۔ ایک میں مالی سلیم آ جما۔ وہ بیچ تھے، پوریں۔ تاؤجی جب موڈ میں آتے تو سے پوریب کا بھیا کہہ کر پکارتے۔ روزانہ صبح سویرے جب سکول میں بستے کے لیے وہ سڑک پر نکلتی، مالی سلیم انتہائی سفید جھکتے کپڑے پہنے ہاتھ میں سلور کا ٹفن کیریر پکڑے، کام پر جا رہا ہوتا۔ تنگ مُہری کا پاجامہ، کرتہ اور عمدہ سا سر پر ٹوپی اور جھکتے جوتے۔ وہ ہرگز مالی نہ لگتا تھا۔ جب کو رونق کے عرصہ میں شکنے بجورتے کے چھپر میں آنا جانا ہوتا تو مالی سلیم کی کوٹھری

سے الگ صاف ستھری چمکتی نظر آتی۔ فرش کی سرخ اینٹیں انار کے دانوں کی طرح چمچماتیں۔ ایک طرف چارپائی پر کالا سفید ڈبےدار کھیس بچھا ہوتا۔ سامنے دیوار میں بنے طاق پر جگر جگر کرتی ایلومینیم کی پتیلیاں اور بھورے پھولدار پیالیاں۔ سب حیرت ہوتی مرد بھی اتنے اچھے برتن دھوتے ہیں۔ اور جھاڑتے پھر وہ گھوم کر دیکھتی۔ مالی کھر کی دھوتی اور صدری پہنے، کھرپی لیے کیاریاں کھود رہا ہوتا۔ ہاتھ مٹی میں سنے ہیں۔ یہ پہلے مالی سے کتنا مختلف تھا۔ وہ چھوٹے سے قد اور گٹھے جسم کا بھرکی کی طرح گھومنے والا مالی پانچ منٹ میں ناچتے کرتا۔ پودوں کو کتنا کتنا پانی دیا۔ اور سلسلہ پر یہ جا وہ جا۔ ہرے بھرا یہ اس کی فوارے پر سفید پیٹ میں "آئی ہمیری" نکھر دیا تھا۔ اگلی ہی روز وہ بھوری کی بدتمیزی کا عذر کر کے چل دیا۔ مگر یہ مالی سلیم زمین پر کیسے جمے جمے قدم ڈالتا۔ اس کی ہر حرکت میں ترتیب کا احساس ہوتا تھا۔ اسے فریدہ کا سوال پھر یاد آ گیا۔ یہ ہے کون؟

بھوری کرسمس کی ... ... کمرے کی کھڑکی سے جھانکتا۔ مگر سامنے تو کیشے کی باڑھ آ جاتی تھی۔ جب کمرے اندھیرے کیے سو رہے ہوتے تب وہ جھکے سے دروازے کی چٹخنی گرا دیتی اور سڑک گھاس پار کرتے کرتے اس کے لتوے چلچلانے لگے۔ مالی کے کوارٹر کی دہلیز پر مٹی کا دھانی دوپٹہ اوڑھے ایک سانولی سی عورت بیٹھی چھنکیاں لے رہی تھی۔ اس کی پتلی، لمبی چوٹی کمر پر ہلکورے کے ساتھ لوٹ جاتی۔ باہوں میں ہری اور بسنتی کانچ کی چوڑیاں، سیاہ لمبے بال، سیدھی مانگ۔ وہ حیرت سے کھڑی دیکھتی رہی۔ مالی غائب تھا۔

شام کو تاؤجی نے بتایا "مالی سلیم کی بھتیجی ہے۔ اس کا آدمی ہندوستان میں تباہ گزر گیا۔" ایک دم اس کا دل ڈوب گیا۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟ اس نے حیرت سے سوچا۔ کچھ ہو گی دھر کچھ دھر نسی دور اس کی سکھوں میں سبی چپ کھڑ ور سبز چوڑیاں نہ ہم کبھی اب شاید یہ اپنی چوڑیاں توڑ دے گی۔ تو پھر سلیم کی لڑکی کہاں ہے؟ وہ تب کون ہے؟ شاید اس کے سب عزیز بھی انقلاب میں ہیں۔ وہ ایسا سب کچھ کر رہا ہے؟ اور پھر وہ اس کے نام پر ششدر رہ گئی۔ فریدہ کا سرخ چہرہ ہاں کیا معلوم یہ کون ہے۔ بڑی جمے جمے کر قدم دھرنے والا شہزادہ سلیم، یہ دنوں الحمرا میں انارکلی ڈراما سٹیج کیا جا رہا تھا۔ صاحب عالم، مہابلی، شیخو۔ دلآرام دھمدموں میں ہم نہیں اب میر مانگو جس کی۔ ایے عشر بس ہو چکی۔ اب تیرے ہندوستانی کی۔ غدر کے افسانے شہزادی کی بیتا۔ اس کا ستور بھٹکتا چلا گیا۔ مالی کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اسی طرح سفید براق کپڑوں میں، چمکتا ٹفن کیریئر اٹھائے گم ہو جاتا۔ کیاریوں میں بیج ڈالتا، فوارے سے پانی دیتا۔ اور سورج پھر اس کے کوارٹر سے کسیلا دھواں بل کھاتا، کیشے کی باڑھ کے پار اُڑتا۔ ور گول گول لہراتا فضا میں تحلیل ہو جاتا۔ لان کے پار کرونوں کے ساتھ ساتھ عجیب منہ بہار تھی۔ اب یک

Scanned with CamScanner

صحن میں کا تہخانہ تھا۔ اسی بیری کے ساتھ باندھا جاتا تھا۔ گرمی میں بوری بچھی کا [illegible] ساتھ والے کوارٹر میں مرغیاں اور بورے ملی جلی۔ اور پھر آگے صحن کی تیکھی، [illegible] جو طرف شام میں جیم کھلاتا تھا۔ اور مالی پھر [illegible] فصل جیسی جو [illegible] اپنے [illegible] بجایا کرتا۔ شام ڈھلے کو رنگوں سے چارپائیاں پھر نکالی [illegible] مالی [illegible] کی چھوٹی سی حقی پیتا چند منٹوں میں وہ [illegible] وہ انگلیوں کی جھرجھری سی جب کر منہ کی قریب لے جاتا۔ گڑگڑ [illegible] اور پھر [illegible] ڈھواں۔ [illegible] ہو جاتے میں [illegible] کمرے میں لالٹین روشنی ہو جاتی۔ [illegible] اور [illegible] ایک [illegible] نارنگی [illegible] پاس [illegible] کی [illegible] معلوم ہوتی کی صدائیں [illegible]

وہ شدید گرمی کی شام تھی۔ [illegible] ابھی ابھی عصر کی اذان [illegible] ہو رہا تھا۔ جیسے میں [illegible] پورے جسم میں [illegible] [illegible] شام کی چائے لگا رہا تھا۔

[illegible] چائے پر چسچی کی [illegible] رہی تھی۔ کہ اچانک سڑک پر تیز [illegible] [illegible] اور پھر [illegible] سڑک [illegible] گھر ہی میں [illegible]

[illegible] ساتھ۔ ناوجی ہاتھ میں کوئی زنجیر لیے [illegible] ہاتھوں سے باندھا تھا۔ انہوں نے [illegible] انگلیوں سے سڑک کی [illegible] کناروں سے سرخ ہو رہا تھا۔ پھر [illegible] مالی حقی گڑگڑاتا۔ ناوجی کی [illegible]

مگر ناوجی میں نے کچھ دیکھا [illegible] ساتھ بندھا تھا میں ادھر [illegible] [illegible] کسی [illegible] جو ایسا [illegible] [illegible] ہاتھ سے زنجیر کھول [illegible] کی طرح بھاگ [illegible] اور [illegible] گرمی کا [illegible] [illegible] کس کی [illegible] ٹھوکر [illegible] مجھ کس نے ٹھوری؟

[illegible] جھجھک [illegible] ایک کا رفت طاری ہے۔

[illegible] سر پر ڈھرکے [illegible] خودبخود اپنی جگہ پر کھنچا [illegible] کا کب کرتا ہے۔

انہوں نے زنجیر ایک طرف ڈھیر کر کے پھر اٹھائی۔ سب الٹا پلٹا، پھر پڑھا۔ "خودبخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دل تھی۔ سن فولاد سے شاید مرد شمشیر تھی۔" مالی [illegible] میں شرمندہ پشیمان بیٹھا حقی گڑگڑاتا ہے۔

اب مالی کی بھانجی اکثر آنے جانے لگی۔ اس کا سانولا دبلا پتلا چہرہ پہلا پر جھکا تھا۔ کبھی کبھی وہ ٹین کو کھڑکے دھوپ والی صاحب کی لنگیا نظر آتی، جو جب چاپ کھلی چلی جاتی ہے۔ سردیوں کی آغاز میں کھب اٹا۔ خالی کوارٹر میں روٹی دھکتی جاتی۔ پھر چھت تک روئی کے گالے برف ایسے سفید، پہاڑ سا جیسا چلا جاتا۔ اور [illegible] دھنے۔ برابر کی چھوٹی چھوٹی آوازوں کے بعد ایک ترچھی پری چوٹے دھنیا مالی کا ہم وطن ہوری تھا۔ اس کی وہ لمبی سی کمانی مہارت سے چلتی رہتی۔ لحاف بھرے جاتے۔ روئی کو چھوڑ سے برابر کیا جاتا۔ ہلکی ہلکی چوٹ سے کنارے کنارے روئی پھیلائی جاتی۔ اور پھر مالی کی بھانجی اس کا نام مہرو۔ یقیناً مہرالنساء ہو گا۔ مہرو دالان میں فرش پر لحاف پھیلاتی، سر جھکائے ڈورے ڈالتی رہتی۔ کبھی [illegible] مسکاتی، باتیں کرتے کرتے مہرو کی آنکھیں یکدم جل تھل ہو جاتیں۔

"اور مالی! اس کا کوئی نہیں؟" اماں نے پوچھا۔

"ماماں! ماموں ہے۔ دو بیٹے ہیں۔ نانی بھی تھی۔ مر گئی۔ ایک بیٹا تو بہت بیمار رہا۔ بہت یاد کرتا تھا ماں کو۔ سب لوگ بہت روتے ہیں۔ ماموں تو بالکل۔۔۔"

"چھو۔ کبھی ان کو بھی یہیں لے آئی کہ [illegible]"

"بہت کوشش کی مگر پاسپورٹ نہیں بنا۔ بند ہیں۔ بالکل نہیں بنے گی۔"

[illegible] اماں کی بار بار کہنے پر بھی مالی کا پاسپورٹ نہ بن سکے۔ جانے سے ایک دو دن پہلے وہ بہت سا وقت کوارٹر میں گزارنے لگا تھا۔ کبھی رات گئے اس کی کھڑک کھڑک اور لہر در لہر کھڑکی سے ٹکرائی۔

[illegible] جانوں کیسے ہوئے

جس کی [illegible] کوئی بھی [illegible] جلتے ہوئے

وہ جیسے کسی زوبچاؤ سے کرتی چلی جاتی۔ پھر ایک روز صبح سویرے مالی سلام کرنے کو پہنچا۔

"میاں تم بھی پاسپورٹ کے کہاں جا رہے ہو؟ سرحد کیسے پار کرو گے؟ بھی رکو کچھ عرصے میں سلسلہ چل سکے گا۔ بن جائے گا پاسپورٹ۔"

"جی میں صاحب میرا دل پریشان ہے۔ نکلتا ہے وہاں میری ضرورت ہے ان سب کی اور جیں آتی ہیں کانوں میں۔ بس ان کو لے کر آ جاؤں گا۔ یہی سن کو سمجھا ہے۔ ابھی نکل جاتا ہوں۔ تالی بیگم صاحب کو تھما دی ہے۔"

جس دن صبح کی کوارٹر میں تالا ڈال گیا۔ زنجیردار کنڈے میں بھاری سا لوہے کا تالا

جس میں مسلسل بارش سے زنگ لگ گیا۔ چابی معلوم نہیں کہاں ڈال دی ہو گی،
کیونکہ جب موسمِ برسات میں [illegible] تو اس کا تالا [illegible]
[illegible] چارپائی ایک کونے میں
کھڑی تھی۔ ان کی چابی کے ساتھ آئینے کا سوکھا ہار لٹک رہا تھا۔ [illegible]
[illegible] رکابیوں، پیالیوں کے ساتھ ساتھ وہ ہار بھی [illegible] چارپائی [illegible]
رکھی ہو

ہمارے صحن کا [illegible] اور ماما ساتھ ہی ہو گئی تھیں مگر بازار کے قریب سے وہ ہم
لوٹ آئیں۔ ماما اندھیرے میں [illegible] مگر وہ [illegible]
[illegible] رہا ہوں۔

[illegible] شہادت [illegible] کی طرف
اٹھاتی۔ [illegible] اشارہ کرتے ہیں۔ [illegible]
[illegible] حضرت سلیمان [illegible] ایک شخص [illegible]
کو تختہ شاہی پر [illegible] وزیر بھی پاس ہی بیٹھا تھا [illegible] دیر تک گھورتا رہا۔
[illegible] رخصت ہو [illegible] وزیر نے حضرت سلیمان سے عرض کی یہ شخص کون تھا جو مجھے اس
بری طرح گھورتا رہا۔ حضرت نے فرمایا یہ عزرائیل تھا [illegible]
عرض کی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] روح قبض
کرنا تھی [illegible]
[illegible]

Scanned with CamScanner

ہم نے ایک سلسلہ شروع کیا جس کو اب تک دو سال ہو چکے ہیں جس میں ہم نے مختلف کتب کو سافٹ میں منتقل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ریختہ کی قابل تعریف ویب سائٹ سے بھی کتب کو پی ڈی ایف میں منتقل کیا، ہماری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ دوستوں کے لئے نایاب واہم کتابوں کو سافٹ میں پیش کیا جائے۔

معروف ادبی جریدے "آج" کو سافٹ میں منتقل کرنا بھی اسی کوشش کا حصہ ہے اور ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں کے لئے ایک تحفہ

محمد ثاقب ریاض / ایڈمن بزم کتب

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تاکہ مزید اس طرح کی شاندار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے

ہمارا وٹس ایپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبر ذیل میں ہیں

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92 312305[illegible]

محمد ثاقب ریاض: +92 344[illegible]4

Scanned with CamScanner

انگریزی سے ترجمہ قیصرہ ریاض

قاری کو انتباہ

مصنف ان مسائل کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں
جو اس کی تحریروں سے اٹھ کھڑے ہوں
یہ قاری کے ساتھ زیادتی ہے
لیکن اسے یہ قبول کر کے ہی چلنا پڑے گا
سیبیلیئس، عظیم مزاح نگار اور عالم دین تھے
تثلیث کے نظریہ مقدس کے پرزے اڑانے کے بعد
کیا اس نے کفر کی ذمہ داری قبول کی تھی؟
اور اگر کی تھی تو کیا خاک!
ایک مخبوط الحواس طریقے سے
ذمہ داری، جو تضادات کے انبار پر کھڑی ہے

قانون کے جلادوں کا کہنا ہے
یہ کتاب ہرگز روشنی نہ دیکھے
اس میں کہیں لفظ "قوس قزح" نہیں ملتا
لفظ "الم" کا تو ذکر ہی کیا
ہاں، میزیں اور کرسیاں کے ڈھیر کے ڈھیر موجود ہیں،
دفتری رسد کا سامان میرا ثبوت ہیں!
یہ سب سن کر
میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا
کیونکہ میں صاف دیکھ سکتا ہوں
آسمان پارہ پارہ ہو کر گر رہا ہے
جن حضرات نے وٹگنسٹین کی کتاب "ٹریکٹیٹس" پڑھی ہے
شوق سے چھاتی پیٹ سکتے ہیں

نکانور پارا

Nicanor Parra

پابلو نیرودا کے ہم وطن نکانور پارا ۱۹۱۴ میں سینٹیاگو (چلی) سے دو سو میل جنوب میں واقع ایک چھوٹے سے شہر چیان میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کے کئی افراد کو موسیقی کے میدان میں غیرمعمولی صلاحیت حاصل تھی۔ اور ان کی بہن وایولیتا پارا [illegible] الاقوامی شہرت [illegible] نکانور پارا کی تربیت [illegible] [illegible] کے باعث ہم عصروں [illegible] نہیں سمجھتا بلکہ اپنے ساتھیوں کو بورہا ہوں۔"

Scanned with CamScanner

کیونکہ یہ کتاب [illegible] سے دستیاب نہیں۔
مگر حلقۂ ارباب ذوق میں پہلے مشہور ہو کہ
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
علاوہ جنگ کی مذمت کرتے ہیں

حالانکہ ممکن ہے میری شاعری سے کچھ حاصل نہ ہو،
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] لوگوں کو اس [illegible] میں کبھی [illegible] رہے ہو؟
[illegible] پوچھیں گے
وہ کلام [illegible] چھپا ہو سکتا ہے
[illegible] خود مختصر کرے؟
[illegible]
میں نہ کسی چیز کی مختصر نہیں کی ہے
[illegible] کہ میں نہ [illegible] کروں گا
[illegible] کی
[illegible] اپنی [illegible] پر فخر ہے

میں اپنی تخلیقات کی تعریف میں رہیں آسمان کی قلابے ملا دوں گا۔

ارسطو [illegible] کے پرندوں نے
اپنے والدین کی میتیں
اپنے سر میں دفن کر لی تھیں
(درحقیقت ہر پرندہ ایک اُڑتا ہوا قبرستان تھا۔)
میرا خیال ہے
اس رسم قدیم کی تجدید کا وقت آ گیا ہے
لہٰذا
میں اپنی کلنک کو
دفن کر رہا ہوں
اپنے قاری کے سر میں۔

یاترا

توجہ فرمائیے، خواتین و حضرات، ذرا توجہ فرمائیے
بس ایک لمحے کے لیے توجہ فرمائیے
صرف ایک سیکنڈ کے لیے
اپنے چہروں کا رخ
جمہوریہ کے اس حصے کی جانب موڑ لیجیے
ایک رات کے لیے اپنے ذاتی معاملات بھلا دیجیے
آپ کی خوشیاں اور غم دروازے پر انتظار کر سکتے ہیں
جمہوریہ کے اس حصے سے ایک آواز آ رہی ہے
توجہ فرمائیے خواتین و حضرات
بس ایک منٹ کے لیے توجہ فرمائیے

ایک روح
جو برسوں سے
ایک ماتمی وراثت اور [illegible] میں قید تھی
ناک کے ذریعے نہایت ناکافی خوراک حاصل کرتی ہوئی

آپ کی سماعت کی منتہی ہے

میں کچھ چیزیں تلاش کرنا چاہتا ہوں
مجھے مجبوری میں روشنی درکار ہے
مگر باغ میں مکھیوں کی بھرمار ہے
میری ذہنی حالت بہت بیمار ہے
رفتار کار ہے
سانچے تک پہنچنے کا
یہ ایک مخصوص طریقہ کار ہے
میں یہ کہہ رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں
کہ ایک سائیکل لگی کھڑی ہے اور ایک دیوار ہے
میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک پل ہے
اور عمارتوں میں غائب ہوتی ہوئی
ایک کار ہے

آپ اپنی رگوں میں شامل کرتے ہیں
اور گفتگو کرتے ہیں
فرشتہ
آپ کی جلد کے اندر
اور کتنی خندقیں ہیں
اور ایک مخصوص حسن، حسن کی فریبی
خوبصورت
آپ اندر سے باہر
اور باہر سے اندر ہو جاتے ہیں

بستی میں ایک بچہ ہوں
چٹان کی عقب سے ماں کو پکارتا ہوا
میں پانی ہوں جس کی حدت
پھر اس کی ناک تک چھلک پڑتے ہیں
میں درخت ہوں
جو چیخ رہا ہے
پتوں سے ڈھک جانے کے لیے

بچپن کی یادیں

اب تو بچپن کی ساتھ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں
اے ہنری
میں کبھی آگے بڑھتا تھا کبھی پیچھے ہٹتا تھا
کبھی میں درختوں سے ٹکرایا
کبھی تتلیوں سے
کرسیوں اور میزوں کے گھنے جنگل میں
میں نے مشکل سے اپنا راستا بنایا
میں نے پت جھڑ دیکھی جب کہ میری روح ایک دھاگے سے لٹکی ہوئی تھی
لیکن
یہ سب کچھ بیکار تھا
ہر موڑ پر
ایک لجلجے مادے میں اور گہرا دھنس جاتا تھا
لوگ مجھ پر چڑھتے تو میں موروں پر ہنستا تھا
سمندر کی تہ میں لہروں سے ہلنے والے آبی پودوں کی مانند
وہ کردار اپنی آرام کرسیوں میں کروٹ لیتے
عورتیں مجھے کراہت سے دیکھتیں
مجھے ادھر اُدھر گھسیٹتی پھرتیں
وہ مجھے میری مرضی کے خلاف
ہنساتیں اور رلاتیں
ان باتوں سے میرے اندر شک پیدا ہوتا
اور ایک بیماری
دھمکیاں، گالیاں، لاحاصل فرصتیں
اور تھکن سے چُور کرنے والی سرمستی کی متواتر جنبش
ایک طاغوتی رقص
جس سے میری سانس اکھڑ جاتی
میں سر نہ اٹھا پاتا
کئی منٹوں تک
کئی راتوں تک

Scanned with CamScanner

یہ سچ ہے
میں تو ہی
کہ پڑھنے اور سمجھنے کے عمل میں گرفتار تھا
میری روح راستوں پر مرتی رہی
مدد کے لیے پکارتی ہوئی
ذرا سی محبت کی بھیک مانگتی ہوئی
کہیں میں بیوقوف نہ بنوں، اس لیے
میں کاغذ قلم لے کر قبرستانوں میں پہنچ جاتا
میں ایک ہی حقیقت کے بار بار پھیرے لگاتا
ہر شے کی جزئیات کا کُلّی مطالعہ کرتا
جھنجھلاہٹ میں ایسا بھی ہو جب

درس گاہ میں زندگی کا غبار
اسی کشمکش میں جو
میں اپنی اجتماعات میں
گویا سے وحشی آدمی کی طرح
موت کو کھینچتا ہو پیچھے
صدیوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں پھلانگتا

کوشاں رہتا کہ
صرف چابک زبانی سے دیکھنے والے سمجھ جاتے
مگر وہ اخبار پڑھتے رہے
یا کسی ٹیکسی کے پیچھے غائب ہو گئے
پھر میں کہاں جاتا
اس وقت تو دکانیں بھی بند ہو جاتی تھیں
میں ایک بیمار کی لاش کے بارے میں سوچتا
جو میں نے رات کی گھاس پر دیکھی تھی
یا اس اندھے کنویں کے بارے میں
جو مجھے جدا کرتا ہے
دوسرے اندھے کنووں سے

آخری جامِ صحت

آپ کو بھلا لگے یا برا
ہمارے سامنے تین ہی راستے ہیں
ماضی، حال اور مستقبل

اور تین بھی کہاں
فلسفیوں کا قول ہے
ماضی گزرا ہوا ہے
وہ صرف یادداشت میں ہمارا ہے
جیسے گلاب کی پنکھڑیاں نوچ لی گئی ہوں
اس میں نئی پتی نہیں پھوٹتی
اب ہمارے پاس دو ہی رہ جاتے ہیں
حال اور مستقبل

اور دو بھی کہاں
کیونکہ سب جانتے ہیں
حال وجود نہیں رکھتا
صرف ماضی بن کر وجود میں آتا ہے
گزرا ہوا
جوانی کی مانند

القصہ مختصر
ہمارے پاس صرف مستقبل بچتا ہے
میں جامِ صحت تجویز کرتا ہوں
اس روز کے لیے
جو کبھی نہیں آتا
اس واحد شے کے لیے
جس پر
سچ مچ ہمارا اختیار ہے

Scanned with CamScanner

افراطِ زر

روٹی مہنگی ہو جاتی ہے
اس لیے
روٹی اور مہنگی ہو جاتی ہے

گھر بے مرمت رہتے ہیں
اس لیے
تمام کرائے دار دُکھی ہو جاتے ہیں
کپڑے کی قیمت بڑھ جاتی ہے
اس لیے
کپڑے کی قیمت دوبارہ بڑھ جاتی ہے

کوئی راہِ فرار نہیں
ہم ایک دائرۂ شر میں بند ہیں

پنجرے میں قیدی ہیں
زیادہ نہیں، مگر قیدی ہیں
وہ باہر
زندگی کے ویرانے میں

راز و نیاز

ہم کتنے عرصے سے یہاں ہیں
لیکن تمہارے پاس ہر بار وہی پرانا جواب ہے
ایسی نظموں سے تم مجھے پاگل کر دینا چاہتے ہو
جو اب مجھے زبانی یاد ہو چکی ہیں
تمہیں میرے ہونٹ پسند نہیں؟ میری آنکھیں؟

مجھے تمہارے ہونٹ بالکل پسند ہیں
پھر تم انہیں چومتے کیوں نہیں؟
میں ابھی چومتا ہوں
اور میری زلفیں؟ میرے پستان تمہیں اچھے نہیں لگتے؟
کیا مطلب تمہارے پستان مجھے اچھے نہیں لگتے؟
تو پھر انہیں چھوؤ، جب کہ موقع ہے
مجھے تمہارا یہ سب کروانا پسند نہیں
پھر میرے کپڑے کیوں اتروائے تھے؟
میں نے تو نہیں اتروائے تھے
تم خود چاہتی تھیں تو اتار دیے
چلو اب کپڑے پہن لو
شوہر کے گھر لوٹنے سے پہلے
باتیں بند کرو اور کپڑے پہن لو
اپنے شوہر کے گھر پہنچنے سے پہلے

ایمرجنسی کی نظمیں

بیماری، بڑھاپا اور موت
بستر کی جھیل کے اردگرد
معصوم لڑکیوں کی مانند رقصاں ہیں
نیم عریاں
مدہوش
ان کے قرمزی ہونٹ اُکساتے ہیں

* * *

کوئی بھی دیکھ سکتا ہے
کہ چاند پر کوئی نہیں رہتا

کہ کرسیاں اصلی ہیں

Scanned with CamScanner

ور تتلیاں پھول ہیں
بہشت پھر پھر ہو جائے
کہ سچائی ایک جسمانی خلش ہے
کہ روح بدن کے ساتھ مر جاتی ہے

لوگ نہیں دیکھ سکتے ہیں
کہ جھریاں وقت کے داغ نہیں ہیں

* * *

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

* * *

شہد کی مکھیوں کو بت کا عرق پلا دو
ان کا تعارف مذہب سے کرا دو
دین کی کٹیا میں کیسوں کے بل جھک جاؤ
جنت کی کٹوری میں چھڑک کر
دودھ نکالو گائے کا
اور واپس اس کے منہ پر دے مارو

* * *

کسی بھی سڑک کے ہر کھمبے
پولیس کے سپاہی کی لاش بھی دیکھیں

اس کا مطلب یہ ہے
پولیس کے سپاہی بستروں میں مرتے ہیں

یہ مطلب نہیں
کہ پولیس کے سپاہی لافانی ہوتے ہیں

آدمی

ایک آدمی کی ماں سخت بیمار ہے
وہ ڈاکٹر ڈھونڈنے نکلتا ہے
وہ رو رہا ہے
راستے میں دیکھتا ہے
کہ اس کی بیوی کسی دوسرے آدمی کے ساتھ جا رہی ہے
دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیے ہوئے ہیں
چند قدموں کے فاصلے سے وہ ان کا تعاقب کرتا ہے
ایک درخت سے دوسرے درخت تک
وہ رو رہا ہے
اب اسے نوجوانی کے زمانے کا ایک دوست ملتا ہے
ارے، ہم کتنے برس بعد ملے!
دونوں شراب خانے جاتے ہیں
باتیں کرتے ہیں، ہنستے ہیں
آدمی پیشاب کرنے باہر بالکنی میں آتا ہے
اسے ایک نوجوان لڑکی نظر آتی ہے
رات کا وقت ہے
لڑکی روتی جا رہی ہے
آدمی اس کے پاس جاتا ہے
اس کی کمر میں بازو حمائل کر لیتا ہے
دونوں پیار کرتے ہیں
اکٹھے باہر راستے پر آ جاتے ہیں
ہنستے ہیں

Scanned with CamScanner

ایک حادثہ ہو جاتا ہے
لڑکی بے ہوش ہو جاتی ہے
آدمی ایمبولینس کرنے چلتا ہے
وہ سو رہا ہے
وہ ایک گھر پہنچتا ہے جہاں بجلی روشن ہے
یہاں کوئی اسے جانتا ہے
ذرا رکو کچھ کھا لو
میں ایمبولینس کہاں ہے؟
[illegible] کچھ کھا لو، کچھ کھا لو
پھر چلے جانا
وہ کھانے کے لیے بیٹھ جاتا ہے
وہ بیٹھا ہے جیسے سزا یافتہ مجرم ہے
[illegible] رہا ہے
[illegible] انتظار [illegible] کہ وہ مجھے بتائیں
[illegible] سچ
اور آخر [illegible] ایک [illegible] کر کے بیٹھے سو جاتا ہے

نظم

تو میں کوئی کاروبار کیوں نہیں کرتا؟
یہ میرے مذہب کے خلاف ہے

دوسری کی جان پر بدلا کیوں نہیں لیتا؟
یہ میرے مذہب کے خلاف ہے

تمباکو نوشی کیوں نہیں کرتا؟ شراب کیوں نہیں پیتا؟
یہ میرے مذہب کے خلاف ہے

شادی کیوں نہیں کرتا؟
یہ میرے مذہب کے خلاف ہے

میں چنگلی کیوں نہیں کھاتا؟
یہ میرے مذہب کے خلاف ہے

میں ہتھیار کیوں نہیں رکھتا؟
یہ میرے مذہب کے خلاف ہے

میں مینڈک کا گوشت کیوں نہیں کھاتا؟
یہ میرے مذہب کے خلاف ہے کم بخت!
اس گندگی کے نگلنے سے تو بھوکوں مرنا بہتر ہے

نظم

تم شوہروں پر لازم ہے
بذریعہ ڈاک ہی تعلیم حاصل کرو
یہ نکتہ نفیس حاصل کرو کی اگر ہمت نہیں
نسوانی اعصابی تناسل کے بارے میں

اس سلسلے میں حد درجہ لاعلمی ہے
مثلاً تم میں سے کتنے ہیں
جو مجھے ولوا اور ویجائنا میں فرق بتائیں

اور پھر بھی تم سمجھتے ہو کہ تم کو شادی کا حق ہے
گویا تم اس موضوع کے ماہر ہو

اور نتیجہ؟ ازدواجی الجھنیں
ناخوشگوار تعلقات، الزامات، علیحدگی
اور ہمارے بچوں کا کیا ہو گا؟

نظم

خدا ہمیں سوداگروں سے بچائے
وہ صرف ذاتی فائدہ چاہتے ہیں

اور ہمیں رومیو جولیٹ سے بچائے
وہ صرف ذاتی خوشیاں چاہتے ہیں

شاعروں اور فنکاروں سے بچائے
وہ صرف ذاتی شہرت کے پیچھے دوڑتے ہیں

گوئٹے کے سورماؤں سے بچائے
اور ملک کی مسرتی حرارتوں سے
ذاتی یادگاروں سے ہمیں کیا؟

خدا کے پاس اگر ابھی تک قدرت ہے
وہ شیطانوں سے ہمیں محفوظ رکھے
اور محفوظ رکھے ہمیں اپنے آپ سے
ہم میں سے ہر ایک کے اندر ایک وحشی چھپا بیٹھا ہے
ہمارا پیچھا چھوڑتا ہوا
ساحر کا لالچی بیوپاری
مخبوط العقل رومیو، بس اپنی جولیٹ کے حصول کا سودائی
ڈرامائی سورما
یہی محسنوں سے خود سازباز کرنے والا
ان سب شیطانوں سے بچائے
اگر وہ اب بھی خدا ہے

نظم

فنونِ لطیفہ کو نجی ملکیت میں نہیں دینا چاہیے
یہ تو برابر ہے
انفرادی شعور کو نجی ملکیت میں دینے کے
اس سے بڑھ کر مضر اور کیا ہو سکتا ہے
جمہوریت کی سلامتی کے لیے؟
ہماری دماغی صحت
اولین اہمیت کی حامل ہے
شاعری، مثال کے طور پر
قوم کو تباہ کر سکتی ہے
شاعری کو احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے
جورج اسینوں سوا کی "توکتوریہ" یاد نہیں؟
سمجھدار لوگوں نے خودکشی کر لی تھی
اس کو پڑھ کر،
یا نیرودا کی نظم نمبر بیس

شاعری فائدہ مند ہونی چاہیے
کارپوریشن برائے اقتصادی ترقی کی طرح،
یا ریلوے کے نظام جیسی، قومی ملکیت میں
آزادیٔ اظہار تو افسانہ ہے

صلیب

جلد یا بدیر
اشک فشاں، میں اڑوں گی
صلیب کی کشادہ بانہوں کی سمت
دیر سے سہی، جلد ہی
صلیب کے قدموں میں

Scanned with CamScanner

گھٹنوں کے بل جھک جاؤں گا

خود کو روکنا پڑتا ہے
محبت سے بیاہ رچانے سے
دیکھو! وہ میرے لیے
کیسے بانہیں پھیلاتی ہے

آج نہیں
کل نہیں
پرسوں نہیں
ایک ہی پہر میں یہ ہوتا ہے
فی الحال مطلب ایک خسارہ ہے
ایک عورت، جس کی ٹانگیں وا ہیں

تجویزیں

میں افسردہ ہوں، میرے پاس کچھ کھانے کو نہیں
میری کوئی پروا نہیں کرتا
گداگر نہیں ہونے چاہییں
یہ بات میں برسوں سے کہہ رہا ہوں

میں تجویز کرتا ہوں
کہ باغوں میں تتلیوں کی جگہ کیکڑے گھومیں
میرے خیال میں یہ کہیں بہتر رہے گا
ذرا سوچیے تو ---
سب، بھیڑ فقیروں کے

میں تجویز کرتا ہوں کہ ہم سب کیتھولک ہو جائیں
یا کمیونسٹ ہو جائیں یا جو جی چاہے ہو جائیں
یہ تو بس لفظوں کا ہیرپھیر ہے

میں تجویز کرتا ہوں کہ ہم پانی کو منظم کریں
یہ مسائل گداگری مجھے جو اختیار تفویض کرتا ہے
اس کے ذریعے
میں تجویز کرتا ہوں کہ یورپ مرسڈیز رکھے

یورپ سے شناخت محسوس کر رہا ہوں میں
میں تجویز کرتا ہوں کہ مجھے ایک سینڈوچ دیا جائے
اور یکسانیت کے خاتمے کی خاطر
سورج مغرب سے نکلا کرے
بس
تجویز کرتا ہوں میں

نظم

مجبوری کا مطلب خود کو محروم رکھنا ہوتا ہے
ہم ایک دائرے ہی میں دلائل دے پاتے ہیں
ہمیں وہی نظر آتا ہے جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں
کسی پیدائش سے کچھ بھی حل نہیں ہوتا
اور میں مٹتا ہوں
آنسو میرے گالوں پر بہہ رہے ہیں

کسی پیدائش سے کچھ بھی حل نہیں ہوتا
صرف موت ہی سچ بتاتی ہے
شاعری بھی کسی کو قتل نہیں کرتی
آپ کا کہنا ہے کہ "فاصلہ" وجود نہیں رکھتا

وہ سکھاتے ہیں کہ وقت بھی وجود نہیں رکھتا
اور اس کے باوجود
بڑھاپا زندگی کی کڑی حقیقت ہے
مستقبل جو کبھی نہ ہو گا، سو ہو گا

Scanned with CamScanner

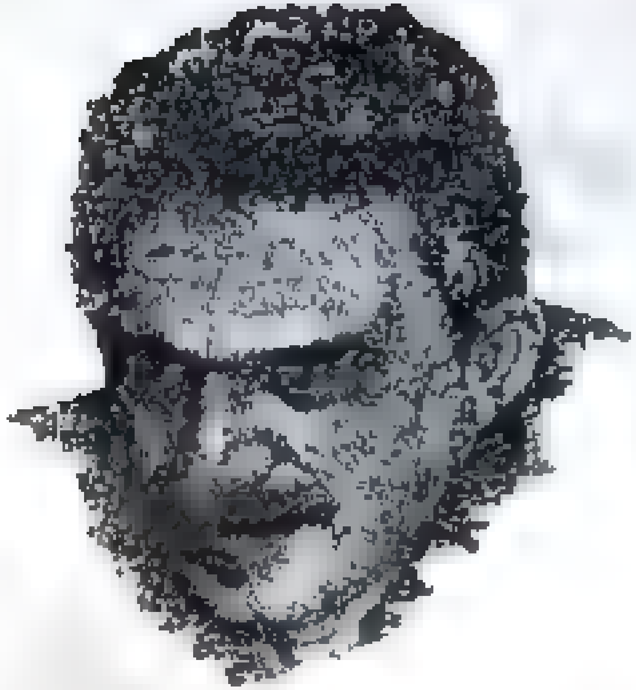

گابریئل گارسیا مارکیز

منتخب تحریریں

آج

شمارہ بہار ۱۹۹۱
کتاب کی صورت میں
بہت جلد شائع ہو گی

میں اپنی نظمیں پڑھ کر اوسکو جلتا ہوں
اور یہ جیسی یہ اپنے خون سے لکھی تھیں

میں اپنے سب قول واپس لیتا ہوں

رخصت سے قبل
میری خواہش پوری کی جاتی ہے
دریادل قاری
اس کتاب کو نذر آتش کر دو
یہ وہ نہیں جو میں کہنا چاہتا تھا
حالانکہ یہ میرے خون سے لکھی ہے
یہ وہ نہیں جو میں کہنا چاہتا تھا

مجھ سے بڑھ کر بدنصیب کون ہو گا
مجھے میرے اپنے سائے نے شکست دی ہے
میرے لفظوں نے مجھ سے انتقام لیا ہے

میرے قاری، میرے عزیز
مجھے معاف کر دینا میں اگر
گرم جوشی سے گلے مل کر تم سے رخصت نہ ہو پاؤں
اور جاؤں
ایک اداس، مصنوعی تبسم کے ساتھ

شاید میری حقیقت اتنی ہی تھی
لیکن میرے خون آلود سے لو
میں اپنے سب قول واپس لیتا ہوں
دنیا کی تلخی کے ساتھ
اپنے سب قول واپس لیتا ہوں

Scanned with CamScanner

تمہاری نگہوں کے اوجھل میں

جو اب لمحوں میں تمہاری ملاقاتیں جھلملاتی ہیں
ابر آلود موسموں میں ہوا کی سرگوشیاں
ہر بات میں کہیں ہیں کتنے بھید ہیں ... کون؟
کوئی بھی تو نہیں اپنے آپ میں
بات ہوتی ہے صرف لمحہ بھر کو
کبھی بھی نہیں ہونا کہ تم حاضر ہو گی
جگر بیتی ہے، آناً فاناً بس ہے
موت نہیں ایک خوشبو سے موت تلک کی
ہم کبھی ہی رشتے ہیں کہ ایسا کیا کہیں
حقیقت ہی تو ہے سمجھیں کیا خبر
قربت سے دل کہ ہوتا جاتا ہے
ہم ہی اب تمہاری نگہوں کی اوجھل میں
ایک سایہ ساتھ ساتھ چلتا ہے
محبت کی تنہائی گونجنے لگتی ہے
ٹوٹی لکیر چاند دیکھیں ہیں
جانے بدھو جی کچھ کیسی رہی!

کچرے کے ڈھیر پر

جب تمہیں سب ہی تک ہے حیرت ہے
کل میں اچانک جاگ اٹھا تھا
ایک لہر

Scanned with CamScanner

بکھر رہی تھی تمہارے روشن روشن ماتھے کو
سمندر سے اٹھی دل میں سماتی
اسکیوں سے لپٹ کر
گرنی کی زنجیر سے جھولتی
چھپ چھپ جاتی چہرہ دکھلاتی، کدکدی کرتی
دھڑوں چومتی چاٹتی بوسوں کی گل پاشیاں
تیرے آسے سامنے داہیں بائیں قدموں کے بیچ
کیا مانگتا تھی سا ولی سا کچھ نہیں
میں بولی جیوں ساگر لوہے میرے چیں میں
دھرت اکاش بلے میرے چین میں کیسی جوڑتی ہے
میں بولے تو میں سچل دھیان میں جاتی
پھر کیسی یہ لے ہے کہ کوندے سوال بےچہرہ میں لپک لپک رہ جاتی
میں بولی صدقے جاواں میری لہجہ کے عرش سے اترا
کیچڑے کے ڈھیر پر مقدروں کی بات ہے پکڑا حشر مہاز اپاد
میں بولی میں بولے اور کیا ہوے
وہی کسے سری نکالا ہے بار ذرا سی چھورو بھی شالا شاد رہو

ننگے خلاؤں کے آئینوں کی وسعتوں میں

بے یقین کمانوں اندر
شک شیوں کی تریں ٹیرنگ چھناچھٹی پر ستی چوکی

جاؤں جیسے کبھی آن کوندھتی کبھی کبھی سل بنا چلاتی
کہنہ پکی کی کھڑیو حرشیر پورے ڈھونا
ذن کے سر سے جوہیں سکالتی
بھی آندھی جاتے ہیں ان جیوں کو
مستاشکی جھینا ان کے علاوہ ہے
سر تفریح نوامیع خطر کیرے، جیورق
عین آپا کے سرپری مہک آپ سے رستے باجی کی میرحاذ سمجھای

بولا تھی ہی ثانم تسبیحیں کی کنٹی موہوم سے اڑتہ تو چھہ
رابطوں والی فیشن
گھونٹ سا اس فیشن پکڑا جائے تو لے لیتا ہے

جسم کب بنا ایس تو بس مکیاں مرتے جاتے جولیں نکالتی
بھیجے میں گھسی گھاؤ سے کھرکتی کھرکے چھڑیاں پر گئیں
رکا نہیں جاتا

جسم کو بالوک سنبھالی ہے وہی موکروں والی ڈال تھوں
کھانے ہو ہم بھی وہی ہیں لیکن عزت میں ہے کیوں جی امان؟
بہو رہنے کی ہو تم چاہیں وہیں میں کتھم کہہ
اب کنکری کرو

باہر لو ہستری ملکشی کا ڈھیر لی تو الیڈیولاک ہے
عارہ بارہ ساٹھکی سار لباس کا
پوروں کی ہر بہ بدلتی لفظوں سے بھی نکالتا ہے
روح کا سار مسکوبیھیو و رشتکی میں
اپنے سامنے اپنے کپڑے اتارتا ہے ہر پھینک شوم
مشرب خور کی پرانچیسی کو
ماحی کے خودستکی کے مصرف سے
اس مجبوروں کی ماڈلنگ کرتا ہے
ننگے خلاؤں کے آئینوں کی وسعتوں میں

بہزاد کے فوکس میں

گنٹر گراس کا ناول فت پاتھوں پہ رکتا رہا ہے
مکدم قیمتی ہو گیا پہلا حوالہ ذات کا سکرینٹ سلگتی میں چپکا
نئی نئی لڑی سے، جانان تمھیں پہچانا، بہمنی جٹوں سے رلتی ملتی
بہت نرت چوٹھ گیا ہے پھرے یہیں رکھ دو

Scanned with CamScanner

بیٹھ پڑھا ہوا بہزاد کی [illegible]
کیا بات ہے [illegible] تالستائی کی
ہر [illegible] کی عظمت کو چاند لگاتی ہے
[illegible] کی پت [illegible] کی [illegible]
[illegible] مصرع [illegible]
بہزاد کا نام [illegible] کی [illegible] سال پرانا
[illegible] کے کہنے [illegible] سے کبھی
[illegible] کبھی [illegible]
[illegible] شوق [illegible] کیوں
[illegible] بہزاد کی [illegible] بہت کچھ

[illegible] کہاں [illegible] کہاں نہیں
جب ساحل کی ریت پر [illegible]
[illegible] دیکھے [illegible]
جیسے [illegible] کی [illegible]
[illegible]
[illegible] بہزاد [illegible] جائیں گے؟
[illegible] رنگ [illegible] میں جب
[illegible] ایک جیسی
[illegible] کی [illegible]
[illegible]
[illegible] کی [illegible]
[illegible] کے [illegible]
پھر [illegible] کی [illegible] ہیں کے
[illegible] کی [illegible]

[illegible] کی [illegible] سے
[illegible] کا جلوہ دیکھا ہوں
[illegible] کی [illegible] ہیں؟
[illegible] مل سکتی؟ [illegible]
[illegible] کی بہزاد کی؟ [illegible]

ہر چیز کہ جس پر بہزاد کا گہرا حاشیہ ہو، وہ [illegible]
[illegible]، جاناں، [illegible] کرو، بہزاد [illegible]
[illegible] کرتی [illegible]
[illegible] جیسے [illegible] میں [illegible]
[illegible] کا [illegible]
[illegible] اپنی [illegible] پڑھتا ہے
[illegible] کی [illegible] سے [illegible]، بہزاد کی کتاب
[illegible] کا [illegible]، بہزاد کی [illegible] میں

بہت سجل ہیں، بیلے رٹ ایسے

[illegible] کی ترتیب میں [illegible]
[illegible] جانب [illegible] میں [illegible]
[illegible] کہتا ہے اب کون؟
[illegible] جانب [illegible] وہ تو [illegible]
[illegible] تھوڑی دیر
[illegible] رنگ [illegible]
[illegible] میں [illegible] سے [illegible]
[illegible] کی [illegible] ہیں
[illegible] ہوا؟ [illegible]
[illegible] سے [illegible] کرتا چہرہ [illegible] کی [illegible] آنکھیں
رات وہ [illegible] کے پاس [illegible] چھوڑ گیا [illegible]
[illegible] کر ہی [illegible] ہے
[illegible] میں [illegible] سے [illegible] کی [illegible]
جب [illegible] ہو، [illegible] سی بات ہی [illegible] ہو
آج [illegible] ہو گی [illegible] شرط ہے [illegible] کے غالب صاحب
اس کا [illegible] کرتا ہے
میں کہتا ہوں [illegible] کو بلا لو
وہ کہیں ہے، جناب صاحب، [illegible] گیا

Scanned with CamScanner

تھوڑی سی، بس، مجاہد ہمیں!
قاصی پہ سبک خرامی کرتے ہوئے، واللہ اتنی سندر
یہیں جی دیکھنے والے کا حسن نظر ہے
سجی بہت سجی ہیں سامنے لیے
ہاں میں جانتی ہوں تیری جوانی وہیں ہوئے
شہوت سے مضطرب نگاہیں ان کو لال بھبوکا کرتی ہیں
تمہی ہی کی ترنگ جسم میں گھنٹی بجتی ہے، گوری اور
یہیں کوئی ور میں ہے ایسی رکاوٹیں ہیں
کوی سستا نہیں کھیتی بجتی ہے
خوبصورتی کو پہچان رہے گا
ٹھہرو وقت ہو ہے، ٹریفک جیم سے رستا ڈر
ٹھہر و کہ یہ پھر ڈھولو ٹھہرو
یہ میں میرے نشانی اتنے
دیر سے کبھی پیو پکیاں۔۔۔
سکاسی کی سیاسی کو بھی
میکاسیل جی جبرائیل جی خیر نگ خوش کیا کبھی
روبر نہیں کہ ہی واپس ہوتی کو
یوسنگ محنت سہی ہوتی لفافہ لیے جانتے خدا حافظ میکائیل
اشتہار جالب، کلثومی نظم سرور بنتے گا، وعدہ؟ پکا!

میرے کو رات نیند نہیں آتی

کراتشسر کے من فی کے حو ہی سہ۔۔۔
قومون کی ماورائے حقیقت کے گھیرے میں ٹھہر سے چلے تھے
سوچوں ہی میں رفاقت رستا کاٹ گئی
کب سوچا تھا؟ یہ تشبیہ نکلا تیاری میں رستوں کو جانتیں
ماتمی میرا رہا کبھی کبھی کبھی کا پھندا کس کو رونے
موسم کی بھاری ہوگی ایسا ہی تھا
ٹھیک ہے باطل باطل ہے۔ وقت اور جدوں کی توٹ گھسوٹ سے

دل میرا مختار سا دل جو سوچتا ہے، کیا پایا؟
سڑکوں کے ہر طول نے گٹھ کر کھیت اجاڑ دیے، تاراج کیے
میرا جاں کی دھندلکی خواب و خیال اب بھی کہاں

دھکم دھکا میں جیسے ٹائلز میں وہی ماتھے ہیں
اقدار کی رسہ کشی میں گلی میں بھی دیکھنا پڑتی ہیں
ٹکڑے لگے رہتے ہیں، سطح سے بھی
قرآن کی محبت کی متلاشی
ڈی ہیوسٹرنگ پریمفرک کی ماری، جاناں
تمہیں ابرو کے اشارے دیکھنے والوں کی
کہیں بخششیں ہوتی ہیں!
چنگھاڑتی مست سندر باتیں ابھی ہیں
بل فور کروا جڑیں بھی دوا
نہیں پتہ قرآنی کی جرأت کیسے ہوئی

۔۔۔ایسی زندگی سے۔۔۔
۔۔ جاناں۔۔۔
۔۔۔کوئی حد ہوتی ہے۔۔۔
۔۔۔سی جاناں۔۔۔
۔۔۔رکھو اپنا۔۔۔
۔۔۔بٹی میرا رہا۔۔۔

کراتشسر کی اس دن کے حوالے سے تشویش سمندر۔۔۔
جیتاجہانی کو کھل سینہ پہ جکار لگا کر
کچھ کے پھندے کو چھپا شکی بناؤ
دعا کرو کچھ نہ چلا، وارے نیارے ہو جائیں گے
حاضر ستاک دبا کر رکھو
اسکائی رکشک ہو گئی بھاری ترک
کرپٹ کتھا کا سوچیں سوچیں ٹیکوں پر ٹیکیں مدد سے
ادھر ریلیاں، اُدھر حرص شر۔۔۔
میرے کو رات نیند نہیں آئی

Scanned with CamScanner

بھیں بوک دیں کی خاطر سے و بے بس کو دیکھو
پاش پاش کی تو پرے کی بھیے چھوٹی کرور کی چوسھالی
وولد بیسک سے ملتا ہے
مسلسل بیں النومی بیسٹ ہاتو سے دل وہب ع کر پھکر ماسی ترب

Scanned with CamScanner

اوسِپ ماندلستام

انگریزی سے ترجمہ : افضال احمد سیّد

جسے گھوڑے کی نعل ملتی ہے

وہ خوش نصیب ہے جو اپنے گیتوں میں کسی کا نام لیتا ہے
کسی نام سے بھرا ہوا گیت
پھر ساروں کے گیتوں کے بعد تک زندہ رہتا ہے

وہ اپنی دوستوں میں اپنی پیشانی سے پہچانی جاتی ہے
جو اسے مردوں کی قربت یا طاقت ور جانور کی کھال کی بدبو سے
غش کھا کر گرنے سے بچاتا ہے

ہوا سیاہ ہے
اس میں ہر چیز مچھلی کی طرح تیر رہی ہے
ایک سمت ہی میں پہیئے گردش کر رہے ہیں اور گھوڑے بدک رہے ہیں
اور ایک محبوبہ کی نم آلود مٹی، جو ہر رات
کدال اور سہ شاخہ سے ازسرِنو الٹی پلٹی جاتی ہے

بچے جانوروں کی ریڑھ کی ہڈیوں کے ٹکڑوں سے ایک کھیل کھیل رہے ہیں
ہمارے وقت کی بے حرمت گنتی تقریباً مکمل ہو چکی ہے
جو کچھ بھی کہا اس کے لیے تمہارا شکریہ، بس اب چلی جاؤ
جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نے غلطیاں کیں اور غلط ثابت ہو گیا
وقت ایک کھوکھلی، پھر بھری سونے کی گیند کی طرح
جو کسی سے تھامی نہ گئی
گونج کرتا رہا
جب اسے چھوا گیا

اس نے "ہاں" اور "نہیں" میں جواب دیا
جیسے بچے جواب دیتے ہیں
"میں تمہیں ایک سیب دوں گا" یا "میں تمہیں ایک سیب نہیں دوں گا"

اور ابھی تک گردش کر رہی ہے جب کہ بولنے والا جا چکا ہے
تھوڑا مڑتا اور جھٹکے میں پڑا ہتھوڑوں سے آوازیں نکال رہا ہے
مگر اس کی گردش کی سمت مضطرب یاد دلاتی ہے
کہ راستے کے تمام پتھر اس کے آتشیں قدموں سے زندہ ہو گئے تھے

اس لیے جیسے گھوڑے کی نعل ملتی ہے
وہ اس کی دھول صاف کرتا ہے
اسے اون سے رگڑ کر چمکاتا ہے
اور پھر اسے آرام کرنے کے لیے
دروازے سے لٹکا دیتا ہے

جس آدمی کے پاس کہنے کو ہے کچھ نہیں وہ حالت
بے کہے ہوئے حرف نقطے کی شکل اختیار کر لیتا ہے
اور اس کے ہاتھ ان لفظوں کا پورا بوجھ محسوس کرتے ہیں
اس کے بعد بھی جب پانی کے برتن سے
گھر لوٹتے وقت خود کو خالی چھلکا دیا

اب جو میں کہہ رہا ہوں، میرا کہا ہوا نہیں ہے
یہ زمین سے پتھر ہوئے گندم کی طرح کھود کر نکالا گیا ہے
کچھ لوگ اپنے سکوں پر شیر کی شبیہ ڈھالتے ہیں
اور کچھ ایک چہرہ

کانسی، سونے اور تانبے کے گول ٹکڑے
خاک پر یکساں اعزاز کے ساتھ پڑے ہیں
وقت نے بھی ان پر اپنے دانتوں کے نشان چھوڑتے ہوئے
انہیں کترنا چاہا ہے

کسی شیر کی طرح
وقت مجھے چبا رہا ہے
میں اپنے لیے جو کچھ بچ گیا ہوں
بہت کم ہے

ماندلستام اسٹریٹ

یہ کون سی شاہراہ ہے؟
ماندلستام اسٹریٹ

یہ کیسا جہنمی نام ہے
جس طرف بھی مڑیے، یہ ٹیڑھی نکلتی ہے

درحقیقت وہ سیدھی دھار کا آدمی ہی نہیں تھا
اور نہ اس کا چال چلن کسی خوشبودار نیلے پھول کی طرح تھا،
اور یہی وجہ ہے کہ اس شاہراہ (بلکہ
سچی بات تو یہ ہے کہ اس گندی نالی) کو
اس ماندلستام کا نام دیا گیا

نظم

انسانی سروں کے ڈھیر دوریوں میں بھٹک رہے ہیں،
میں ان کی درمیانی سمت جا رہا ہوں، کوئی مجھے نہیں دیکھ پاتا مگر بہت محبوب کتابوں
اور بچوں کے کھیلوں میں میں مردوں کے درمیان سے یہ کہنے کو اٹھوں گا کہ سورج
جگمگا رہا ہے

نظم

میری ہتھیلیوں سے تھوڑا سا شہد (ایک چھوٹا سا سورج)

Scanned with CamScanner

اب اس کو یاد کرنے کا وقت نہیں رہا

تم جانتی ہو پہلے کتنا اچھا تھا
مگر کوئی موازنہ نہیں
لہو کیسے سرگوشی کرتا تھا
اور کیسے سرگوشی کرتا ہے

نظم

ساحرانہ نگاہوں والی خیاط
نازک شانوں کی جنبشیں

گفتگو ڈوبی ہوئی عورت کی طرح ہے جو دوبارہ لفظوں کے بغیر زندہ کی گئی

مچھلیاں جلتے ہوئے شمعوں کے درمیان چل رہی ہیں
کیکڑے پانی کی پھونکیں مار رہے ہیں
بے آواز حروف کا تلفظ کرتی ہوئی وہ تمہاری ہیں
انھیں اپنے جسم کی روٹی پر زندہ رکھو

مگر ہم سوپ میں پڑی ہوئی مچھلی نہیں
ہماری ناف کی پیشانی نازک
اور گود گرم تھی
لالی کے زرگل کی طرح تمہارے ابرو ایک خطرناک نسل کی نشاندہی کرتے ہیں
میں ایک ترک سپاہی کی طرح
تمہارے لبوں کی بے مداخلت ہلال کی محبت میں گرفتار ہوں

اے ترک لڑکی
جانی کبھی ناراض نہ ہونا
میں ایک بوری میں تمہارے ساتھ سِل جاؤں گا

پس دل تو سخت نہیں تھا ہے
پرانی توپوں کی سنگینوں کی اطاعت میں لے لو

ہم اس کشتی کو نہیں کھول سکتے جو کبھی ساحل سے نہیں بندھی
اور نہ پرندوں میں ایک پرچھائیں کی آواز سن سکتے ہو
اور نہ کبھی زندگی سے خوف کے بغیر گزر سکتے ہو

ہمارے لیے جو کچھ بچ گیا ہے، وہ سب ہیں
یہ بھورے چھوٹی مکھیوں کی طرح شکستہ
جو چھتے سے جدا ہو کر مر جاتی ہیں

شفاف رات کی گہرائی میں کبھی پہاڑی جنگل کی آسودگی میں
خوشبودار ننھے پھولوں میں اور ماسی میں
وہ شور کر رہی ہیں

مگر ابھی دل میں میرا یہ بدوضع مقصد
ان مردہ مکھیوں کی خوشبوں میں چھپاکی ڈال لو
جنھوں نے کبھی شہد سے سورج بنایا تھا

نظم

سر کی حلقہ سردی سے جھنجھنا رہی ہے
کوئی باہیں میں گرتا

وقت مجھے تمہارے جوتے کی ایڑی کی طرح
کس رہا ہے

زندگی زندگی پر غالب آ جاتی ہے
آواز ڈوب جاتی ہے
کسی ایک چیز کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی ہے

Scanned with CamScanner

تمہارے لیے میں سیاہ الفاظ نکال لوں گی
مشکل پانی سے بھر جاؤں گی

ماریا کیجل بوژن کا سہرا
کوئی مرد کا انتظار نہیں کر سکتا اسے مسرور ہو جانا چاہیے
میں تمہارے دروازے پر کھڑا ہوں۔ خدا کے لیے جاؤ، مت جاؤ
رک جاؤ

افضال احمد سیّد

عظیم ناموں سے ابتدا

ہم بالکل نہیں جانتے
ایلس رینڈال اس وقت کہاں ہے
کل وہ ہوٹل کے سوئمنگ پول کے مغربی کنارے پر تھی
اور گومرا کیمپ کا ابراہیم بورک
سمی کارپوریشن کی پانچویں منزل پر اسے
دوربین میں دیکھ رہا تھا

اگر وہ ریشم کا کیڑا ہوتا تو اسے اپنے کوکون میں بند کر لیتا
اور دونوں ایک ساتھ کھولتے ہوئے پانی میں ڈالی جاتی

ہماری تمام ہمدردیاں اور رنجش
ان لڑکیوں کے ساتھ ہیں
جنہوں نے اپنے محبوب کو جلدبازی اور بدتمیزی کے ساتھ
رخصت کر دیا
اور ہماری محبت
اس لڑکی کے لیے
جس کی انگلیوں میں تیرباری کا وقت ہے
اور جس کے ناخنوں کی پالش تاریکی میں جگمگاتی ہے
وہ دولت کی نسل کو بچانے کے لیے سرگرم ہے

صبح سے بچی رات
اس کے ہرے کٹے ہوئے بالوں میں گزری
جب ہم جرمنی کے اتحاد پر ایک دوسرے سے اختلاف کر رہے تھے

Scanned with CamScanner

پھر بھی ہم جانتے ہیں
فن ایک برابر ارتست ہے
جو کسی تماشائی کے بغیر
ہمیں ہی کا مقابلہ کیے جا رہا ہے

ویلالی وانگ اگ
ابھی کمرے میں ہے اور خوش ہے
اور اس حالت میں کسی مہمان کا استقبال کر سکتی ہے
مگر ہمارا علم محدود ہے

ہمیں آج ہی سے
میسبیلڈ اسٹریٹ پر
شام کو ساڑھے پانچ بجے گزرنے والی دو لڑکیوں کو
بیلی اور بیاتریچی کے نام سے پکارنا چاہیے
تاکہ ہم دو عظیم ناموں سے ابتدا کر سکیں

صرف غیر اہم شاعر

صرف غیر اہم شاعر
رکھتے ہیں
بچوں کی غیرضروری اور سفید پھولوں والی نام چینی کی پلیٹ
جس میں روٹی ملتی تھی

صرف غیر اہم شاعر
بےشرمی سے ملکہ تھیں ہیں
یہی نظموں میں
یہی محبوبہ کا نام

صرف غیر اہم شاعر
یاد رکھتے ہیں

بدشکلی سے تلاش لیا ہوا ایک کمرہ
باغ میں کھڑی ہوئی ایک لڑکی کی تصویر
جو پھر کبھی نہیں ملی

مجھے ایک کہانی سناؤ

مجھے ایک کہانی سناؤ
اس کے علاوہ کہ تم مجھ سے حاملہ ہو گئی ہو
اس کے علاوہ کہ تم اس لڑکی سے زیادہ خوبصورت ہو
جو مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے
اس کے علاوہ کہ تم ہمیشہ سفید بلاؤز کے نیچے
سفید بریزیئر پہنتی ہو

مجھے ایک کہانی سناؤ
اس کے علاوہ کہ اہرام کو سب سے خوبصورت کس نے بنایا تھا
اس کے علاوہ کہ اہرام میں نظر آنے والی ہر شے خوبصورت ہوتی ہے
اس کے علاوہ کہ غلام لڑکیوں کے ہاتھوں سے
شہزادیوں کے آئینے کیسے گر جاتے تھے
اس کے علاوہ کہ شہزادیوں کے حمل کیسے گر جاتے تھے
اس کے علاوہ کہ شہر کیسے گر جاتے تھے
اور فصیل،
اور علم،
اور مقابلہ کرتے ہوئے لوگ

مجھے ایک کہانی سناؤ
اس کے علاوہ کہ ڈیٹ لائن سے گزرتے ہوئے
تم کپتان کے کیبن میں نہیں سوئیں
اس کے علاوہ کہ تم نے کبھی سمندر نہیں دیکھا
اس کے علاوہ کہ ڈوبنے والوں کی فہرست میں کچھ نام
ہمیشہ درج ہونے سے رہ جاتے ہیں

Scanned with CamScanner

مجھے ایک کہانی سناؤ
اس کے علاوہ کہ بچھڑی ہوئی جڑواں بہنیں مرتعش ہیں
ایک دوسرے سے کیسے ملیں
اس کے علاوہ کہ کوئی سا پھول کسی شخص کے آنسوؤں سے اگا
اس کے علاوہ کہ کوئی جلتے ہوئے تندور سے روٹیاں نہیں چراتا

مجھے ایک کہانی سناؤ
اس کے علاوہ کہ صابح نامی کی مہر عجائب گھر سے کیسے غائب ہو گئی
اس کے علاوہ کہ ایک ہر ظلم کو غلط نام سے پکارا جاتا ہے

مجھے ایک کہانی سناؤ
اس کے علاوہ کہ تمہیں ہونٹوں پر بوسہ دینا اچھا نہیں لگتا
اس کے علاوہ کہ میں تمہاری زندگی میں پہلا مرد نہیں تھا
اس کے علاوہ کہ اس دن بارش نہیں ہو رہی تھی

فوجی ورجِل کی زمیں چھین لیتے ہیں

فوجی ورجل کی زمیں چھین لیتے ہیں
جس کو واپس ہونا ہی
دو علاقوں اور روم تک سفر
کی قیمت ہے

کوئی نہیں جانتا
وہ وہاں کب تک رہا
اور خانہ جنگی کسے عرصے تک
اس کو شاعری سے روکے رہی

سیزر آگسٹس
اسپین کی مہم سے "اینیڈ" کا پہلا مسودہ
طلب کرتا ہے

جو اسے چار سال بعد پڑھ کر سنایا گیا
بستر مرگ پر

ورجل مسلسل "اینیڈ" کا مسودہ طلب کرتا رہا
جلا دینے کے لیے
جو اسے فراہم نہیں کیا گیا

عذرا عباس

چوہے کو کیسے مارا گیا

چوہے کو مار دیا گیا۔
وہ یوں موت آپ مر گیا۔

مرنے سے پہلے وہ جانتا تھا کہ موت اس کی گھات میں ہے۔ وہ سب موت کی شکل میں اس کے اردگرد جال بُن رہے ہیں۔ وہ جب کسی کے پاؤں سے ٹکرا کر گزرتا وہ چونک جاتی اور زور سے اپنا پاؤں زمین پر دے مارتی، گویا وہ ان کے پاؤں کے نیچے اب آیا کہ جیسے لیکن وہ ہر مرتبہ بچ نکلتا۔

ایک دن وہ بڑے ہال میں گھس آیا۔ وہ ایسے خوش رنگ لباس میں جوڑوں کی شکل میں ملبوس تھے اور خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے بوس و کنار میں، اور بہت سے رقص ... کی شکل میں تھے۔

وہ روشندان سے داخل ہوا۔ ان کے درمیان رکھا ہوا بڑا کیک وہ سمجھ گیا تھا ... بہت سے زیادہ ... جانیں کب ... ان کی ... داخل ... وہ اب ... کے ... سے سر سراتا ہوا ان کے برابر بیٹھے ہوئے اس کی کری کی جوتی کی ایڑی سے خود کو گھسیٹتا ہوا پھدکا اور بڑی میز کے کونے کونے گھومنے لگا۔ پھر وہ اس کیک کی بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا جو ان سب نے بڑی محنت سے بنایا تھا جو بوس و کنار میں مشغول تھے اور ایک دوسرے پر اپنے لعاب لتھڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کی نظر اچانک اس پر پڑی۔ وہ اس زبان اسی طرح کھینچتے ہوئے جیسے اس نے اپنے ساتھی کے منہ میں دی ہوئی تھی، کھڑا ہو گیا۔

اوہ، اوہ... سب نے چونک کر دیکھا۔
چوہا کیک پر ٹھمک رہا تھا۔

چوہے نے چبا کر ایک گالی ان کے منہ پر نکالی۔ اب تمہیں میرے جسم کی خوشبو سے لتھڑا ہوا یہ کیک کھانا ہو گا یا پھر وہ اسے میرے لیے پھینک دیں گے۔

یہ مجھے مارنے کی کیسی کیسی ترکیبیں سوچیں گے۔ واہ واہ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ ایسی کوئی موت نہیں مرے گا جیسی انہوں نے اس کے لیے سوچ رکھی ہے۔ وہ ٹھمک رہا تھا

اور وہ سب اپنے کیک کی بربادی پر چیخ رہے تھے۔ کسی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ڈاکٹر بولا چوہا کہاں تھا؟ وہ سب کیک کی طرف دوڑ پڑے۔ چوہا خود حیران تھا۔ وہ تمام ... کی ... میں گھس کر حیران تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ آتیں، چوہا کیک میں ایک لمبا سوراخ کرتا ہوا مجمع میں گھبرائی ہوئی ... کے فراک پر چڑھ کر اس کے سرخ ... کو ... ہو وہاں سے بھاگ نکلا

چوہے کی ان حرکتوں سے وہ ... ان ... کی ... کو چوہے دانوں سے بھر دیا

اور بہت سے چوہے مارنے کی ... لیکر وہ اسی شان سے دندناتا رہا اور زندہ رہا۔ آخر انہوں نے ایک ... میں یہ طے کیا کہ ان چوہوں سے نجات کا کوئی طریقہ نہیں ہے لہٰذا کچھ عرصے کے لیے وہ اس علاقے سے چلے جائیں۔

پھر وہ سب چلے گئے۔

اب چوہا اکیلا تھا۔ ان کے گھروں کے چوہے دان ... چکے تھے۔ وہ خالی کمروں میں دالانوں میں اداس پھرتا۔ اس کی ساری شوخیاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ سب چالاکیاں اور ... جو ... کی ... اس کے دل میں تھیں۔

پھر ایک دن وہ خود ... میں دب کر مر گیا۔

چوہے کو مارا نہیں گیا۔

ایک نظم اسی سے

[illegible]

وہ میرے سینے پر اپنا سر رکھ دیتی ہے
میرے پستانوں سے کھیلتی ہے
میرے ہونٹوں کو چوستی ہے
میری ناف کے نیچے
بہت نیچے
میری سانس اوپر کی اوپر رہ جاتی ہے
میں کنواریوں کی طرح
سنسناتی ہوں
بل کھاتی ہوں
وہ مجھے اٹھاتی ہے
میرے کپڑے ایک ایک کر کے اتارتی ہے
وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ایسی ہی مبہوتہ
حیرت سے اور خوشی سے
اچھوتے
وہ میری گردن میں باہیں ڈال کر
کہتی ہے
وہ مجھے غور سے دیکھتی ہے
اور کینوس پر میری مادرزاد
تصویر بناتی ہے
میں مبہوتہ ہوکر رہتی ہوں
میں ڈرتی ہوں کہ کہیں وہ چھوڑ نہ جائے
میں اسے چھونا چاہتی ہوں
ایک ہی وار میں اس پر جھپٹ پڑنا
اس پر پنجہ گاڑ کر حملہ کرنا
میں بھی چاہتی ہوں [illegible] سے ایسے ہی
پس حرکت میں نہ آئی
سکی اس سے پہلے کہ

میں حرکت کروں
وہ چھم چھم کرتی
کھڑکی یا دروازے سے باہر
بھاگ جاتی ہے
میں مبہوتہ
حیرت اور خوف سے
اور ملامت سے
آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی
رہتی ہوں
وہ چلی جاتی ہے
روز ایسا ہی ہوتا ہے

Scanned with CamScanner

بیری پین

انگریزی سے ترجمہ : نیّر مسعود

شحرالموت

وہ صبیت مجھ کو شام کے جھٹپٹے دھندھلکے میں دکھائی دیتی تھی۔ اس وقت وہ دوسری عورتوں کے ساتھ دریا پر سے واپس ہوتی تھی۔ میرے لیے وہ محض بڑی کشش ہو کرتا تھا جب وہ، جو دن بھر میرے دل میں رہتی تھی، آخرکار میری نظروں کے سامنے آ جاتی۔ کبھی کبھی وہ بہت جلد میری نگاہوں سے اوجھل ہو کر اپنے گھر کے اندر چلی جاتی۔ اور کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ایک کھلی مکان کی دیوار کے پاس بیٹھ کر وہ داستانیں سنتا اور وہ بھی دوسروں کے ساتھ مکان کے زینے پر سمٹ کر بیٹھی ہوتی، داستانیں سنا کرتی۔ اور میں بڑے اشتیاق سے دیکھتا تھا کہ داستان کا عکس اس کی آنکھوں میں یوں جھلک رہا ہے جیسے گہرے پانی میں درختوں کا عکس پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ میرے برابر برابر چلنے لگتی اور میرے ساتھ باتیں کرتی۔ سرگوشی اور مجبوری کی یہ شامیں مجھ کو بہت دنوں تک یاد آیا کریں۔

اور پھر ایک دن میں راوی کے پاس جا پہنچا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا اور اس کا تعلق ہماری نسل سے نہیں تھا۔ وہ کسی دوردراز سرزمین کا باشندہ تھا اور کئی مہینے تک دریا کے کنارے سفر کرتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ اپنی جان بچا کر وطن سے فرار ہوا تھا۔

واقعی میں نے اس سے کہا "آج شام اُس کو بھی کہانیاں سنانا۔" پہلے تو اس نے ہاتھ ہلا کر انکار کر دیا۔ لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ میں اس کے واسطے لایا تھا تو راضی ہو گیا۔ اور میں نے یہ سب اس لیے کیا تھا کہ میری آنکھیں اُس کو دیکھنے کو بے حد تڑپ رہی تھیں اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ آج شام بھی میرے قریب سے ہو کر نکلتی چلی جائے۔

اور جب اس سیاہ رنگ راوی نے اپنے عصا کی نوک سے ریت پر لکیریں کھینچ کر اپنے دوراُفتادہ وطن کے قصے چھیڑے تو سننے والوں کے حلقے میں وہ بھی تھی۔ اور میں سب سکتے میں آ رہا تھا۔ میری حالت اس انسان کی سی تھی جو پیاس سے بےحال ہو اور بہت دور پر

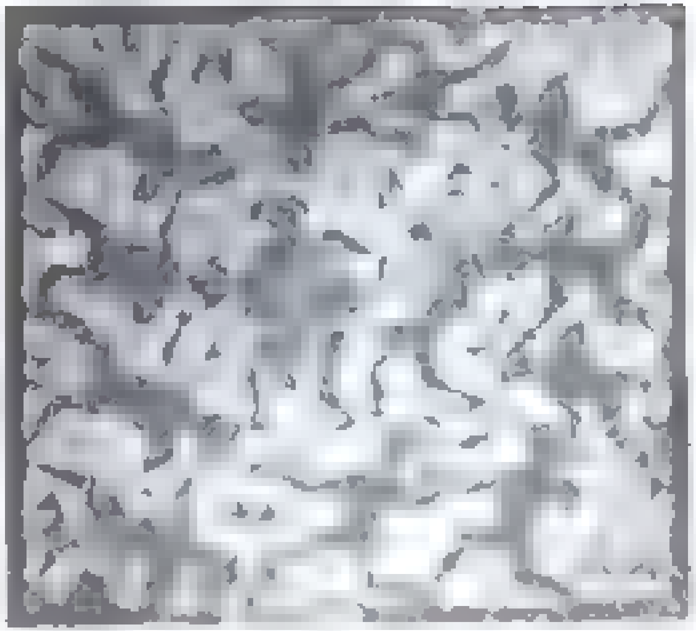

Scanned with CamScanner

اسے پانی دکھائی دے رہا ہو۔

اور اسی دن راوی نے ہمیں ایک درخت کے بارے میں بتایا جسے شجرالموت کہتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ اس کا بیج چاندی کی طرح چمکتا ہے اور جسامت میں ایک مٹھی کے برابر ہوتا ہے۔ اگر اس بیج کو زمین میں دبا دیا جائے تو دو سال تک وہ یوں ہی دبا پڑا رہتا ہے اور پھر [illegible] کا ظہور ہوتا ہے پھر آفتاب کے طلوع اور غروب کے درمیان شجرالموت پورا درخت بن جاتا ہے۔ وہ ناقابلِ یقین سرعت کے ساتھ بڑھتا ہوا دو قدآدم کے برابر ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ اپنی اس مختصر زندگی میں شجرالموت کسی انسان کا خون پینا چاہتا ہے۔ وہ ہر طرف ایک مسحور کن خوشبو پھیلاتا ہے۔ یہ خوشبو نیند لاتی ہے اور موت بھی۔ اور یہ اپنی بڑی بڑی ہوتی اور اینٹھی ہوئی جڑوں سے اپنے شکار کو جکڑ لیتا ہے۔ اور اس کی ہر شاخ میں [illegible] ہوتی ہیں۔ اور ان میں کا ہر [illegible] اس طرح انسان کا خون چوستا ہے جس طرح جونک کا منہ خون چوستا ہے۔

اور اسی سلسلے میں اس نے ہمیں ایک بیوہ عورت اور ایک مرد کے دلگیر انتقام کی کہانی سنائی۔ اس مرد نے رشتے کے وقت چپکے سے اپنی بیوی کے عاشق کے باغ میں شجرالموت کا بیج گاڑ دیا۔ لیکن دو برس بعد جب درخت نکل آیا تو اس نے اس خوبصورت عورت کا خون چوس لیا جس کی خاطر عاشق نے بیوی کو چھوڑ دیا تھا۔ اس عورت کی سنہری رنگت [illegible] باغ میں پانی گئی۔ اور یہ شجرالموت کی پژمردہ اور کمہلائی ہوئی [illegible] رنگ کی بیل ہے جو اس شجرالموت سے نکلی تھی۔

اور اب تمام عالم میں وہ سیاہ رنگ [illegible] شجرالموت کے بس بیج ہی تھے جو باقی رہ گئے تھے۔ [illegible] اب تک [illegible] ہوا میں گ[illegible] یہ۔ [illegible] دو بار [illegible] ہاتھوں کی انگلیاں پھیلائیں اور سمیٹ لیں۔ "یہاں" اس نے [illegible] پانچ برس تک اور [illegible] کو [illegible] زائل ہو گئی۔ اور تب وہ بے ضرر کنکری ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر ابھی کسی مرد، کسی عورت کو شجرالموت کا طلسم دیکھنے کو نہ ملے گا۔

میں نے اس کی کہانی کو مختصر کر کے بیان کر دیا ہے۔ اس نے سب کچھ بڑی تفصیل سے ساتھ بتایا تھا۔ اس نے اپنے الفاظ سے واقعات کی ایسی زندہ تصویریں کھینچی تھیں کہ [illegible] تھے۔ اور اس دوران میں سارے وقت میری نظریں اس عورت پر جمی رہیں جس سے [illegible] بے سود محبت کرتا تھا۔ وہ کسی سحرزدہ کی طرح اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی۔ [illegible] کے ہاتھ میں ایک ارغوانی پھول تھا جس کو اس کی انگلیاں مسلسل نوچ نوچ کر پھینک رہ

میں سرخ چنگاریاں ریت پر گرتی ہوئی خون کی بوندیں معلوم ہو رہی تھیں اور [illegible] ڈوبتا ہوا سورج بھی خون کی طرح سرخ تھا۔

اور جیسے ہی راوی نے قصہ ختم کیا، صحرا میں ایک گیدڑ نے چیخ ماری۔ اور اسی وقت ایک لڑکے نے لپک لپک کر کہا کہ بڈھا جھوٹ بہت اڑاتا ہے۔

"کتّے کی اولاد! میں جھوٹ نہیں بولتا۔" راوی بھڑک کر بولا۔ "میں وہی بتا رہا ہوں جو میں نے خود دیکھا ہے۔ اور جس کا مجھے علم ہے۔ دیکھا اس ہاتھ میں، اسی ہاتھ میں شجرالموت کا بیج رہ چکا ہے۔ ہاں یقیناً۔" وہ تن کر کھڑا ہو گیا اور اس کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔

"وہ میں نہیں تو کون تھا؟" اس نے کہا، "جس نے اپنے رقیب کے باغ میں وہ بیج بویا تھا۔"

ہم سب پر خاموشی طاری ہو گئی اور وہ مڑا اور رخصت ہو گیا۔ اور اب اس شام پہلی بار اس عورت نے میری طرف دیکھا اور اس کے ہاتھوں نے ایک مبہم سا اشارہ کیا تو میں اٹھا اور اس کے پیچھے پیچھے خیمے تک پہنچ گیا۔ اور وہاں ہم دیر تک بیٹھے ہوئے چاند کی روشنی میں باتیں کرتے رہے۔

"تم میری بڑی تعریفیں کرتے ہو اور کہتے ہو کہ میں بہت حسین ہوں۔" وہ کہنے لگی، "ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو، لیکن یہ سب سننے میں بڑا اچھا لگتا ہے۔ تم نے میرے باپ کو بہت سے تحفے لا کر دیے، اور تحفے دینا بھی بڑا اچھا لگتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں تم نے بوڑھے راوی کو بھی کچھ انعام ضرور دیا ہے اس لیے کہ اس نے دوسروں کے مقابلے میں تمہارا مقدمہ پیش کیا۔ اور یہ سب سے اچھی بات ہے۔ اس لیے کہ ہر دن دوسرے دنوں کی طرح ہوتا ہے اور ہم ایک ہی طرح چکر کاٹتے ہیں، جیسے رہٹ چلانے والا بیل آنکھوں پر پٹی بندھوائے [illegible] وقت ہم نئی کسی طرح سے جیتے ہیں اور ہر دم [illegible] رہتے ہیں۔ لیکن پھر، پھر تم مجھ سے محبت جتاتے ہو اور چاہتے ہو کہ میں بھی تم سے محبت کروں۔ مگر ایسی چیز کوئی کسی کو کیونکر دے سکتا ہے جو اس کے پاس موجود ہی نہ ہو! دوسرے لوگ بھی مجھ سے اسی طرح محبت کی باتیں کرتے ہیں اور انہیں بھی یہی جواب ملتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ میری عمر کا قصور ہو، کیونکہ ابھی میں بہت چھوٹی ہوں۔ ہو سکتا ہے کسی دن میرے اندر بھی یہ آگ بھڑک اٹھے۔ لیکن ابھی جب تم مجھ سے محبت کی باتیں کرتے ہو تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں کسی ایسی لکھائی کو دیکھ رہی ہوں جسے پڑھنا مجھے نہیں آتا۔ لیکن پھر بھی، پھر بھی میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"بولتی رہو۔ تمہاری آواز بڑی اچھی لگ رہی ہے۔"

میں اس کہانی کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے وہ پوری کہانی جانتے

سمجھ نہ ہو سکی۔ اس میں کچھ سچائی ضرور ہے۔ میں تمہیں اس کی وجہ بتاتی ہوں، جو میں نے آج تک کسی کو نہیں بتائی۔ نو برس ہوئے ایک بوڑھی عورت اسی مکان میں تم لوگوں کے قریب تھی۔ اور جن لوگوں کو اس کے سرہانے رہنا چاہیے تھا وہ ڈر کے مارے اسے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، تو میں اس کے لیے دریا پر سے پانی لے گئی۔ اس نے بہت تڑپ کر پانی پیا۔ اس کے بعد تب بڑی ہوئی تھی۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ اپنے بائیں ہاتھ کی چلو میں پانی بھر کر اس کی آنکھوں کے قریب کروں تاکہ وہ اسے دیکھ سکے۔ اور وہ اس پانی کو اتنی دیر تک دیکھتی رہی کہ میرا ہاتھ کپکپانے لگا۔ پھر اس نے وہ بات کہی جو میں نہ کبھی بھول سکی نہ کسی کو بتا سکی۔ اس نے کہا تھا: مرتی ہوئی آنکھ نے جو میں نے دیکھ لیا، اور جو میں کہتی ہوں وہ ہو گا۔ تیرا محبوب تیرے پاس ہوگا تو اس کے ہاتھ میں ایک گولا ہو گا جو چاندی کا سا ہو گا لیکن اس کا رنگ چاندی کا سا ہو گا۔ اور اس گولے میں زندگی ہو گی اور موت ہو گی۔

آج رات مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ گولا شجر الموت کا بیج ہے۔ پتا نہیں وہ بیج کہاں ہو گا۔ بوڑھی نے بتایا تھا کہ اس کی بڑی حفاظت کی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس بیج کو لانے کے لیے تمہیں اور لمبا سفر کرنا پڑے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی خاطر خون بہے۔ اور یہ بھی کہ اس کا سودا بہت مہنگا پڑے۔ لیکن میں اب ضرور جانتی ہوں کہ جس دن تم اپنے ہاتھ میں شجر الموت کا بیج لیے ہوئے آؤ گے تو میرے دل میں تمہاری محبت کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ میرا سر تمہارے آگے جھک جائے گا، میری آنکھوں میں شک چھپ جائے گا اور میرا سب کچھ تمہارا ہو جائے گا۔

اور جب میں بولا تو میری آواز جانے کہاں گئی۔ میں نے اس سے پوچھا:

"یہی بات تم نے کسی اور سے تو نہیں کہی؟"

ساپا نے کہا کہ تم پہلے آدمی ہو جس سے میں نے یہ بات کہی ہے۔ اور اگر تم قسم کھا کر کہو کہ مجھ کو وہ روپہلا بیج لا دو گے تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس وقت تک یہ بات کسی اور سے نہ کہوں گی جب تک تم کوشش کر کے ہار نہ جاؤ۔ میں نے اس کام کے لیے تم کو کئی وجہوں سے چنا ہے۔ تم شریف آدمی ہو۔ اور جب میرا حسن چلا رہے گا اور تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ دو گے تب بھی تم مجھ پر ستم کرنا شروع نہیں کرو گے۔ تم ان رئیسوں میں ہو جیسے میرے عشق کے دوسرے طلب گار ہیں، لیکن پھر بھی تم خرچ کرنے میں اس طرح کنجوسی نہیں دکھاتے۔ تم نے روزی کو انعام بھی تو میری ہی خوشی کے لیے دیا تھا۔

"تمہاری خوشی کے لیے۔ اور اپنی خوشی کے لیے بھی۔ کیونکہ تمہیں خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہوتا ہوں۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے شجر الموت کا حال کبھی معلوم

نہ ہوتا۔ اور یہی مقدر کی ... کا بھی ... جانتی ہوں کہ مجھ کو تم سے محبت نہیں ہے، ذرا بھی نہیں، پھر بھی میں سب سے پہلے تمہارے ہی پاس آئی۔ لیکن اگر تمہیں یہ کام مشکل یا خطرناک معلوم ہوتا ہو تو—"

"نہیں نہیں، شہورا!" میں نے کہا۔ "یقین کرو میرے دل میں تم بھر کے لیے بھی کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہوا۔ وہ روپہلا بیج دنیا میں کہیں بھی ہو، میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا اور تمہارے پاس لے آؤں گا۔ اس سے مجھے موت تک بھی کوئی شے روک نہیں سکتی۔"

"بس یہ بہت ہے،" وہ بولی۔ "اور تم اسے کب تک لے آؤ گے؟"

"ابھی کہہ نہیں سکتا کہ اس میں کتنی دیر لگے گی۔ اگر اس میں ایک سال لگ جائے تو کیا تم اتنی دیر میرا انتظار کر لو گی؟"

"ہاں ایک سال تک۔ لیکن میں نے بہت دیکھا ہے کہ محبت پانی کی طرح اڑ جاتی ہے اگر دیکھ بھال نہ کی جائے۔ ... کے بعد تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی تو اسے میرے پاس مت لانا، کیونکہ اس وقت کہیں ایسا نہ ہو کہ بیج کے ساتھ دکھ چلے آئیں۔"

میں نے پاس بہتے ہوئے دریا کی طرف اشارہ کیا۔

"دریا ہمیشہ بہتا رہتا ہے،" میں نے کہا، "لیکن دریا ہمیشہ اسی جگہ پر موجود رہتا ہے۔ میرے دل میں تمہاری محبت بھی دریا کی طرح ہے۔"

جب ہم رخصت ہونے لگے تو میں نے اس سے پوچھا،

"کیا تم جانتی ہو کہ تمہیں شجر الموت کا بیج مل جائے گا؟"

"میرے لیے،" اس نے کہا، "بس وہ مقدر کی ایک نشانی ہے اور کچھ نہیں۔ اگر تم اسے لے آئے تو میں تم سے محبت کرنے لگوں گی۔ اگر تمہارے مقدر میں اسے لانا نہیں ہے تو کوئی اور لائے گا، اور پھر میں اسی سے محبت کرنے لگوں گی۔ اور رہا خود وہ بیج، تو وہ قسمت سے پیدا ہوا ہے۔ اس سے میں اسے آگ میں ڈال دوں گی۔ یا ہو سکتا ہے—" اس نے مجھے نظر بھر کر دیکھا، "میں اسے اپنے پاس ہی رکھے رہوں، یہاں تک کہ اس کا اثر ختم ہو جائے۔ تب میرے بچے اس سے کھیلا کریں گے۔"

اس رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ خوشی اور غم کے درمیان میرے خیالات اس گیند کی طرح بھٹک رہے تھے جس کو کھلاڑی ادھر سے ادھر پھینکتے رہتے ہیں۔ خوشی اس بات کی تھی کہ آج اس نے میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے باتیں کیں۔ اور ... ایک راز بتانے کے لیے مجھ پر بھروسا کیا۔ اور اس نے خود اپنی مرضی سے مجھے اس کا موقع دیا کہ میں اس کی محبت حاصل کر سکوں۔

غم اس کا تھا کہ اس کو اب بھی مجھ سے محبت نہیں تھی۔ اور یہ کہ اگر میں اپنی مہم میں ناکام رہا تو وہ مجھ سے کبھی محبت نہیں کرے گی، تو وہ کسی اور سے محبت کرے گی

Scanned with CamScanner

ملک میں … راوی … یہ بتایا تھا کہ خنجر موت کے تین بیج موجود ہیں! تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اگر ایک بیج میں حاصل کر لوں تو کوئی دوسرا شخص بھی ایک بیج پا جائے اور پھر زیادہ تیز رفتار سے یا کسی مختصر راستے سے سفر کر کے میری محبوبہ کو مجھ سے چھین لے جائے۔

علاوہ ازیں، خود میں اس مہم میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتا لیکن اگر میرے مقدر میں اس کی محبت نہیں تھی تو میری ناکامی یقینی تھی، اور اگر وہ میری قسمت میں تھی تو چاہے میں اپنے گھر میں آرام سے بیٹھا رہتا اور کوئی خطرہ مول نہ لیتا، بہرحال … میرے ہاتھ میں خنجر موت کا روپہلا بیج لا کر رکھ دیتا۔ اور اس طرح سوچتے سوچتے میں اس پرانے محاورے کا قائل ہونے لگا جو سنگ خارا کی طرح قدیم اور مضبوط اور سخت ہے کہ جو لکھ دیا گیا وہ لکھ دیا گیا، اور جو ہونا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

یہ سب سہی، لیکن اگر مجھ کو وہ عورت نہ ملتی تو سونا اور جواہرات اور مویشی اور کتنی ہی سرسبز کشت زار میرے کس کام کے تھے۔ اس کے بغیر زندگی ہی کی کیا قیمت تھی۔ تب میں نے طے کر لیا تھا کہ سب کچھ داؤ پر لگا دوں۔ آخر میں نے خود بھی دیکھا ہے اور کتنی ہی داستانوں میں سنا تھا کہ جو اس مہم میں سے کوئی بڑی قربانی دیتا ہے اس کو جاں بازی کا صلہ ضرور ملتا ہے۔

صبح کے مطابق صبح نماز پڑھ کر مجھے بستر پر بیٹھا ہوا ملا۔ گو طلوع آفتاب کو کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ جسمانی طور پر کاہل تھا، حالانکہ اب بھی اس میں کام کرنے کی سکت موجود تھی۔ جو لوگ اتفاقاً اس کی داستانیں سن لیتے تھے، وہ اس کو چھوٹے موٹے انعام دیا کرتے تھے لیکن اگر کوئی میری طرح خاص طور پر اس سے داستان سنواتا تو انعام بھی زیادہ ہوتا … اس طرح اس کی روزی چلتی تھی۔

اور جب میں … ہو کر اندر داخل ہوا تو شروع میں اس کو کچھ ناگوار معلوم ہوئی لیکن ذرا دیر بعد وہ مجھے اچھی طرح دکھائی دینے لگا، اور میں سمجھ گیا کہ … وہ پہنے ہوئے ہے … اسے کسی نے دیا ہو گا، اور وہ ڈھیلی چپلیں جو اس کے قریب ہی رسی پر رکھی ہوئی ہیں اسے کسی سے ملی ہوں گی۔

اور … سلامت کے بعد … نے اس سے کہا

"ایک بہت خاص معاملہ ہے میں تمہیں اس کے بارے میں ابھی تفصیل سے بتاؤں گا۔ مجھے اس میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر تم میری مدد کر سکو تو میں اس کے انعام میں تم کو بہت قیمتی تحفہ دوں گا۔ اور میرے باغ تک چلو، وہاں اطمینان سے گفتگو ہو گی، وہاں سایہ بھی خوب ہے اور نارنج کے پیڑ میں ابھی کچھ پھل بھی لگے ہوئے ہیں۔"

اس پر … اس کی … میری پاکیزہ … کو شکوک سے بالاتر، اور خود کو میرا خادم قرار دیا۔ اس نے بستر سے اٹھ کر چپلوں میں پاؤں ڈالے اور انھیں رسی پر

نارنج کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اس نے قہوہ تو پی لیا لیکن پھل دوسرے وقت کے لیے اپنے لبادے میں رکھ لیے۔

"کل رات،" میں نے اس سے کہا، "تم نے مجھے خنجر موت کا حال بتایا تھا۔"

"اور اسی کی وجہ سے،" وہ بولا، "آج سویرے ایک عورت میرے لیے نان اور قہوہ لائی لیکن وہ قہوہ اتنا اچھا نہیں تھا جتنا یہ ہے۔"

"کیا وہ خوب صورت تھی؟"

وہ ہنسا "عشق تھی؟ لیکن افسوس کہ اب میں بڈھا ہو گیا۔ خیر، جب میں کہہ ہی چکا تو پھر نکلا اور اس … کو پکڑا جس نے مجھے جھوٹا کہا تھا اور … سے اس کی ایسی مرمت کی کہ وہ بلبلانے لگا۔ کس واسطے کہ میں نے تو ان چیزوں کا حال بتایا تھا جو رہ چکی ہیں اور اب بھی ہیں، یہ ضرور ہے کہ میں ایسی چیزوں کی کہانیاں بھی سناتا ہوں جو ہو بھی سکتی ہیں، اور یہ کہانیاں سننے میں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ … کیا یہ مطلب ہے کہ نوعمر لڑکے بزرگوں کو ذلیل کریں؟ خیر چھوڑیے، براہ کرم یہ بتائیے کہ وہ کون سا معاملہ ہے جس میں آپ کو میری مدد مطلوب ہے؟"

"میں خنجر موت کے ان تین بیجوں میں سے ایک لانے جا رہا ہوں۔ اس کے بغیر میری زندگی، اور جو کچھ مال ومتاع میرے پاس ہے سب ہیچ ہے۔ اور یہ تم ہی بتا سکتے ہو کہ اس کے لیے مجھے کہاں جانا اور کیا کرنا ہو گا۔"

"اگر کوئی آدمی پوری رفتار سے … سفر کرے تو وہ چار مہینے میں یہ مسافت طے کرے گا۔"

"تو پھر میں چار مہینے میں یہ سفر پورا کر لوں گا۔"

"مگر راہ کے خطرے بھی تو ہیں رہزن، درندے۔"

"مجھے ان کا خوف نہیں،" اور میں نے اسے خنجر دکھایا جو میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

"لیکن آپ کو اس ملک میں جانا ہو گا جہاں اجنبیوں پر شبہ کیا جاتا ہے اور جس جگہ روپہلے بیجوں کو محفوظ کیا گیا ہے وہاں تو کوئی اجنبی قدم ہی نہیں رکھ سکتا۔ ان بیجوں کی حفاظت کے لیے ہی پہرے بٹھائے ہیں۔ پہلے تو پہریدار … ایک بڑا حصار ہے پھر اس کے اندر دوسرا اور اس کے اندر تیسرا حصار۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے بدن کو رنگ کر میرے بدن کی طرح سیاہ کر لیں، لیکن نہ آپ ان لوگوں کی زبان بول سکتے ہیں نہ آپ کو ان کے طور طریقے معلوم ہیں۔ اور اگر آپ زور زبردستی سے کام نکالنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو تنہا ایک انبوہ سے نمٹنا پڑے گا۔ غرض یہ کہ اگر آپ نے یہ سفر کیا تو … واپس نہیں … بلکہ یہ کہ آپ روپہلے بیجوں کو دیکھ بھی نہ سکیں گے دوسری یہ کہ بہت جلد آپ ہلاک ہو جائیں گے۔"

"تم اس کے بعد کسی اور طریقے سے میری مدد نہیں کر سکتی؟"

"ہو سکتا ہے اس کی بھی کوئی صورت نکل آئے۔ آپ نے سچ کہا کہ بڑا خاص معاملہ ہے۔ اس میں بہت غور و فکر اور ناپ تول کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں واپس جاؤں اور اس معاملے میں غور کروں۔ کل پھر اسی وقت آپ کے پاس آؤں گا۔"

میں نے اس انجام دہ کو رخصت کیا۔ اس کے لبادے میں بہت سے پھل تھے جن کی وجہ سے زیادہ عجیب طریقے پر پھولا ہوا تھا۔

وہ دوسرے دن وہ حسب وعدہ واپس آیا اور کہنے لگا:

"ایک اور صرف ایک راستہ ہے۔ ممکن ہے اس طرح آپ کو وہ شے مل جائے جس کی آپ کو تلاش ہے لیکن اس کا مل جانا ضروری بھی نہیں۔ اگر آپ یہ راستہ اختیار کرنے پر تیار ہوں تو اس کے لیے دو باتیں لازمی ہیں۔ اول یہ کہ آپ کو مجھ پر پورا پورا بھروسا کرنا پڑے گا۔ جب بھروسا ہی نہ ہو سکے تو یہیں پر ختم ہو جا سکتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ کہ اس میں بہت زیادہ پیسہ لگے گا۔ اتنا کہ آپ کے پاس جو کچھ ہے، اس میں سے آپ کو بہت کم بچ پائے گا۔"

"اور تمہیں یقین ہے کہ یہی ایک راستہ ہے؟"

"[illegible]"

"[illegible]"

"آپ تو وہاں جا نہیں سکتے۔ لیکن آپ کی طرف سے میں جا سکتا ہوں۔ اور میں جانا چاہتا بھی ہوں۔ برسوں پہلے میں اس شہر میں ایک جاسوس کی طرح بسر کر چکا ہوں۔ اور اب میرے رشتے دار [illegible] بھی وہاں ہیں۔ اور [illegible] وہاں کے معبد کے سب سے اندر والے حصار کا پہرے دار رہ چکا ہوں۔ اور بہت سے ایسے راز جانتا ہوں جو میری قوم کے دوسرے لوگوں پر ظاہر نہیں ہیں۔ اگر شہر خموشاں کی تہ تک کوئی انسانی ہاتھ پہنچ سکتا ہے تو میں بھی اس کو حاصل کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کے لیے مجھے کچھ آدمیوں کو اجرت پر لینا ہو گا اور وہ آدمی معمولی اجرت کی خاطر ایسی مہم میں نہیں آئیں گے۔"

"اور پھر کب تک؟"

"میری روانگی کی تاریخ سے، خواہ میرے ہاتھ سے، خواہ کسی معتبر قاصد کے ذریعے، آپ کو روپیلا بیج مل جائے گا۔"

"یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ میں تم پر بھروسا کر لوں۔ کیونکہ تم سے کم از کم میں واقف تو ہوں۔ لیکن کیا مجھے کسی ایسے قاصد پر بھی اعتبار کرنا پڑے گا جو میرے لیے قطعاً اجنبی ہو؟"

"آپ اس پر بلا خوف و خطر اعتبار کر سکتے ہیں، اس لیے کہ اس کی اچھی اجرت اسی

وقت تک رکی رہے گی جب تک وہ آپ کے ہاتھ پر روپیلا بیج رکھ نہ دے۔ علاوہ بریں اسے یہ بھی علم ہو گا کہ اگر اس نے کسی قسم کی گھات کی تو نہ صرف اس کی جان لے لی جائے گی بلکہ اس کی اس محبوب بیوی کو بھی قتل کر دیا جائے گا جسے اس نے وطن میں ضمانت کے طور پر چھوڑا ہو گا۔"

"یہ سفر بہت سخت ہو گا اور تم اب بوڑھے ہو چکے ہو۔"

"میرے اندر ابھی کافی قوت محفوظ ہے کیونکہ میں نے زیادہ محنت سے خود کو دور رکھا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں دو طرح کے لوگ بہت تیزی سے سفر کرتے ہیں! وہ نوجوان جو اپنی محبوبہ سے ملنے جا رہا ہو اور وہ بوڑھا جو اپنے وطن لوٹ رہا ہو۔"

"راستے میں تمہارے لٹ جانے کا اندیشہ تو نہیں ہے؟ تمہارے ساتھ اچھی خاصی دولت ہو گی۔"

"اگر میں باربردار اونٹوں کی قطار ساتھ لے کر کسی رئیس التجار کی طرح سفر کروں تو اپنے راہ میں بڑے خطرے ہیں۔ لیکن میں ساری دولت اپنی کمر میں لپیٹ لوں گا اور دیکھنے میں قلاش معلوم ہوں گا۔ اس کا خطرہ ضرور ہے کہ دوران سفر کسی حیلے سے مجھے موت آ جائے، لیکن آپ کو اور مجھ کو اتنا خطرہ تو مول لینا ہی ہے۔"

"تمہیں اس کا یقین کیونکر ہے کہ تم کو روپیلا بیج مل جائے گا؟ جب یہ علم ہے کہ ان پجاریوں کی سپاہ میں شر ہے تو وہ ضائع نہ کر دیے گئے ہوں گے؟"

"نہیں، اس لیے کہ سب جانتے ہیں کہ ان کے شر کو اپنی موت مرنا چاہیے، اور جو لوگ انہیں ضائع کریں گے وہ اور بھی بدتر قسم کا شر پیدا کریں گے اور اس شر کی زد خود ان کے سروں پر پڑے گی۔"

"جب تم نے وہ بیج ابن رقیب کے باغ میں بویا تھا، کیا اس زمانے میں بھی اسے معبد ہی میں رکھا جاتا تھا؟ تو پھر تم نے حاصل کرنے کی تدبیر کیسے کی؟ [illegible] لائے ہو گیا؟"

"معبد پر نگہبانوں کی شہرت چوکی بیٹھی تھی، اور میں سب سے اندر والے برج کا نگہبان تھا۔ لیکن بیج اس زمانے میں وہاں نہیں تھا نہ کسی کو اس کی تاثیر کا علم تھا سوائے میرے۔ بعد میں یہ [illegible] اس کے دو برس بعد لوگوں پر اس کی تاثیر ظاہر ہوئی۔ [illegible] ایک اور ہی طریقے سے حاصل کیا تھا اور وہ طریقہ کیا تھا یہ مجھ سے مت پوچھیے گا کیونکہ وہ طریقہ میرے لیے بڑا شرمناک تھا۔"

وہ بہت سے سوال میں نے اس سے پوچھے اور ہر سوال کا فوری جواب اس کے پاس تیار تھا۔ اور میں خود تو کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہ تھا، کیونکہ میرے ذہن میں اپنی محبوبہ کے خیالات پھیرے لیے تھے۔ لہٰذا میں نے ہر معاملے میں وہی کیا جو بوڑھے نے کہا۔

اس کے بعد کئی روز تک میں اپنی مطبوعات فروخت کرتا رہا، یہاں تک کہ اس میں [illegible]

Scanned with CamScanner

نے کہا "بس، اتنا کافی ہے" پھر میں اس کے ساتھ لمبے دن کا سفر کر کے ایک قصبے میں پہنچا جہاں بڑی منڈی لگتی تھی، لیکن بیشتر کام منڈی میں نہیں بلکہ جوہریوں کی کوٹھی میں تھا، جہاں ہم نے الماس، زمرد اور موتی خریدے۔ اور موتیوں میں ایک جوڑی ایسی تھی جس کے دونوں دانے جسامت اور شکل اور وزن اور آب میں ہو بہو ایک دوسرے کی نقل تھے۔ جب راوی اس خزینے کو اپنی کمر میں لپیٹے کی پٹی میں باندھنے لگا تو اس نے ان دونوں موتیوں میں سے ایک میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور مجھے اس کی حفاظت کی سخت تاکید کی۔

"یہ اس لئے" اس نے کہا "کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور زیادہ امکان اس کا ہے کہ میں اپنے وطن ہی میں مرنا پسند کروں، جس قاصد کے ہاتھ میں روپہلا ہیچ بھیجوں گا، اسے میرے اسلاف کا حلف کبیر اٹھا کر سوگند کھانی ہو گی کہ وہ اپنا فرض پورا کرنے میں کوتاہی، کوئی دغابازی اور کوئی نافرمانی نہیں کرے گا۔ اگر کوئی شخص یہ حلف اٹھانے اور پھر بھی سوگند توڑ دے تو اس کو دریا میں کہیں پناہ نہیں ملتی اور بھیانک انتقام سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ اس لئے میرے قبیلے کا کوئی شخص اس وقت تک یہ حلف کبیر نہیں اٹھاتا جب تک اسے پوری تمام عمر کا یقین نہ ہو۔"

"انصاف کی بات ہے" میں نے کہا

"اس لئے جب وہ سچ مچ روانہ ہو گا تو میں اس کو جوڑی میں کا ایک موتی دوں گا اور جب وہ آپ کے پاس پہنچ کر روپہلا ہیچ آپ کے ہاتھ میں دے دے گا، اس وقت آپ دوسرا موتی دے دیجیے گا۔ تب وہ واپس آ کر مجھے دونوں موتی دکھائے گا اور یہی اس بات کی پہچان ہو گی کہ اس نے اپنی قسم پوری کی، اور تب میں اسے حلف کبیر سے آزادی کی تحریر لکھ کر دوں گا۔ تب وہ موتیوں کو فروخت کرے گا اور اپنے لئے بیوی اور مکان حاصل کرے گا۔ اور تب میں بھی سکون کے ساتھ مر سکوں گا۔"

اور اس نے مجھے پانچویں والی ایک کشتی سے معاملت کی۔ یہ کشتی موافق ہوا میں قریبی گاؤں تک گنگا سے کر جا رہی تھی۔ اور راوی کشتی بان کو معمولی سا معاوضہ دے کر کشتی کے اسبار پر دراز ہو گیا اور دھیرے دھیرے میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ دن بھر اس کو کشتی میں سونا تھا اور رات کو کشتی سے اتر کر ایک تیز رفتار اور خوش قدم خچر خریدنا اور رات بھر اس کی پیٹھ پر سفر کرنا تھا، اور اسی طرح اس کو کسی نہ کسی طریقے سے آگے بڑھتے جانا تھا اور ہر موقع و محل کے لحاظ سے مناسب قدم اٹھانا اور اپنی فراست کو پوری طرح بیدار رکھنا تھا تاوقتیکہ اس کا سفر ختم نہ ہو جائے۔

جس دن سیاہ رنگ راوی رخصت ہوا، اسی روز میں نے اپنی باقی ماندہ پونجی کا محاسبہ لگایا۔ میرے پاس بس میرا مکان اور چند باغ بچ رہا تھا اور میری بسر کی خوراک کا ذخیرہ تھا۔ اس کے سوا سب کچھ — گائے، گھوڑے اور وہ گنجینہ جو مجھے اپنے اجداد سے

ورثے میں پہنچا تھا، سب کچھ — چھوٹے چھوٹے زیوروں میں تبدیل ہو گیا تھا اور یہ پھر ایک ایسے سیاہ مرد کی کمر میں لپٹے ہوئے مجھ سے دور ہوتے جا رہے تھے جسے دوبارہ دیکھنا میرے مقدر میں نہ تھا۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں جو ابھی تک دوسروں کو ملازم رکھا کرتا تھا اب شاید ایک مٹھی کے عوض خود دوسروں کی ملازمت بھی میسر نہ پاؤں گا۔

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ان حالات سے سراسیمہ ہو کر گریبان پھاڑ لیتا اور اپنی اس حماقت کو کوستا جس کی بدولت اسے یہ تباہی دیکھنا پڑی، لیکن میرے لئے یہ سب کچھ مسرت کا سرچشمہ تھا۔ میں خود سے کہتا، "اے مصیبح حقیقی میں نے اپنی خوشی سے ایک بڑی قربانی دی ہے، اور انجام کار میری مراد بر آئے گی۔"

اور اس شام اپنے معمول کے مطابق میں اپنی محبوبہ کے دریا پر سے لوٹنے کی راہ دیکھ رہا تھا اور جب وہ میرے قریب سے ہو کر گزرنے لگی تو میں نے اشارے سے مجھے انتظار کرنے کو کہا اور پانی کا مرتبان اپنے باپ کے مکان پر پہنچا کر وہ واپس میرے پاس آئی۔

جس رات ہم نے شجرالموت کی کہانی سنی تھی اور پھر دریا کے کنارے بیٹھ کر باتیں کی تھیں اس کے بعد سے آج پہلی بار وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔

"ادھر کچھ دنوں سے" اس نے کہا، "میں تمہارے اور بوڑھے راوی کے بارے میں بہت سی بیوقوفی کی باتیں سن رہی ہوں۔ جن لوگوں کو ایک بات کا پتا ہے لیکن اصل راز نہیں معلوم، وہ غلط سلط اندازے لگانے پر مجبور ہیں، مگر مجھے اصل راز معلوم ہے، جو میں جانتی ہوں، سو کہو۔"

"تمہاری باتیں میرے لئے شیریں ترین موسیقی کی طرح ہیں۔"

"کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ کالا آدمی دوسری بستیوں میں کہانیاں سنانے گیا ہوا ہے اور یہ کہ ایک ایک کہانی پر وہ خوب خوب انعام سمیٹ رہا ہو گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ کچھ دن کے لئے اپنے وطن چلا گیا ہے اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے اپنی جو املاک بیچ ڈالی ہے اس کے بدلے میں دوسرے رئیسوں اور مکانوں میں جا بسے ہو اور بدلہ وہیں دیکھیں گے۔ اتنی بات تو سب جانتے ہیں کہ وہ چلا گیا ہے اور آج رات اس کی کٹیا میں کوئی نہ سوئے گا۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ اپنے وطن گیا ہے۔ لیکن یہ راز مجھی کو معلوم ہے کہ وہ تمہارے لئے روپہلا ہیچ لینے گیا ہے، حالانکہ تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم خود جاؤ گے چاہے اس میں تمہاری جان ہی چلی جائے۔ تمہیں مجھ سے ایسی ہی محبت ہے۔"

اور تب میں نے اس کو وہ سب کچھ بتا دیا جو میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ میں نے اسے یہ بھی سمجھا دیا کہ بیشک میں خود جانے پر آمادہ تھا، اور یہ کہ میرا جانا کیوں نہ ہو سکا۔ اس پر وہ بولی

"اگر کوئی مرد کسی عورت کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دے تو یہ اس کی محبت کی

Scanned with CamScanner

سب سے بڑی نشانی ہے، لیکن اگر وہ کسی اور آدمی کو مرید کر کے اپنی جگہ اس کی جائے مقبرے میں قائم تو یہ اس کے مسافروں کی نشانی ہے۔ تاہم کئی باتوں میں تم نے سمجھ سے کام نہیں لیا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے بڈھا مر جائے یا ہو سکتا ہے وہ چور ہو۔ اور اگر وہ بچ بھی جائے اور اپاہج نہ بھی ہو، تب بھی ہو سکتا ہے کہ اسے روپہلا بیج مل ہی نہ سکے، اور اگرچہ اس کو بیج مل ہی جائے تب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اسے تم تک پہنچا نہ سکے۔ اس طرح اگر یہ دیکھا جائے کہ میری خاطر تم نے کتنی بیوقوفیاں کی ہیں تو اس حساب سے بھی تمہاری حماقت کا پتا چلتا ہے، اگرچہ کچھ کہو اب اتنی ہی تنگ کوئی نہ ہو گا جو مجھے کہانیاں سنائے اور تمہاری شعروں کو میرے لیے گوارا بنائے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تم نے مجھے پانے کے لیے جتنا خرچ کر دیا ہے مجھے رکھنے کے لیے اتنا خرچ نہ لا سکو گے۔ اور میرے باپ نے مجھے سب بھی کی ہے اور۔۔۔

یہاں پہنچ کر وہ رک گئی اور اس کے ماتھے کی شکنیں غائب ہو گئیں اور وہ ہنسنے لگی۔

"ان باتوں کا کچھ خیال نہ کرنا۔ اگر میرے مقدر میں تمہارا ہی ساتھ لکھا ہے تو یقیناً میں تم سے بہت محبت کرنے لگوں گی۔ اصل میں اس تیز ہوا نے مجھ پر ایسا اثر ڈالا کہ میں نے کچھ سخت باتیں کہہ دیں۔ اور اکیلی میں ہی ان جھکڑوں سے پریشان نہیں۔ خدا بھی پریشان ہے۔ دیکھو ہوا کیا پھر پھر کر لہریں لے رہا ہے۔ اور غروب ہوتا سورج بھی کتنا خطرناک معلوم ہو رہا ہے۔ آج رات کہیں نہ کہیں کہرام ضرور مچے گا اور بڑی تباہی آئے گی۔"

اور یہ اس نے سچ کہا تھا۔ کیونکہ اسی رات بھونچال آ گیا۔ اس کے شور نے مجھے گہری نیند سے چونکا دیا۔ بستی تک اس کا ہلکا سا جھٹکا پہنچا۔ میرے مکان میں دو مرتبان پاش پاش ہو گئے اور مجھے اپنے پیروں کے نیچے زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مٹی کے تین مکان منہدم ہو گئے اور رات بھر لوگ چیختے اور دعائیں پڑھتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

میرا اندازہ تھا کہ زلزلے کا زیادہ زور صحرا پر صرف ہوا ہو گا۔ لہٰذا صبح ہوتے ہی میں نے اپنے خچر کو کسا اور سوار ہو کر یہ دیکھنے کو نکل کھڑا ہوا کہ رات صحرا پر کیا گذری۔ اب ہوا صاف اور ہموار ہو چکی تھی، اس لیے یہ سفر بہت خوش گوار تھا۔ صحرا میں پہنچ کر ایک جگہ میں نے دیکھا کہ ایک بڑا سا ٹیلا اپنی سابق جگہ سے ذرا سرک سا گیا ہے۔ اور اب اس کی حدود وہ نہیں ہیں جو پہلے تھیں۔ میں اس کے قریب تک چلا گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ ٹیلا ترخ گیا ہے اور اس کے ترخنے سے ایک زمین دوز مقبرے میں داخلے کا راستہ کھل گیا ہے۔

میں خچر پر سے اتر پڑا اور اس راستے پر کچھ دور تک بڑھتا چلا گیا۔ لیکن اندر ایسا

گھپ اندھیرا تھا کہ کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ناچار میں گھر لوٹ آیا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ کسی سے بیان نہیں کیا کہ مبادا دوسرے لوگ پیش قدمی کر کے مجھ سے پہلے وہاں جا پہنچیں۔

اور اس رات جب ساری بستی سو گئی اور ہر طرف سناٹا چھا گیا تو میں پھر سوار ہوا۔ اس بار میرے ساتھ ایک پھاوڑا اور روشنی کا مناسب سامان بھی تھا۔ اور وہ رات میں نے مقبرے میں گذاری۔

میرا خیال ہے یہ شاہی نسل کے کسی فرد کا مقبرہ تھا۔ اس کے اندر کئی حجرے تھے جن کی دیواروں پر عجیب و غریب نقوش بنے ہوئے تھے۔ یہ حجرے مٹی کی اینٹوں کی مدد سے بنائے گئے تھے اور انہی اینٹوں سے خوبصورت اور کشادہ کیے ہوئے زینے بنے ہوئے تھے۔ یہ بیش قیمت سے الگ ہوئے تھے اور کہیں کہیں پر ٹوٹے ہوئے ٹیلے کا ملبہ بھی حائل ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا دفینہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ بیش قیمت کھیتیاں، مورتیاں سب کھوٹے سونے کی، اور ان کے علاوہ مرصع زیورات بھی تھے۔

اس خزانے کا بڑا حصہ میں نے اسی رات ایک دوسری جگہ لے جا کر دفن کر دیا۔ اور اس جگہ کی شناخت کو میں نے ایک ایسا نشان بنا دیا جس پر میرے سوا اور کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ اس کے بعد کئی راتوں تک میں باقی خزانہ بھی وہیں منتقل کرتا رہا۔ اور اس کام میں میری مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس لیے کہ میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔

رات کو میں نے دو اونٹوں پر سارا خزانہ بار کیا اور اسے اس طرح پوشیدہ کر دیا کہ دیکھنے میں اونٹوں پر لدا چارہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے باوجود میں خوف کے عالم میں سفر کر رہا تھا۔ میرا خنجر ہر وقت میرے ہاتھ میں تیار تھا اور میں اونٹوں کو ایڑ پر ایڑ لگا رہا تھا۔

بہرحال خوش قسمتی یہی تھی کہ میں سلامتی کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ جاؤں۔ جوہریوں کی کوٹھیوں میں میرا ضرور خیر مقدم ہوا، اور اس طرح میں نے اپنا خزانہ فروخت کیا

تو گویا ہوا کہ روپہلا بیج حاصل کرنے اور اپنی محبوبہ کا دل جیتنے کے لیے میں نے جو کچھ کھویا تھا، وہ سب میرے پاس واپس آ گیا۔ اور شروع شروع میں میں اس بات سے بہت خوش تھا۔

مگر میری آنکھیں کھلیں اور میں نے بڑے کرب کے ساتھ محسوس کیا کہ مجھ پر کیا سانحہ گذر گیا ہے۔ یہ کہ میں نے بلامعاوضہ اپنی خوشی سے ایک قربانی پیش کی تھی، یہ قربانی قبول نہیں کی گئی، اور یہ کہ جو کچھ میں نے کھویا تھا وہ سب کچھ میرے ہاتھ پر واپس رکھا ہوا تھا۔ پھر اب میں کسی چیز کی کیا توقع کر سکتا تھا؟

"کوئی شک نہیں،" میں نے کہا، "کہ بھونچال بوڑھی راوی کو کھا گیا، کیونکہ اسی رات

Scanned with CamScanner

وہ سفر میں تھا۔ اب تو ہر وقت اس بوڑھی چماروں سے دعا پڑھی ہے یا دریا کی تہہ میں بیٹھ چکا ہے اور کوئی شک نہیں کہ میرا آرام جان مجھ سے چھین لی گئی۔"

لیکن اسی رات ایک شخص سے میری گفتگو ہوئی جو راوی کے دوسرے طرف بستی کی طرف اسی میں سیاہ مرد سے ملا تھا۔ ہو یوں ہے کہ جو دور رہ خاندان معطل رہتا ہے، ہم اس پر قصوں میں ایسی کہانیاں رضامی رہتی ہیں۔ جو دیکھ لیا گیا وہ دیکھ دیا گیا اور جو ہوتا ہے وہ ہوتا ہے پھر اس کے بعد سے میں نے اپنی شادکامی یا محرومی قسمت کے متعلق کسی پیش قیاسی کی جرات نہیں کی۔ میں نے ہاتھ باندھ لیے اور انتظار کرنے لگا۔

ایک شام پھر میری محبوبہ نے مجھ سے کہا،

"بستی میں تمہاری بابت یوں باتیں کی جا رہی ہیں،" وہ بولی۔ "لوگ کہتے ہیں کہ پہلے تم نے بہت سا مال بیچ ڈالا اور اب بہت سا مال خرید رہے ہو۔ اور اس لین دین میں تم نے سچ کمایا ہے۔ یہ بیوقوفوں کی خیالی باتیں ہیں لیکن کبھی کبھی میرے پاس ہے مجھے پتا ہے کہ تمہاری ساری رقم کالا بوڑھا لے کر روانہ ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے یہ وہم سا لگا تھا کہ شاید میرا باپ ایک ایسے آدمی کے ہاتھ میں میرا ہاتھ دینے پر راضی ہو جو قلاش ہو چکا ہے۔ تو پھر اب تم اتنا سامان کہاں سے خرید رہے ہو؟ یا تو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا اور بڈھا اپنے ساتھ کوئی مولہ نہیں لے گیا یا تم نے کوئی جادو کیا ہے۔ اگر پہلی بات سچ ہے تو مجھے تمہیں روپہلا سیج نہیں سمجھے گی اس لیے کہ وہ کم دامن میں زیادہ کام کرنے والا آدمی نہیں ہے تو پھر میرا تمہارا ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اگر دوسری بات سچ ہے تو مجھے بھی بتاؤ کہ وہ جادو کس طرح کیا جاتا ہے تاکہ میں اپنے باپ کو خوب ارم پہنچا سکوں اور اپنے لیے بھی سا پھرنی اور سونے کا کنگن خرید سکوں۔"

"نہ تو میں نے تم سے جھوٹ بولا ہے اور نہ میں نے کوئی جادو کیا ہے۔ چونکہ تم نے مجھے اپنا راز بتا دیا تھا اور ابھی تک جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے اسے تم نے اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہے۔ اس لیے میں ایک بار پھر تم کو اپنے راز میں شریک کرتا ہوں۔ مقدر کا لکھا یہی تھا کہ مجھے ایک بار حرکت میں لایا جائے اور جو کچھ میں نے اس وقت پر خرچ کیا تھا وہ سب میرے پاس واپس آ جائے۔ بس اس کے سوا اور کچھ نہ پوچھو۔ البتہ یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ پھرنی اور سونے کا کنگن کیوں چاہیے؟"

"میری ایک چچازاد بہن ہے۔ خوب صورت ہے، مگر اتنی نہیں جتنی تم سمجھتے ہو مجھے۔ اب اس کی شادی کا وقت آ گیا ہے۔ نہ مجھے معلوم ہے نہ اسے کہ اس کی شادی کس کے ساتھ ہو گی۔ لیکن وہ سمجھدار لڑکی ہے اور اپنے شوہر کا انتخاب اپنے باپ کی مرضی پر چھوڑ دے گی۔ ظاہر ہے وہ کسی رئیس آدمی کو چنے گا اور شادی کے موقع پر بڑا جشن منایا جائے گا جس میں رات بھر گانا اور ناچنا ہو گا۔ میرے نام بھی اس جشن کا بلاوا ضرور آئے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہاں مہمانوں کے سامنے مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔ لیکن میرا باپ غریب

آدمی ہے اور اسے کہیں سے کچھ ملتا بھی نہیں ہے۔"

"اسے نہیں ملتا تو تمہیں ملنا چاہیے۔"

"کیا ملنا چاہیے؟"

"ایک کیسہ بھر اشرفیوں سے بھری ہوئی ایک ٹوکری میں چھپا ہو گا اور اشرفیوں کی یہ ٹوکری کل سورج نکلتے ہی میں تمہارے باپ کے پاس بھیجوں گا۔"

"سنو!" اس نے کہا۔ "تمہارے دل میں میری محبت صحرا کی طرح ہے اور میرے دل میں تمہاری محبت ریت کے ایک ذرے کے برابر نہیں۔ پھر بھی تم مجھے یہ تحفہ بھیجو گے؟"

"پھر بھی میں تمہیں یہ تحفہ بھیجوں گا۔"

اس نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر یہ بات پھیل گئی تو شہر کے لوگ اس پر طرح طرح کی تہمتیں لگائیں گے۔ لہذا اس کو راز رکھنا چاہیے اور وہ خوش تھی، جیسے کوئی بچہ چھوٹا سا کھلونا پا کر خوش ہو جاتا ہے۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ واقعی وہ ابھی بہت چھوٹی تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہنسی کھیلتی رہتی تھی اور اس کے دل میں میرے یا کسی بھی شخص کی محبت کا شائبہ تک نہ تھا۔

مگر اس وقت بھی اس کی سرد آنکھوں کی گہرائی میں محبت سوئی ہوئی تھی، جیسے کنڈ کی تہہ میں سنہرے ستونوں میں مچھلی پڑی سویا کرتی ہے اور اس کے جاگنے کا وقت قریب آ گیا تھا۔

جو کوئی خوشی میں بسر کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ وقت کی رفتار کتنی تیز ہو سکتی ہے اور جس کو کسی واقعے کا منتظر ہونا ہو وہ جانتا ہے کہ یہ رفتار کس قدر سست ہو جاتی ہے۔ لیکن بہرکیف ہورہے روز کی روانگی کو آٹھ مہینے گذر گئے اور اس کے کہنے کے بموجب آئندہ مہینہ ماہ مراد تھا جس میں مجھ کو خیرالصورت کا روپہلا سیج ملنے والا تھا بشرطیکہ اس کا ملنا میرے مقدر میں ہوتا۔

تو اب قدموں کی ہر چاپ کے ساتھ مجھے اپنے پاس آتی ہوئے قاصد کی آواز سنائی دیتی اور ہر آواز پر مجھے گمان گذرتا کہ کوئی میرا نام لے کر مجھے پکار رہا ہے۔ میرے جنون کی حدت بڑھ گئی جیسے سر پر چڑھ آئی ہو۔ میری نیند غائب ہو گئی اور میں رات کا بیشتر حصہ اپنے باغ میں چکر کاٹ کاٹ کر گذارنے لگا۔

اس مہینے کی نویں تاریخ تمام رات مجھے دور سے آتی ہوئی طرب و سرود کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ اس رات میری محبوبہ کی بہن کی شادی تھی۔ یہ اسی کے جشن کی آوازیں تھیں۔ لیکن صبح ہونے سے پہلے وہ خاموش ہو گئیں۔ اور میں باغ میں ٹہلتا اور گھومتا رہا اور جب میں باغ کے باہر دروازے کے نزدیک سے ہو کر گذر رہا تھا تو چلمن میں سے ایک ہلکی سی آہٹ سنی اور کسی نے میرا نام لے کر مجھے پکارا۔ لیکن یہ آواز کسی قاصد کی نہ تھی۔ یہ میری محبوبہ کی آواز تھی۔

میں نے دروازہ کھول کر اسے اندر بلایا۔ وہ منہ سے کوئی لفظ نکالے بغیر چلی آئی۔ وہ سیاہ پیرہن اور طلائی کنگن پہنے ہوئے تھی۔ صبح صادق کی پر کیف ملگجی روشنی میں اس کے چہرے پر حسن کا ایک عجیب سا شعلہ لپک رہا تھا اور اس کا چہرہ کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔

"تھک گئیں؟"

اس نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

"ہاں" میں نے کہا۔ "شادی کا جشن بڑا طویل تھا۔ ساری رات مجھے گانے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ تمہاری آنکھوں سے تھکان ظاہر ہو رہی ہے" اور میں نے اس کے آرام کرنے کے لیے ایک مرصع کی منقش ریشمی قالین بچھا دیا۔ میں اس کے اس طرح آ جانے پر حیرت زدہ بھی تھا۔

وہ قالین پر دوزانو بیٹھ گئی۔ اس کا بدن جھکتا چلا گیا، اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"میں جشن میں نہیں تھی" اس نے کہا۔ "مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنا ہیں، اور ان میں کی ایک بات بھی ایسی نہیں جسے تم کبھی معاف کر سکو۔ پہلے وعدہ کرو کہ جو کچھ میں کہوں اسے آخر تک سنو گے۔ اس کے بعد مجھ سے جو برتاؤ چاہنا کرنا۔"

اس پر میرا دل بیٹھنے لگا اور دہشت کا مہیب زہر مجھے اپنی کانوں میں گونجتا محسوس ہونے لگا۔ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ تب جا کر میں کہہ سکا: "میں آخر تک سنوں گا۔"

اور تب وہ قالین پر لیٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو پیچھے تکیے سے ٹکا لیا اور اپنی بات یوں شروع کی جیسے کوئی تھکا ہوا مرد طویل افسانہ سنا رہا ہے۔

"کل سویرے" اس نے کہا، "سورج نکلنے سے پہلے میں دریا پر نہانے گئی تھی۔ جب میں کپڑے پہن کر اوپر آئی تو میں نے دیکھا کہ ایک جوان ریشمی لبادوں سے سجے ہوئے ایک خچر پر سوار میری طرف چلا آ رہا ہے۔ قریب آ کر وہ خچر پر سے اترا اور دیر تک مجھے گھورتا رہا۔ اس کی رنگت ہم لوگوں سے زیادہ کالی لیکن بوڑھی راوی سے صاف تھی۔ اور مجھے اس کی آنکھوں میں پھر وہی پیغام نظر آیا جو تمہاری آنکھوں میں اور دوسروں کی آنکھوں میں نظر آتا ہے۔ میں سمجھ گئی کہ وہ میرا طلب گار ہے۔ خوب صورت عورتیں آنکھوں کی اس زبان کو آسانی سے پڑھ لیتی ہیں۔ لیکن مجھ پر اس زبان کا کوئی اثر نہ ہوا اور ایسا لگتا تھا جیسے میری آنکھوں کے آگے کہرا چھایا ہو۔

"اس نے تمہارا نام لے کر پوچھا کہ تم سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔ وہ ہماری ہی زبان بول رہا تھا، لیکن اٹک اٹک کر، جیسے اس نے ابھی حال ہی میں ہماری زبان سیکھی

ہو۔

"میں نے کہا، میرے ساتھ چلو، میں تمہیں اس کے پاس پہنچا دوں گی۔

"اور اس کے بعد؟" اس نے پوچھا "کیوں کہ تم دنیا کی سب سے حسین عورت ہو۔ میری محبت کو تمہارا ہی انتظار تھا۔"

"میں کھلکھلا کر ہنس پڑی اس لیے کہ میری آنکھوں کے آگے کہرا ابھی تک چھایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بات بالکل بےدھڑک اور اچانک کہہ دی تھی۔ اس نے ابھی ابھی پہلی بار تو مجھ کو دیکھا تھا۔

"اس کے بعد، میں نے کہا، اس کے بعد جو ہونا ہے وہ ہو گا۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"اس نے مجھ پر سے ایک دم یوں نظریں ہٹا لیں جیسے مجھے دیکھتے ہوئے ڈر رہا ہو۔

"مجھے ممانعت ہے،" اس نے کہا، "اس کے بارے میں کچھ بھی کہنا منع ہے۔"

"اور تم یقین کرو یا نہ کرو، مگر اب جو بات میں نے اس سے کہی، وہ صرف اس کو تھوڑا سا چڑھانے کے لیے کہی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ کہرا ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے تھا اور اسی لیے میں کچھ سوچ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"کیا خوب،" میں نے ہنستے ہوئے کہا، "تم مجھ سے محبت کا دعوا کرتے ہو اور پہلی بات جو میں تم سے پوچھ رہی ہوں اسی کو بتانے سے انکار کر رہے ہو؟"

"اور اب اس نے پھر مجھے دیر تک نظر بھر کر دیکھا۔ وہ ہلکے ہلکے ہانپ رہا تھا۔ پھر اچانک اس نے اپنے لبادے میں ہاتھ ڈال کر ایک چیز باہر نکالی جو چمک رہی تھی۔

"اب تم نے پوچھ ہی لیا ہے،" وہ بولا، "تو تم دیکھ لو، میں اسے یہ دینے کے لیے آیا ہوں۔"

"اور اب وہ میرے بالکل سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گولا تھا جو چاندی کا نہ تھا لیکن اس کا رنگ چاندی کا سا تھا اور اس گولے میں زندگی تھی اور حرکت تھی۔ یہ تو اس وقت سے لگتا ہو گا جب اوپر آسمان پر ستارے نہیں جڑے گئے تھے اور سورج ابھی نہیں بچھایا گیا تھا۔ پھر میری آنکھوں کے آگے سے کہرا ہٹ گیا اور میں نے دیکھا کہ کسی کا حسن اس کے حسن کی برابری نہیں کر سکتا۔ اور جب جب وہ بولا تو اس کی آواز مجھے ہر آواز سے میٹھی معلوم ہوئی۔ اور اب محبت کی وہ آگ مجھ کو پھونکے دے رہی تھی جو اس سے پہلے کبھی مجھے محسوس بھی نہ ہوئی تھی۔

"دیکھو، وہ چلائی، میں نے حلف کیسے توڑ دیا، اور اس کی سزا میں عنقریب موت آ جائے گی۔ میری زندگی کی گھڑیاں گنی چنی رہ گئی ہیں۔ لیکن اگر یہ گھڑیاں محبت کی گھڑیاں بن جائیں تو جان کی مول بھی سستی پڑے گی۔ سن، مجھ کو سچ میں جو محبت ہے، میں تیرا ہی تو پرستار ہوں۔

"میرا سر جھک گیا، اور میری آنکھوں میں نشہ چھا گیا، اور میں اس کے سامنے دوزانو

Scanned with CamScanner

ہو گئی۔ میرے دل کی مالک، میں نے کہا، میری زندگی کی مالک۔"

اور اب وہ قالین پر اوندھی ہو کر اتنا روئی کہ اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔

کچھ دیر تک میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

"تمہیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکیں؟"

"ابھی نہیں۔" وہ چلائی، "ابھی نہیں۔"

"تو بولتی رہو،" میں نے کہا، "اور مہربانی کر کے جلدی کہہ چکو۔"

اب وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور اس کے بعد کی ساری گفتگو اس نے کھڑے ہی کھڑے کی، البتہ اس نے سہارے کے لیے درخت کی ٹہنی سے ٹیک لگا لی تھی۔

"وہ صحرا کے راستے سے آیا تھا اور پچھلی رات ایک بڑے ٹیلے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہاں سے ایک پرانا مقبرہ نظر آتا ہے جو رات اس نے مقبرے ہی میں بسر کی۔ اس نے اپنا سارا اسباب وہیں چھوڑ دیا تھا اور خود ستھرے خنجر پر [illegible] ہو کر تمہاری تلاش میں نکلا تھا تاکہ اپنا فرض ادا کر سکے۔

"لیکن اب اس کے دل میں اپنے فرض کا خیال بھی کم ہے اور چونکہ بستی کے لوگ ابھی سے ہوشیار ہو گئے ہیں، اس لیے وہ مجھے اپنے ساتھ اسی ٹیلے والے مقبرے میں لے گیا۔ میں خنجر پر [illegible] وہ میرے ساتھ ساتھ دور رہا تھا اور کچھ دیر بعد مقبرے کی ٹھنڈی اور دھندلی روشنی میں ہم تھے اور ہماری محبت۔

"اب جب شام ہونے لگی تو میں ڈری کہ کہیں میرے باپ نے میری تلاش میں ہر طرف آدمی نہ دوڑا دیے ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس مقبرے میں اپنے عاشق کے ساتھ دیکھ لی جاؤں۔ تو میں اس سے رخصت ہو کر اپنے گھر آ گئی اور جب میرے باپ نے اتنی دیر تک گھر سے غائب رہنے کا سبب پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ میں اس کی شادی کے انتظاموں میں لگی ہوئی تھی۔ اور پھر میں نے یہ کہا کہ اب پھر میں [illegible] سونے کا کنگن بھی لیا اور اس سے کہا کہ اب میں شادی میں جا رہی ہوں۔ اسے اطمینان ہو گیا اور وہ پڑ کر سو رہا، اس لیے کہ وہ بوڑھا اور کمزور ہے اور رات رات بھر جشن میں شریک رہنے کے قابل نہیں ہے۔

"اور پھر میں لپکتی ہوئی واپس اپنے محبوب کے پاس پہنچی۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمارے پاس محبت کی بس چند گھڑیاں ہیں۔ اور یہ کہ ہماری محبت ایسی ہے کہ اگر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم ساتھ ساتھ رہیں تو بھی محبت سے ہمارا دل نہ بھرے گا۔ ابھی کچھ پہلے تک میں اسی کے پاس تھی۔ لیکن اب تم سے ملنا ضروری تھا۔ اور میں تمہارے باغ کے جالی دار دروازے کے پاس آئی، اور تمہارے قدموں کی آواز سن کر میں نے تمہیں پکارا۔ اور اب مجھے وہ بات کہنا ہے جس کے لیے میں تمہارے پاس آئی ہوں۔"

اور یہاں پر رک کر اس نے لجاجت آمیز نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر کہنا شروع کیا:

"تمہاری انگلیوں میں یہ جو نظر آ رہا ہے، یہ رحیم، تمہاری انگلیاں پھر کی ہڈیوں کی انگلیاں ہی لگ رہی ہیں کہ یہ جھومتی ہیں، ہمکتی ہیں۔ مگر میری پوری بات سن لو۔ اس نے خلف کبیر کو توڑا ہے اور اسے اس کی سزا مل کر رہے گی۔ کوئی اس تک پہنچے گا۔ اسے معلوم نہیں کب۔ لیکن بہت جلد یہ آنے والا اس سے کہے گا کہ مجھے ان موتیوں کی جوڑی دکھا جو ہر طرح ایک سے ہیں کہ یہی ثبوت ہے اس کا کہ تو نے اپنی سوگند پوری کر دی، اور اگر اس کے پاس موتیوں کی جوڑی نہ نکلی تو وہیں اور اسی وقت اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد جہاں سے وہ آیا ہے وہاں اس کی ماں کو بھی قتل کر دیا جائے گا کیونکہ خلف کبیر میں وہی اس کی ضامن تھی۔ اور جب وہ مار ڈالا جائے گا تو کیا میں زندہ رہ سکوں گی؟

"اس کے پاس جوڑی میں کا صرف ایک موتی ہے، دوسرا تمہارے پاس ہے۔ تو اس طرح اب تمہارے اختیار میں تین جانیں ہیں۔

"تم سمجھ سکتے ہو کہ میں نے اپنے بازوؤں میں اس کو قسم توڑتے ہوئے دیکھا ہے اور مجھے پتا بھی نہ تھا کہ اس کا کیا انجام ہو گا۔ اور پھر تم یہ بھی سمجھ سکتے ہو کہ تمہارا جھگڑا مشیت سے ہے، ان سب باتوں سے نہیں جن کو مشیت کی [illegible] نے [illegible] کو ایک جگہ پہنچا دیا ہے۔ اگر تم یہی خیال کر کے مجھے وہ دوسرا موتی دے دو اور اس کے ساتھ اس کے وطن چلا جانے دو تو یہ تمہارا [illegible] احسان ہو گا کہ اس کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہ مل سکیں گے۔

"لیکن شاید میں تم سے جو کچھ مانگ رہی ہوں، وہ اتنا زیادہ ہے کہ کوئی دے نہیں سکتا۔ تب اگر تمہیں اب بھی میری ضرورت ہو تو میں نہیں رہ جاؤں گی۔ اور تم چاہو مجھے اپنی [illegible] چاہے کہو، میں ہمیشہ تمہاری فرمانبردار اور وفادار رہوں گی۔ اس کے لیے میں تم سے اس کے سوا اور کچھ نہیں مانگتی کہ فوراً کسی آدمی کو دوڑا کر میرے محبوب کے پاس دوسرا موتی بھجوا دو تاکہ وہ حفاظت کے ساتھ واپس جا سکے۔ اور میں اب اس سے کبھی نہ ملوں گی۔ میرے ساتھ جیسا چاہو سلوک کرو، لیکن اس کا خون میری گردن پر نہ ہو۔ غلطی تو میری ہی تھی۔ اور پھر ایک طرح سے اس نے اپنی سوگند پوری بھی کر دی ہے۔ اس لیے کہ اس نے میرے ہاتھ تمہارے پاس شہر موت کا پیغام بھجوایا ہے۔ بتاؤ، اب تمہارا جواب کیا ہے؟"

سچ یہ ہے کہ اس وقت تک مجھے خود بھی پتا نہ تھا کہ میرا جواب کیا ہو گا۔ لیکن ابھی بات ختم کرنے کو [illegible] اس نے اپنے [illegible] کے اندر سے وہ دمکتا ہوا روپہلا گولا نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ اور میں نے اسے ہاتھ میں تھام لیا۔ اور یہ گولا اس کے نازنین بدن کی حرارت سے اب تک گرم تھا۔

ایک لمحے کے اندر میں نے اپنا خنجر اس کے جسم میں قبضے تک اتار دیا۔ وہ میرے

پیروں کے پاس گری۔ ایک بار سر سے پاؤں تک تھرتھرائی، اور ختم ہو گئی۔

اب میں پھر بالکل پرسکون تھا۔ میرا دماغ پانی کی طرح صاف تھا۔ میرا دل اعتدال اور خاموشی کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

میں نے باغ کے ایک گوشے میں اس کے لیے ایک گہری قبر کھودی۔ پھر میں نے اس کے جسم سے خنجر کھینچ کر نکال لیا۔ میں نے اس کی لاش کو ریشمی قالین میں لپیٹ دیا اور اس طرح میں نے اس کو زمین میں دفن کر دیا۔ میں نے زہریلا بیج کو بھی اس کے ساتھ دفن کر دیا۔

میں نے زمین سے مٹی ہموار کر دی اور اپنا خنجر صاف کر لیا اور آخر یہ سارا انتظام سے مکمل ہو گیا کہ باغ بالکل ویسا ہی نظر آنے لگا جیسا گذشتہ صبح نظر آ رہا تھا۔ اور وہاں جو کچھ ہوا تھا اس کا کوئی سراغ باقی نہ رہا اور نہ کسی آنکھ نے یہ واقعہ دیکھا تھا۔

اور تب میں سوار ہو کر اسی مقبرے کی طرف روانہ ہوا جو میں نے بڑے لیلی کی نیچے دریافت کیا تھا، اور جہاں عورت کا عاشق بھی پہنچ گیا تھا۔ لیکن، جیسا کہ مجھے اندیشہ بھی تھا مجھ کو مقبرے تک پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ اس لیے کہ میرا کام میرا جانب سے انجام دیا جا چکا تھا۔

وہ مقبرے کی دروازے پر مرا ہوا پڑا تھا۔ اس کے گلے میں ایک چھرا پیوستہ تھا۔ اس نے خنجر کے چارے کی طرح کھل کر مسہر کی طرح پھیل گیا تھا۔ اس کے برابر ہی پاس ہی ایک مشکیزہ اور پیتل کا ایک پیالا پڑا تھا۔ لیکن روپیہ زیورات سے واسطہ سفید خچر کا اب وہاں کہیں پتا نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ جس شخص نے قاصد کو قتل کیا ہے وہی خچر کو لے گیا ہو گا۔ لیکن جوہرات کا دوسرا موتی لاش پر سامنے نہیں لے گیا تھا۔ کیونکہ وہ موتی اب بھی لاش کی مٹھی پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا دیا تھا۔ میں نے لاش کو بھی کرگسوں اور گیدڑوں کے لیے پڑا رہنے دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ جس وقت وہ اپنی دور افتادہ ملک سے چلا تھا، اسی وقت ایک اور شخص بھی یہ دیکھنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو تھا کہ وہ اپنی سوگند پوری کرتا ہے یا نہیں، اور اس نامعلوم شخص کو یہ اختیار حاصل تھا کہ سوگند توڑنے کی صورت میں قاصد کو قتل کر دے۔

اور اس کے بعد میں گھر واپس پہنچا اور اپنی آخری نیند کا بندوبست کر کے بستر پر لیٹ رہا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نیند موت میں ختم ہو جاؤں گا، لیکن جو زہر میں نے استعمال کیا تھا وہ مجھے مار نہ سکا۔ نیند البتہ مجھے آ گئی لیکن دوسرے دن عصر کے وقت میں پھر بیدار ہو گیا۔ اور اسی نیند میں مجھ پر یہ مکاشفہ ہوا کہ مجھے ابھی اور اسی طرح موت نہ آئے گی۔ بلکہ مجھے دو برس انتظار کرنا تھا۔ تاوقتیکہ زہریلا بیج وہاں، جہاں میں نے اسے دفن کیا تھا، شجرالموت میں زندہ ہو کر آنکھ نہ کھول دے۔

بستی میں یہ خبریں گشت کر رہی تھیں کہ میری محبوبہ ایک غیر نسل کے آدمی کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ وہ دونوں ساتھ دیکھے گئے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ دریا میں ڈوب گئے کیونکہ وہ دریا میں ... کو ... دیکھا ... کچھ کہتا تھا، لیکن جو ہو گیا تھا وہ کوئی نہ بتا سکا۔ نہ کسی نے مجھے مجرم سمجھا۔

اور جوں جوں دن گذرتے گئے، مجھ میں عجیب عجیب تغیر پیدا ہوتے گئے۔ اب کسی عورت کا حسن مجھے متاثر نہیں کرتا تھا۔ کوئی تمنا میرے دل کو اپنی طرف کھینچتی نہ تھی۔ اگر کنج مسمار بھی میری دسترس میں ہوتا تو میں اسے ہاتھ نہ لگاتا۔ اب سب روپے کی خواہش کے سوا مجھے کوئی خواہش نہ تھی۔ اب میرے گھر میں کوئی مہمان نہ آتا تھا کوئی نغمہ کوئی قہقہہ نہ بکھرتا تھا۔ رات کی طویل خوش گوار نیند مجھ سے منہ موڑ چکی تھی۔ میں بمشکل بوقت گنی گنی نیند سوتا تھا۔ اور سوتے میں ایسے ایسے خوابوں کے سبب مجھے گھیرے کہ جاگنے کے بعد بھی میں سمجھ نہیں پاتا تھا کہ جاگ گیا ہوں یا ابھی خواب میں ہوں۔ اب میں وہم کو حقیقت سے اور سائے کو پیکر سے الگ نہیں دیکھ پاتا تھا۔

سوتے جاگتے ہر وقت اس کا تصور مجھ پر مسلط رہتا جس سے میں نے محبت کی تھی۔ میں اس کو موت کی وادی سے بلا کر یہ بتانے کے لیے تڑپ رہا تھا کہ کس طرح میں اسے فریب فریب معاف کر چکا تھا اور کس طرح خود میں ایک چھوٹی سی چیز نے مجھے جنون میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر تسکین پاتا تھا کہ اسے یہ سب کبھی معلوم نہ ہو سکے گا۔ اب میرے دل میں اس کے خلاف کوئی بدگمانی، کوئی عداوت نہ تھی۔ واقعی، جیسا کہ اس نے خود اپنے بارے میں کہا تھا وہ ایک ننھی سی نادان تھی جو طوفانی محبت کی زد میں آ گئی۔

انتظار کا ایک سال پورا ہونے کے بعد کبھی کبھی جب میں خنک شام کی ٹھنڈی ہوا میں باغ میں گھومتا ہوتا تو وہ مجھے دکھائی دیتی۔ وہ اچانک ظاہر ہوتی اور پھر دھوئیں کی طرح تحلیل ہو جاتی۔ اور جوں جوں دوسرا سال گذرتا گیا اس کا ہیولا زیادہ جلدی جلدی نمودار ہونے لگا، اور اب وہ ہیولا زیادہ دیر تک قائم رہتا، بلکہ اب تو میں اس کی آواز بھی سن لیتا تھا۔ وہ نارنج کے پیڑ کے نیچے کھڑی ہوتی، اور پیرہن ہٹا کر اپنے سینے کا زخم دکھاتی۔

"تم نے میرے اوپر وار کیا،" وہ کہتی، "تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے، پھر تم نے کس دل سے مجھ پر وار کیا؟"

اور آخرکار انتظار کا وہ دن آ گیا جب شجرالموت کو پیدا ہونا اور دو قدم کے برابر پہنچنا تھا۔ جب شجرالموت کو میرا خون چوسنا اور پھر خود بھی مر جانا تھا۔ اور یہ سب کچھ آفتاب کے طلوع و غروب کے درمیان ہونا تھا۔

Scanned with CamScanner

ابھی سورج پوری طرح نکلا نہ تھا کہ میں نے اس کی قبر کے اوپر کی مٹی کا ڈھیر سے ماٹوڑ لیا۔ باغ کے اس حصے میں میرے سوا کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی، اور میں خود اپنے ہاتھ سے اس حصے کو خس و خاشاک سے صاف رکھتا تھا۔ اور اب میں نے دیکھا کہ قبر کی اوپری سطح میں بہت سے رخنے پڑ گئے تھے اور ان کی شکل ایسی تھی جیسے سورج کی کرنوں کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ ان رخنوں کے بیچوں بیچ میں کوئی سخت سی چیز ابھر رہی تھی جو چاروں طرف سے مدور تھی اور جس کا رنگ قرمزی اور کاہی ملا جلا تھا۔ اور اس کی سطح پر رطوبت کی ننھی ننھی بوندیں ابھری تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زمین پھاڑ کر باہر نکلنے کی جدوجہد میں اسے پسینہ آ گیا ہو۔

تب میں اس ابھرتے ہوئے جسم سے شکل کو اپنے ... مکان میں واپس چلا گیا کیونکہ ایک دن پہلے میں اپنے تمام ملازموں کو رخصت کر چکا تھا۔ پھر پہنچ کر میں نے غسل کیا اور سفید پیرہن پہنا۔ میں نے گھر کے سارے دروازے مضبوطی کے ساتھ بند کیے اور پھر واپس شجر موت کے پاس پہنچا۔ اب وہ میرے گھٹنوں تک آ گیا تھا اور ابھی اس کی شکل ایک گہرے سرخ غنچے کی سی تھی۔ وہ مخروطی شکل میں اوپر پتلا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس میں سے سکم ہلکی حرارت اٹھ رہی تھی۔ میں وہیں پر بیٹھ گیا اور اس مخروطے کو دیکھتا رہا۔

جب وہ ایک قدِ آدم کے برابر ہو گیا تو اس میں سے کئی تنے پھوٹ کر الگ ہو گئے۔ وہ سب جڑ کے پاس مرکزی تنے میں جڑے ہوئے تھے یہ تنے میں باہر کی طرف ڈھلک گئے، اور ان کے بڑھنے کی رفتار میں کمی ہو گئی۔ لیکن ان میں سے سانپوں کی طرح لہراتی ہوئی شاخیں جیسے ہی جنم لینا شروع ہوئیں، ان شاخوں پر تشنج طاری تھا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ یہ شاخیں چھوٹے چھوٹے ابھاروں سے بنی ہوئی ہیں اور یہ ابھار مسلسل کھل رہے ہیں۔ اور یہ بڑھ رہی ہیں، لیکن مرکزی تنا اب بھی مخروطی شکل میں اوپر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس کے سرے پر ایک عجیب طرح کا گچھا سا تھا جو تنے کے ساتھ اوپر جا رہا تھا۔ یہ گچھا بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ اور میں سمجھ گیا کہ اسی میں سے شجر موت کا پھول برآمد ہو گا۔

یہ ظہر کا وقت تھا۔ میں درخت سے دور ہٹ گیا اور تھوڑے فاصلے سے دیکھتا رہا۔ شاخوں میں سے جابجا مسلسل نکل کر نیچے اتری چلی آ رہی تھیں۔ اور یہ جاتی رہیں پر اس طرح پھیل گئی تھیں کہ جہاں پر میں نے ... دفن کیا تھا وہاں اب کاہی اور قرمزی رنگ کا [illegible]

پھر کچھ دیر بعد تنے کے سرے پر کا گچھا تین پنکھڑیوں کی شکل میں بٹ گیا۔ یہ پنکھڑیاں شفاف ریشم کی سی جھلی سے ڈھکی ہوئی تھیں، اور اس جھلی پر نسیں ابھری ہوئی تھیں جو انسانی رگوں سے مشابہ تھیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ نسیں پھولتی جا رہی ہیں اور ایسا لگتا تھا کہ کوئی سفید سفید چیز ان نسوں کے اندر سے زور مار رہی ہے اور تنے کا سرا ہلکے ہلکے دائیں بائیں یوں جنبش کر رہا تھا جیسے شدید درد میں مبتلا ہو۔

ابھی تک یہ سب کچھ کامل خاموشی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ لیکن اب اچانک ان میں سے ایک پنکھڑی کی جھلی اس سرے سے اُس سرے تک چڑک ہوئی پھٹ گئی اور اس کے چاک ہونے سے ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے کسی عورت پر زور کیا ہو۔ اس پنکھڑی میں سے اچھل کر ایک نہایت دلکش سفید پھول برآمد ہوا۔ اتنا بڑا پھول میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور اس پھول میں سے روپہلی رنگ کی غبار کا ایک بادل سا اٹھ کر دھوپ میں چمکنے لگا اور اس غبار میں سے ایک خوشبو پھیلی، اور خوشبو جہاں پر میں کھڑا تھا وہاں پر بھی آ رہی تھی کہ برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

تب میں نے بلند آواز سے وہ کہا جو میرے دل میں تھا:

"شجر الموت!" میں چیخا "تیری جڑوں نے میرے سرمایۂ محبت کو جذب کر کے اپنے وجود کا جز بنا لیا ہے۔ لے مجھے بھی لے کہ انجام کار ہم ایک ہو جائیں کہ زندگی کی مکروہ دہشتوں کے بعد انجام کار سکون کی نوبت آئے۔ شجر الموت، شجر محبت، میں تیرے پاس آ رہا ہوں۔"

اور میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اور درخت کے پاس پہنچ کر میں جھکا۔ اور میں نے اوپر نظر اٹھائی۔ اور دو مرتبہ پھر میں نے مسرور عورت کی سی آواز سنی۔ یہ شجر موت کا دوسرا اور تیسرا پھول کھلا تھا۔

روپہلی غبار کے بادل نے میری آنکھوں میں گھس کر مجھے اندھا کر دیا اور بوجھل خوشبو میرا دم گھونٹنے لگی۔ میں بے کپکپاتی ہوئی جڑوں پر گر پڑا جن کے بے شمار دہانے میرے منتظر رہے تھے اور مجھے آخر نیند آ گئی۔

Scanned with CamScanner

قنوطنا کا زوال

آج سے کئی ہزار سال پہلے کا ذکر ہے کہ ہمارے ملک کی طرح بہت سے چھوٹے، چند بڑے اور کچھ بہت بڑے ممالک [illegible] عجیب وغریب ملک آباد تھا۔ اس ملک کا نام قنوطنیا تھا۔ وہاں کے رہنے والے اچھے بھلے لوگ تھے۔ وہ لوگ نہ قنوطی تھے اور نہ اپنے آپ کو قنوطی کہلوانا پسند کرتے تھے بلکہ خود کو ہمیشہ قنوطینی کہتے اور کہلواتے تھے۔ دوسرے ملکوں کے لوگ بھی [illegible] سے قائم تھے یا نہیں تھے، ان کو عام بول چال میں آسانی اور تعلقات میں روانی کی وجہ سے قنوطینی ہی کہتے تھے۔ "قنوطینی تاریخ مفصل بالتصویر" کے مطابق پاس پڑوس کے سارے ملکوں کے لوگ قنوطینی عوام کے مثالی دوست یا بدترین دشمن تھے۔ قنوطینی حکمران بھی سابقہ جان پہچان کے ممالک کے فرمانرواؤں کو موقعے اور مرتبے کے لحاظ سے "ہمارے عزیز دوست" یا "ہمارے ازلی دشمن" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ قنوطینی حاکم اپنی روزمرہ تقاریر، خطبے، مراسلوں اور سرکاری احکامات میں ایسے الفاظ اور تراکیب عام طور پر استعمال کرتے تھے جن کے کئی کئی معانی ایک ساتھ نکالے جا سکیں۔ یہ مشکل باتیں ہیں، شاید سمجھ میں نہ آئیں، ہمیں تو آپ کو قنوطنیا کے بارے میں کچھ آسان باتیں بتانی ہیں لیکن ابتدائی معلومات تو حاصل کرنی ہی پڑتی ہیں۔ کسی بھی ملک کو [illegible] اور پوری طرح پہچاننے کے لیے بہت ضروری ہے کہ اس کی تاریخ سے (اگر کوئی ہو) واقفیت حاصل کی جائے اور اس کے جغرافیے کو (چاہے وہ کیسا بھی رہ چکا ہو) پوری طرح سمجھا جائے۔ [illegible] مقصد بھی یہی ہے۔

"انسائیکلوپیڈیا قنوطینیکا" (آخری ایڈیشن) کے مطابق قنوطنیا آج سے کئی ہزار سال پہلے بھی ایک آزاد جمہوری مملکت تھی اور قنوطینی خود کو آزادی اور جمہوریت کی دولت سے مالامال تصور کرتے تھے، لیکن حکمران آزادی کے خیال ہی کو ہر برائی کی جڑ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے ہر نیا حکمران اپنے حساب سے اس جڑ کو کاٹنے اور کھوکھلا کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتا رہتا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک آخری قنوطینی حکمران کے سر پر زوال کے سائے نہ منڈلانے لگے۔ خیر یہ سب بعد میں، پہلے قنوطنیا کے بارے میں کچھ اہم باتیں۔

قنوطینی عوام بہت ہی بھولے بھالے، ملنسار اور مہمان نواز تھے۔ ان کی جمہوری اور خوشحالی جڑوں پر [illegible] کا سبب کو شک ہے۔ اس لیے ہم بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ کبھی ایک اور کبھی دوسری زبان بولتے تھے، اس لیے قنوطینی زبان پوری طرح پروان نہ چڑھ سکی اور آج شاید یہی قنوطینی لوگوں کی رسم ورواج بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ گئے۔ ان کی بہت معمولی مثال ان کا کھانا پینا تھا۔ قنوطینی کبھی بیٹھ کر، کبھی کھڑے ہو کر اور اکثر لیٹ کر کھانا کھاتے تھے۔ لباس اور روزمرہ کی نشست و برخاست میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔ ہر شام سبز رنگ کا نیا لباس پہننے کی جدت کے علاوہ [illegible] ہر موسم میں گزرے ہوئے موسم کا لباس پہنے رہنا ان کا خاصہ تھا۔ کسی اجنبی یا دوست سے ملنے پر زانو پیشانی سے [illegible] ہر دن رات سرخ رومال باندھے رہنا اور ہمیشہ [illegible] اپنے اور دوسروں کے گھر میں [illegible] خصوصیات تھیں جو اب ڈھونڈے سے بھی قوموں میں نہیں ملتیں۔ قنوطینی عوام اور جانوروں میں مساوات کے قائل تھے اور جانوروں کو گھر کی حدود سے باہر نکالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ آج کی طرح بچے کسی قدر ذہین تھے۔ پڑھتے لکھتے نہیں، باتیں کرتے تھے۔ [illegible] قنوطینی بچے ایسے نہ تھے۔ وہ ہر وقت ہر بات میں بڑے ماں باپ کی قدر کرتے رہتے تھے۔

قنوطنیا میں ایک سمندر بھی تھا جس کے کنارے پر [illegible] چار تفریح گاہیں، ایک بڑی بندرگاہ اور بہت سے فوجی اڈے تھے، دراصل یہ فوجی اڈے بھی تھے۔ قنوطینی حکمرانوں کے پاس [illegible] ساز وسامان رکھنے کی کوئی مناسب جگہ نہیں تھی۔ اس لیے سمندر کے ساتھ ساتھ [illegible] حفاظت سے رکھنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ اپنے عجیب وغریب جغرافیے کے باعث قنوطینی عوام اور حکمران اکثر الجھن میں گرفتار رہتے تھے۔ خشکی کی جانب سے قنوطنیا کی ہر سمت میں کئی ملک تھے، اور کسی کسی سمت میں تو لاتعداد ملک [illegible] آباد تھے۔ جس کے باعث قنوطنیا کی سالمیت بیشتر وقت خطرے میں رہتی تھی۔ کسی ملک [illegible] اس مستقل خطرے کے پیش نظر قنوطینی حکمرانوں نے اکثر فوجی ساز وسامان، امدادی اسلحہ اور اہم دستاویزات سمندر کی تہہ میں [illegible] کیونکہ ان کے خیال میں یہی جگہ ہر طرف سے محفوظ تھی۔ ایک زمانے میں قنوطنیا کی سرحدیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں، مگر عوام اور حکمرانوں نے [illegible] خاطر خواہ کمی کر لی۔

یہ بات بھی "قنوطینی تاریخ مفصل بالتصویر" میں بار بار زور دے کر کہی گئی ہے کہ [illegible] ملک صدیوں میں وجود میں آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ قنوطنیا کا خاص فلاحی نظام تھا۔ اس نظام کا زریں اصول غریب کو امیر اور امیر کو غریب مشہور کرنا اور کرتے رہنا تھا۔ غریب لوگوں کو امیر مشہور کرنے سے عام آدمی کی سماجی حیثیت کے تعین اور تفریحی [illegible] میں بہت مدد ملی اور معاشی زندگی کا معیار پہلے سے بدتر ہوتا چلا گیا۔

Scanned with CamScanner

دوسری جانب امیر کو غریب سمجھنے سے حکومت اور اراکین حکومت مالی اور سیاسی استحکام سے ہمکنار ہوئے۔ صنعت و تجارت میں مدد کے لیے حکومت نے [illegible] لوگوں کو بھاری مالیت کے ماہانہ واپسی قرضے جاری کیے اور [illegible] قرطبہ میں باہمی لین دین کو رواج دیا گیا [illegible] خودکفیل ہو گئے۔ لوگوں کی زندگی میں نمایاں تبدیلی آئی [illegible] سیاسی جماعتیں (مسلح یا غیرمسلح) [illegible] عروج [illegible] کے طور پر ہر پارٹی میں کئی کئی خاندانوں کے افراد شامل ہو گئے [illegible] وقتاً فوقتاً کسی جماعت کے رکن بنے اور [illegible] شہرت [illegible] حاصل کر [illegible] عمر کے پاسدار ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد سیاسی جماعتوں میں مساوات قائم رکھنے کے لیے سرکاری طور پر ہر جماعت کو یکساں مسلح کر دیا گیا۔ یہ اقدام ہر سطح پر اچھی نظر سے دیکھا گیا اور ہر مسئلے پر لاحاصل اور طولانی بحث سے نجات کے آثار نظر آنے لگے۔ ہر سیاسی جماعت کے نظریاتی استدلال میں پختگی اور پائیداری کا اندازہ [illegible] کے مسلح اراکین اور حمایتیوں کی تعداد سے لگایا جانے لگا لیکن (شاید آتشیں اسلحہ ایجاد نہ ہونے کی وجہ سے) [illegible] سال پہلے قائم ہونے والا یہ نظام زیادہ عرصے نہ چل سکا [illegible] سال ہی میں [illegible] ایسے سیاسی رہنماؤں پر چڑھ دوڑے۔ خدا بھلا کرے فوجی سپہ سالاروں اور حکمرانوں کا کہ بیچ میں پڑ کے معاملہ ٹھنڈا کیا اور عوام کے مشورے سے سارے سیاسی رہنماؤں کو دشمن ممالک میں سفیر یا جاسوس بنا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملک سے باہر بھیج دیا۔ قرطبہ کی [illegible] سیاسی دور [illegible] میں "انسائیکلوپیڈیا قرطبیکا" (حرف [illegible]) [illegible] سیاسی رہنما [illegible] نعیم بالله اور [illegible] قرطبی عوام کی شدید [illegible] سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ یہ سارے ہی رہنما ملک و قوم کی محبت [illegible] کرتے رہے تھے۔ قرطبی سیاسی رہنما قانون پسند اور زندگی بھر قانون کا احترام کرنے والے بڑے لوگ تھے۔ قانون کی ایک یا دو کتابیں چھوٹے سے چھوٹے سیاسی رہنما کی میز پر ہر وقت نظر آتی تھیں۔ بعض نسبتاً بڑے رہنماؤں کے گھر میں قانون کی کتابوں کی پوری کی پوری لائبریری موجود تھی۔ ملک میں قانون کی کتابوں کی سب سے بڑی اور واحد دکان بھی ایک عظیم سیاسی رہنما کی ملکیت تھی۔ حیف، قرطبی عوام نے ایسے بیش قدر سیاسی رہنماؤں کی ذرا بھی قدر نہ کی اور ان کو ملک سے نکلوا کے دم لیا۔

قرطبہ پر ایک ہزار سال میں ایک ہزار سے زائد حکمرانوں [illegible] کہا جائے تو بہتر ہو گا [illegible] خاندانوں نے حکومت کی [illegible] وہاں بھی [illegible] لاتعداد خاندان آباد تھے اور سب ہی کی خواہش تھی کہ ہمارے خاندان کی بھی چند حکومت ہو۔ اسی لیے قرطبہ [illegible] ہر سال ایک نیا خاندان حکومت کرتا تھا۔ اگر

کبھی کبھار کوئی حادثہ [illegible] گالی گلوچ [illegible] یا عدم مشکلات کی وجہ سے [illegible] تو پھر کسی ایسے خاندان کو حکومت کرنے کی دعوت دی جاتی جس کے [illegible] کل افراد کی تعداد سال کے جملہ مہینوں یا ہفتوں کی تعداد کے برابر ہو۔ ایسا کبھی [illegible] قرطبی امیر کی پیچیدگیوں [illegible] ہے اور ہم ان کے ذکر سے آپ کو بور نہیں کریں گے۔ اور پھر قرطبہ میں ایک [illegible] ہی تھا ہم تو اس شے کی بات کر رہے ہیں جو [illegible] تاریخ میں دیر تک محفوظ رہا۔ قرطبہ کی تاریخ میں بہت سی آفتیں [illegible] حکمران، سیلاب، زلزلے، [illegible] اور حملے [illegible] آخری امیر کے ایک حصے میں بادشاہ اور بڑے وزیر کے تعلق سے بڑی دلچسپ بحث کی گئی ہے اور اگر اسے [illegible] سمجھا جاتا تو بادشاہ سلامت [illegible] کے علاوہ بھی [illegible] سے اہم کام [illegible] کرنے کو کیا جاتا تھا۔ مثلاً سرکاری کاغذات پر سکے یا مہر لگانا وغیرہ [illegible] وزیر کی [illegible] لازمی تھا مگر بادشاہ کے [illegible] تو بھی کیا [illegible] قرطبہ میں چند خوش قسمت خاندان ایسے بھی [illegible] حکومت کر [illegible] توفیق استفادہ کیا۔ [illegible] کہ کبھی کبھی حکومت [illegible] لاٹری ہو گی یا کسی کی [illegible] ڈال کر نام نکالا جاتا اور اس میں شامل ہونے کے لیے [illegible] خاندانوں کے نام کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیے جاتے۔

ہزار سالہ قرطبی تاریخ زیادہ تر ایک ہی دور پر مشتمل ہے یعنی افراتفری کا دور۔

قرطبہ میں [illegible] کی مناسبت سے ہر طرف سب سے زیادہ قانون کا دوردورہ تھا ہمیشہ نئے نئے قانون بنائے جاتے [illegible] کی کوشش کی جاتی۔ قرطبی عدالتوں کی عجیب حالت تھی۔ [illegible] مجرم وکیل کو گواہ مجرم کو [illegible] کبھی کبھی تو یہ بھی پتا نہ چلتا کہ مقدمہ کس قانون کے تحت چل رہا ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا کہ گواہ جج بن گیا مجرم وکیل [illegible] اور وکیل گواہ [illegible] عدالت سے باہر آئے اور [illegible] نظر [illegible] ہزار سالہ قرطبی تاریخ میں شاید ہی کوئی لمحہ ایسا آیا ہو جب عوام کو قانون کی عدم موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ [illegible] قانون و انصاف کی [illegible] تلواریں [illegible] لوگوں کے سروں پر [illegible] نظر آتیں اور کسی کو [illegible] محسوس نہیں ہوتا تھا۔ قانون کے تحت قرطبی عوام کی گھٹی میں پڑی تھی۔ [illegible] اس بات سے [illegible] کہ کسی [illegible] زیادہ [illegible] اور لوگ [illegible] قانون و انصاف [illegible] عدالتوں اور حوالات [illegible] کی کوشش کرتے۔

قرطبی طرزِ تعمیر میں بھی اس بات کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے کہ وہاں کے عوام اور خواص آئین سے کس درجہ لگاؤ رکھتے تھے۔ عام لوگوں کے گھروں اور دکانوں کی بناوٹ میں قید خانوں سے مشابہت کا خاص خیال رکھا جاتا۔ عوامی مکانات اور بازار آج کی جدید جیلوں کی مانند [illegible] کوٹھڑیوں اور [illegible] برجوں کی شکل میں ساتھ ساتھ بنائے جاتے اور پوری کوشش کی جاتی کہ یہ آرام دہ اور محفوظ مقامات پر ہوں۔ روشنی، پانی، خوراک اور ہر ایرے غیرے کا گزر ممکن نہ ہو۔ قرطبی عوام کے گھروں کی سب سے نمایاں خصوصیت صحن، روشندان اور بعض حالات میں الگ الگ کمروں کا سرے سے نہ ہونا ہے۔ دوسری جانب طبقۂ امرا، حکمرانوں اور سپہ سالاروں کے گھر (جنہیں محل قرار دینا قرینِ قیاس سے [illegible] کے باعث متروک تھا) علاوہ عدالتوں کی پرشکوہ اور عظیم الشان عمارات کی شکل کے ہوں۔ ایسی عمارات سے بیمارکرنہ وسیع رقبہ مصنوعی دیواریں [illegible] تمام غسل (ایجاد ہو چکا تھا) کی غرض وغایت سے آراستہ وسیع برآمدے، لاتعداد ہال اور سائبان سے بھرے ہوئے کمرے ان محلات کی شان وشوکت کا منہ بولتا ثبوت مانے جاتے تھے۔ قرطبی محلات کی تعمیر اور رہائش و زیبائش میں [illegible] ہوئے اور [illegible] سروسامان [illegible] ملکی و غیرملکی کی تفریق روا نہیں رکھی گئی۔ محلات کی شکل وصورت کی علاوہ عدالتوں کی عمارات سے مشابہت کا فائدہ حکمرانوں نے خوب اٹھایا اور بیشتر حکمران نے اپنی حکومت کا عرصہ محل میں رہتے ہوئے اپنی قانونی مدت یہیں پوری کر کے گزار [illegible] کی تہذیب یافتہ دور میں قرطبیا کے قانونی مراحل اور سہولیات کا تصور کرنا ناممکن ہے۔ اگر کہیں ایسا ہو جاتا جیسا وہاں تھا تو پریس اور الیکٹرانک میڈیا بھی میڈیا کی پہنچ ہی پڑتے رہیں۔ جیسی کہ لیتی تھیں۔

قرطبی عوام اور حکمرانوں کو اقرار ہے کہ ہزار برس تک باہمی امن وانصاف اور اصول و قانون کی عملی پاسداری کرتے رہے اور کسی نے ایک بار بھی شکایت تک نہ کی۔ قرطبی عدالتی نظام اور قوانین کے بارے میں کوئی الگ دستاویز تو دستیاب نہیں البتہ "قرطبی تاریخ مفصل بالتصویر" میں درج ہے کہ مقدمات کا فیصلہ ہر روز کیا جاتا۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا کہ لوگ عدالتوں سے مطمئن ہنستے یا زاروقطار روتے ہوئے باہر نہ آتے ہوں۔ الجھے ہوئے پیچیدہ مسئلے طلب اور متنازعہ مقدمات نمٹانے کے سلسلے میں بھی علاوہ عدالتوں کا [illegible] ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی کوئی مدمقابل نہیں۔ عموماً اس طرح کے مقدمات کے فیصلے ادھر گھنٹے میں کر دیے جاتے۔ کبھی کبھی گواہان، وکلا یا ملزم کے اصرار پر مقدمے کی کارروائی کو طول دیا جاتا مگر یہ مدت بھی تین دن سے زیادہ نہ ہوتی۔ زیادہ تر مقدمات کمائی کے کہ دیوانی، فوجداری اور سوسری نوعیت کے ہوتے تھے۔ حوالتی کے خلاف مقدمات دائر کرنے کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ قرطبی دور کی سب سے اہم اور مفید ایجاد شاید قانون ہی ہے جسے "اسپانیکلوپیڈیا قرطبیک" (مری پیدیشن) کے مطابق قرطبی زبان میں

"کوٹا" کہتے تھے۔

(قرطبی) تاریخ ہمیں معاف نہیں کرے گی کہ ہم اب تک اس کے اہم ترین حصے کو فراموش کیے ہوئے ہیں۔ جیسے یہ ذکر بھی ہو جاتے اور قرطبی سپاہ کی بات کی جائے یہ افواج اپنی محبِ وطن اور باکردار سپہ سالاروں اور جانثار اور جری سپاہیوں کے باعث دور دور تک شہرت رکھتی تھیں۔ قرطبی تاریخ کے ایک ہزار سال میں سے سترہ نو سو سال یا اس سے کچھ کم سپاہ قرطبیہ کی شاندار روایات، مثالی نظم وضبط، حسنِ تدبر اور جذبۂ ایثار کے تذکروں سے عبارت ہیں۔ "اسپانیکلوپیڈیا قرطبیک" (مری ایڈیشن) اور "قرطبی تاریخ مفصل بالتصویر" میں ایسی عبارات جابجا ملتی ہیں۔ تاریخ انسانی کی اس نایاب دستاویزات کی اکثروبیشتر حوالہ جات اور ابواب قرطبی سپہ سالاروں کی بہادری، سخی اپنی سخاوت، شجاعت، صبر، استقامت، قناعت، غروب کی داستانوں سے معمور ہیں۔ سپاہیوں کی ملک وقوم، دوست احباب، مال ومتاع اور سپہ سالاروں سے محبت اور وفاداری کی ایسی ایسی حکایات سامنے آتی ہیں کہ دل یہ حیران ہو کے جی و دنیا سے نجات ہوئی سکتے ہیں۔ صوفیا کرام اور اولیاءاللہ کی حق گوئی اور راست بازی کی طرف بار بار دھیان جانے لگتا ہے اور اسے زیرِ حسی واپس لانا پڑتا ہے۔ افسوس ہو رہا افسوس کہ "قرطبی تاریخ مفصل بالتصویر" کی [illegible] اور کی قرطبی روایات کے مطابق سلطنت کی حدود میں [illegible] کو ایک ہزار سال میں کبھی بھی عروج نصیب نہ ہو سکا۔ ورنہ آج یہ مردانِ [illegible] جوہر [illegible] اور سپاہ وفا کے رہبر زبانی خلق کو [illegible] مشارہ [illegible] تصور کیے جا رہے ہوتے۔ دل چاہتا ہے کہ وقت تھم جائے اور قرطبی تاریخ کے یہ ایمان افروز اور روح پرور مناظر چشمِ انسانی میں گردش کرتے رہیں۔ موضوعی جانبدار کی یہ کٹھورکی جماعت زندگی اور حکومت کے ہر موڑ اور ہر مرحلے پر قرطبی عوام اور حکمرانوں کی رہنمائی، تادیب و تعمیر اور رجوروتوبیخ کرتی نظر آتی ہے۔ تہ میں تاریخ کے ہزار سالہ دور میں متعدد معاملات پر ان بیکرکار اور حق پرست گروہ نے راست اقدام کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اور عوام اور حکمرانوں کو تلخی اور امورِ مملکت کی پیچیدگی سے الگ رکھ کر اپنے طور پر ملک وقوم اور سلطنت کی فلاح وبہبود اور جمہوریت کی بحالی کے لیے انقلابی اور دوررس اقدامات کیے مگر افسوس کہ قرطبی عوام اور حکمرانوں کی کوتاہ بینی، ناعاقبت اندیشی، مسخ سوچ اور جانبداری کے باعث ان سے خاطرخواہ فائدہ نہ اٹھایا جا سکا اور خوشحالی اور فلاح وبہبود کا عمل ہمیشہ سپاہ اور سپہ سالاروں تک ہی محدود رہا۔ اس بات کا بھی مثبت پہلو دیکھنے کے بجائے قرطبی عوام اور حکمران سارے وقت سرعبادت اور بدکاری میں لگے رہے جس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

قرطبی افواج اور فوجی جرنیل محض امورِ مملکت چلانے اور اندرونی شورشیں رفع کرنے ہی میں ماہر نہ تھے بلکہ جنگی اور سیاسی حکمتِ عملی، ملکی اور غیرملکی سطح

کی حریت پسندی اور فنکاری بہار میں بھی بے مثل اور بے نظیر تھی۔ قرطبی تاریخ میں ان
سپہ سالاروں کی میدانِ جنگ میں مہارت، بردباری، دوراندیشی، قوتِ فیصلہ اور ان میں پسندی
کی مثالیں جابجا ملتی ہیں۔ آج سے ہزاروں سال پہلے بھی یہ خوبیاں موجود تھیں اور ماتحت سپاہ
اور سپہ سالاروں کے وجود پر عقلِ انسانی ششدر اور روحِ حیات پریشان ہے۔ سپہ سالاروں
کی حکمت اور بصیرت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ حکمران ہوں اور عوام کو مسلسل
قیادت اور رہنمائی اور ساتھ ہی ساتھ امورِ مملکت میں بلاجبر نیابت بھی کرتے تھے۔ ہر
اوقات افواج کے انتظام، اسلحے کی خریداری اور جنگی تیاریوں میں مصروف رہتے تھے جس
کی وجہ سے بیشتر دشمن ممالک جنگ کی ابتدا تک سے باز رہتے۔ قابلیت، صلاحیت اور جرات،
شجاعت سے مالامال یہ سپہ سالار جنگ کی صورت میں پہلے سے طاق تعداد میں دشمنوں کی
تعداد طے کر لیتے کہ سالانہ، ستر یا ستائیس ہی سے زیادہ یا کم نہ لڑیں گے۔ بردباری اور امن
پسندی یہی کہ ہمیشہ جنگ و جدال سے پرہیز کرتے اور جنگ کی حالت میں انسانی جانوں
کی ہلاکت اور خونریزی کے پیشِ نظر مصالحت پسندی کو ترجیح دیتے۔ ایسے سارے بہادر
کبھی جیت یا طویل جنگ کو آخر میں دشمن کے سپرد کر دیتے۔ قناعت پسند کہ ہمیشہ
مالِ غنیمت ایک حد سے زیادہ جمع کرنے اور فتوحات سے یکسر گریز کرتے۔ انسانیت کا
جذبہ ایسا کہ کبھی دشمن سپاہیوں کو ایذا دینے کی صعوبت میں نہ ڈالتے جیسا کہ پہلے ذکر
چکا ہے قرطبی سلطنت کی حدبندی یعنی سرحدوں کا اختصار بھی دراصل انہی قناعت پسند
جرنیلوں کی مسلسل کاوش کا نتیجہ تھا۔ یہ کشادہ دل سپہ سالار دشمن افواج کو گرفت اور
ذلت سے بچانے کے لیے جنگ کے جبری خاتمے پر یہی سپاہ کے ساتھ ... کو مسخر کر کے
وطن واپس جاتے ہوئے ان کی بھلائی کر دیتے اور معمول جانتے۔ جی تو نہیں چاہتا کہ سپاہ
سرفرازی کے تذکرے کو محدود و مختصر کیا جائے، لیکن قرطبی طرزِ معاشرت کی کچھ اور
داستانیں بھی بیان کرنا چاہتی ہیں ... سپاہ ... اور سپہ سالاروں
کے حوالے سے یہ کہ موسیٰ کی اس جماعت کی زندگی بہت سادہ اور درویشانہ گزری۔
خورشکی مال اسباب سے کبھی دریغ نہ رکھے۔ لباس، خوراک، روپیہ پیسہ اور اسلحہ ہمیشہ
منگی اور فقرا کی مانند بلاتکلف استعمال کیا۔ کبھی اپنا گھر بنانے کی فکر نہ کی اور خود کو
مع خاندان کے سرکاری محلات میں رکھ کر ساری زندگی مسافروں کی طرح جیتے جانے کا
ثبوت دیتے رہے۔ کاش ہم بھی اس دور میں ہوتے اور ان برگزیدہ سپہ سالاروں یا ان کے
مقلدین کی صحبت سے فیضِ الٰہی کی دنیا و آخرت میں سرخرو ہوتے۔

بحیرۂ قرطبیا کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے، اب قرطبیا کے جغرافیائی، معاشرتی اور
اقتصادی حالات کا مزید جائزہ بھی لے لیا جائے تاکہ قرطبی زندگی کے دیگر پہلو سامنے
آ سکیں۔ اب سے ہزاروں برس پہلے اس ملک خداداد میں چھ دریا بالترتیب بہتے تھے، اور کچھ
صحرا اور بہت سارے پہاڑ بے ترتیبی کی حالت میں ادھر ادھر پائے جاتے تھے۔ کچھ پہاڑوں پر

سردیوں میں خوب برف پڑتی اور گرمی آتے ہی پگھلنا شروع ہو جاتی۔ ان پہاڑوں پر سے
ہی قرطبی اور خورشکی سورج دیوتا چڑھتے اترتے تھے۔ سارے دریاؤں کی طرح قرطبی دریا
بھی سارا سال سمندر ہی کی طرف بہتے رہتے تھے اور کوئی پوچھ گچھ نہ ہوتی تھی۔ شرح
خواندگی عشاریہ صفر فیصد ہونے کی وجہ سے ہر طرف ذہنی پسماندگی کو بالادستی حاصل
تھی اور اسی باعث پانی کے خرچ اور بہاؤ وغیرہ کا حساب رکھنے کا کوئی دستور نہیں تھا۔
شکر ہے ہم اس دور میں نہ ہوئے ورنہ آج اپنے سارے دریاؤں کے پانی کے حساب کتاب کی
سمجھ کی اہمیت اور افادیت پر غور و خوض کرنے سے یکسر محروم رہ جاتے۔ پانی کی تقسیم
کے سلسلے میں یہ ملک یعنی قرطبیا بڑا بدنصیب تھا۔ قرطبی عوام جی میں آتی تبھی نہاتے
نہاتے، صبح شام گھر بھر کے میلے کپڑے دھوتے، نئے پودوں کو بھی بالٹی بھر بھر کے
پانی دیتے، کھیتوں میں پانی کھول کے بھول جاتے۔ نابہجار قرطبی بچے گھر بھر کے برتن
لڑھکاتے رہتے تا کہ ان میں پانی بھر کے سارا دن ایک دوسرے کی طرف پھینکتے رہیں۔ شہر
شہر گاؤں گاؤں سرکاری خرچ پر گھروں کے باہر اور سڑکوں کے کنارے میں پانی کا اتنا
چھڑکاؤ کیا جاتا کہ اکثر وقت کیچڑ ہی رہا کرتی۔ واضح رہے کہ اس وقت تک پانی ... پاور
بھی پانی کی حالت سے بجلی بنانا شروع نہیں ہوا تھا ورنہ قرطبی سارے کا سارا پانی
استعمال کر کے دریا خالی چھوڑ جاتے۔ انسانی تاریخ میں پانی کا اتنا زیادہ بے جا اسراف آج
تک نہیں ہوا اور شاید اسی کا خمیازہ ہمیں بھی بھگتنا پڑ رہا ہے۔ سچ ہے کرے داڑھی والا
پکڑا جائے مونچھ والا (یہ ایک قرطبی محاورہ کا اردو ورژن ہے)۔ قرطبی دریا سے بہنی
دریاؤں سے کہیں کم اور کہیں زیادہ فاصلے پر صحرا بھی تھے لیکن عوام نے ان پر کوئی توجہ
نہیں دی اور وہ عرصہ دراز تک خالی پڑے رہے۔ کھجور کے درخت لگانے یا اونٹ پالنے کی بھی
کوشش نہیں کی گئی۔ شاید ظاہر ہے، قرطبی جنگلات گھنے، سرسبز، ہوادار اور درختوں
سے بھرے ہوئے تھے۔ نکرنگیں ادھر ... اور گرگٹ وغیرہ ایک ہی جگہ پانی پیتے تھے۔
قرطبی شکار کا شغف لیے رفتہ ہی آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ شاید وہ ویجی ٹیرین تھے۔ ان
جنگلات میں پالتو جانور اور پرندے بھی پالے جاتے تھے مگر اس بات سے عوام کو کوئی
سروکار نہ تھا۔ گمان غالب ہے کہ ڈھور یا لکڑبگھا قرطبیوں کا محبوب جانور تھا، اگرچہ
قرطبی تاریخ مفصل باتصویر میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ بعض جنگلی درندے کی ساتھ
ساتھ ہوتے تھے لیکن اس زمانے میں یہ بات معیوب نہیں سمجھی جاتی تھی۔ قرطبیا کی
زمین کہیں کہیں نرم اور کہیں کہیں بہت زیادہ سخت تھی۔ صحرا میں اور سمندر کے کنارے
ریت بھی پائی جاتی تھی۔ درخت لگانے کا شوق قرطبی عوام کے پاس سے بھی نہیں گزرا
تھا۔ اینٹ پانی ضائع کرنے کی خاطر مشغلے کے طور پر وہ پیڑ لگا لیا کرتے تھے۔ کیکر، ببول
اور جنگل جلیبی کے درخت ہر گھر کے آگے پیچھے اور ادھر نظر آتے تھے۔ پانی اور پودوں کی
مقدار کے لحاظ سے اور قرطبیوں کے مزاج کے شایانِ شان نہ ہونے کی وجہ سے گملے کی

Scanned with CamScanner

ایجاد اس دور میں ممکن نہ ہو سکی۔ عام لوگوں کے لیے فرنیچر بنانے کا فیشن عام نہ تھا اس لیے درختوں کی لکڑی صرف چوکھٹ دروازے وغیرہ بنانے، علاوہ ازیں سربمہر ہو ہاتھ سے ہتھیاروں میں مدد کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔

"قرطبہ کی تاریخ مفصل باتصویر" میں شامل مختلف ادوار کی تصاویر اور دیگر حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ قرطبی سوسائٹی کی خواتین اور مرد سب سے ہی قسم کا کسی طور لگاؤ رکھتے تھے۔ اکثر قرطبی صبح کی سیر پر ہی گھر سے نکلتے تو معمول واپس نہ آتے۔ اس زمانے میں ذرائع آمدورفت اتنے زیادہ نہیں تھے۔ عام لوگ پیدل یا پھر ہاتھی اور شترمرغ پر سوار ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے۔ دیگر جانوروں اور پہیوں کا استعمال حکمرانوں امرا اور سپہ سالاروں کے لیے مخصوص تھا۔ قرطبی حکمران سوسائٹی کے معاملے میں اپنے ساتھ کی عوام سے کسی طرح پیچھے نہ تھے بلکہ سچ پوچھو تو بہت زیادہ آگے تھے۔ وہ اپنا یہ شوق غیرملکی دورے کر کے پورا کرتے تھے۔ حکمران خاندان کے زیادہ تر افراد سال کا اکثر حصہ دوست ملکوں میں غیرملکی اور دشمن ممالک میں جاسوسی کر کے گزارا کرتے تھے۔ اس طرح خارجہ پالیسی بھی مستحکم رہتی تھی۔

فن موسیقی اور آرٹ عوام اور خواص میں یکساں مقبول تھے۔ مسہری بچھونے اور چوبی پردے کی تصاویر بطور دیکھنا اور بنانا اسی دور میں شروع ہوا۔ قرطبی فرمانرواؤں اور سپہ سالاروں کی قدآدم تصاویر آرٹ کی انتہا سمجھی جاتی تھیں۔ ایسی تصاویر بنانے والوں کو اس قدر انعام اکرام دے دیا جاتا کہ مصور کسی اور کام کے قابل نہیں رہتا تھا اور باقی ماندہ زندگی اس شاہکار کے سایۂ عاطفت میں گزار دیتا تھا۔ موسیقی کی تاریخ میں ڈھول اور طبلے کو جو عروج قرطبی دور میں نصیب ہوا اب تک کسی دوسرے ساز کے حصے میں نہیں آیا۔ ڈھول بجانے کے مقابلے اور طبلے پر سنگت کی محفلیں دن رات سرکاری سرپرستی میں جاری رہتیں۔ عوام کے ذوق وشوق اور انہماک کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب مقابلہ کرنے والے نقارہ پیٹنا شروع کرتے تو لوگ جوق درجوق کھنچے چلے آتے اور ان کی کمال مہارت اور مشاقی پر بےاختیار ہو کے مرحبا مرحبا کے نعرے لگانے لگتے۔ ہر شہ حکمران یا سپہ سالار کی دارالحکومت آمد پر ڈھول پیٹنے اور نقارہ بجانے کے انفرادی اور اجتماعی مظاہرے منعقد ہوتے اور استادانِ فن اپنے کمالِ ہنر اور جان سوزی کی حسب توفیق داد اور انعام پاتے۔ مصوری میں شوخ رنگوں کا بےتحاشا استعمال اور موسیقی میں مسلسل اونچے اونچے سُر لگانا قرطبی دور ہی کی یادگار ہے جیسا کہ سرسری طور پر بتایا جا چکا ہے، قرطبی زبان کی خاطرخواہ ترویج نہ ہونے کی وجہ سے قرطبی ادب میں قابل ذکر تخلیقات وجود میں نہ آ سکیں۔ قرطبی سپہ سالاروں اور فرمانرواؤں کی تقاریر اور سرکاری مکاتیب میں مستعمل زبان رواں، سہل ممتنع اور فصاحت و بلاغت کی باعث مستند اور بےعیب سمجھی جاتی تھی۔ سپہ سالار اعظم کی خودنوشت "پیروکار فتح کی

ڈائری"، آخری قرطبی حکمران کی تصنیف "دیوانِ خوردوکلاں"، اور ایک گمنام قرطبی سپاہی کا مرتب کردہ ناول "میری قرطبی قاصد" یہ انمول جواہر ہیں جن کی بدولت قرطبیات نے عالمی ادب کو تہی دامن رہنے سے بال بال بچا لیا۔ آج بھی سارے کا سارا قرطبی ادب انہی تین بےمثال ادب پاروں پر مشتمل ہے۔ شاید کسی نے چوری چھپے کچھ اور بھی لکھنے کی کوشش کی ہو مگر "قرطبہ کی تاریخ مفصل باتصویر" میں اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ یہ کس قدر حیرت ناک بات ہے کہ قرطبہ میں کاغذ کی تیاری اور استعمال کے باوجود اخبار شائع نہیں ہوتے تھے۔ نہ صبح کے اور نہ شام کے۔ رسالوں اور کتابوں کا بہت زیادہ شائع ہونا بھی کسی طرح ظاہر نہیں۔ قرطبیہ کی حدود میں شائع ہونے والا واحد رسالہ "گزٹ قرطبیہ" تھا جو ہر ہفتے پابندی کے ساتھ سرکاری اہلکاروں کے ہاتھوں میں نظر آتا تھا۔ افسوس کہ فی زمانہ اس نایاب دستاویز کی کوئی نقل یا قلمی نسخہ موجود نہیں ورنہ اس دور کی علمی ادبی اور فکری رجحانات پر مزید روشنی پڑ سکتی تھی۔ تین لافانی ادب پاروں اور قانون کی کتابوں کی اقوام سے موجودگی کی شہادت پہلے ہی دی جا چکی ہے۔ ہماری ناقص رائے میں پرنٹ میڈیا کا نہ ہونا ہی قرطبی سلطنت کے زوال کا اصل سبب ہے۔ صحت مند اور باشعور میڈیا کی موجودگی کی ضرورت اور فوائد پر قرطبی عوام اور حکمرانوں کی نظر نہیں جا سکی جس کا خمیازہ انہیں کو بالآخر ایک ہزار سال بعد بھگتنا پڑا۔ الیکٹرانک میڈیا بھی آج کی ایجاد ہے ورنہ شاید قرطبہ کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

قرطبی عوام کھیل کود کے بھی بہت رسیا تھے۔ کرکٹ بھی کھیل ہوتا مگر ایک سے لگن اور جانفشانی کا مظاہرہ کرتے۔ چور سپاہی، اندھا بھینسا، آنکھ مچولی، چھپاچھپائی اور کوڑا جمال شاہی دراصل قرطبیہ ہی میں ایجاد ہوئے اور قبول عام کی حدود سے آگے جا پہنچے۔ ان کھیلوں میں قرطبی کھلاڑیوں کی مہارت اور مثالی کارکردگی آج بھی ایک ریکارڈ ہے۔ قرطبی کئی صدیوں تک ان کھیلوں کی ناقابل شکست چیمپئن تھی۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس اور سکواش جیسے شاہی کھیل ہمیشہ طبقہ امرا تک ہی محدود رہے اسی طرح گولف، پولو اور شطرنج سے حیرت انگیز طور پر مماثل کھیل قرطبی سپاہ کے لیے مخصوص تھے۔ عوام ابتدا میں مذکورہ کھیلوں کے علاوہ کبھی کبھی کبڈی اور رسہ کشی کے مقابلوں میں حصہ لیتے تھے۔ مگر قرطبہ میں عوام الناس کے آؤٹ ڈور کھیلوں کے لیے کبھی بھی فضا سازگار نہیں ہوئی اور غریب قرطبی ہمیشہ کے لیے ان ڈور کھیلوں کے محتاج بلاشبہ ہو کر رہ گئے۔ حکمران اپنی جانب سے ہمیشہ اور ایسے کھیلوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتے تھے جن کا خاتمہ عموماً جھگڑے فساد اور دھینگامشتی پر ہوا کرتا۔

قرطبی خواتین کو امور خانہ داری اور جنس مخالف کی جانب سے بلاناغہ زدوکوب سے کبھی اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ چین سے کوئی ان ڈور کھیل ہی کھیل سکیں۔ قرطبی خواتین اپنا فاضل وقت بیٹھ اپنے مردوں کی بنیانیں رفو کرتیں اور رومال کاڑھتیں یا آئینے کے سامنے

Scanned with CamScanner

کھوکھلی ہو جاتی اور اسی [illegible] عادت کے باعث جس [illegible] کے باوجود [illegible] گرم کر [illegible] وقت [illegible] مرہم رکھیں یا [illegible] سے پوری رہیں۔ قرطاجنی بچے، [illegible] کام میں [illegible] ماں باپ کی نقل کرتے رہتے [illegible] دوبارہ ذکر بے سود ہے۔

قرطاجنی لوگ میل ملاپ، حسنِ اخلاق، رواداری اور باہمی ایثار کی موجودہ روایات کے اصل امین تھے۔ شادی بیاہ، غمی خوشی، مرنے جینے میں ایک دوسرے سے بڑھ کر حصہ لیتے [illegible] گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے جیسا آج ہزاروں سال بعد دیکھنے میں آ رہا ہے۔

قرطاجنی عوام بنیادی طور پر کسان، محنتی، جفاکش تھے اور زراعت کے پیشے پر گزر بسر کرتے تھے۔ حکمران اور [illegible] بھی [illegible] زندگی کی طرف [illegible] اور ایک ہزار برس تک قوم کی زرعی مصروفیات کی نگرانی اور فصلوں کی پیداوار کا حساب کرتے رہے۔ مشینی کاشتکاری کا آغاز نہ ہونے کی وجہ سے بیشتر کام مثلاً فصل کی کٹائی وغیرہ میں ہاتھ سے کیے جانے پر زور تھا۔

قرطاجنی کھیتوں میں شرشوں (ایک قرطاجنی مصنف)، بھنگ، پیاز اور بھنڈی وسیع رقبے میں کاشت کیے جاتے اور بہار کے موسم میں عجیب منظر پیش کرتے۔ ملک کی [illegible] آبادی زراعت سے وابستہ تھی، بڑی کھیتوں سے کچھ فاصلے پر ہی رہا کرتی اور آمدورفت کے بیچا مسائل بھی پیدا نہ ہوتے تھے۔ قرطاجنیہ کی باقی آبادی آج کی طرح شہری تھی اور شہروں ہی میں رہنا پسند کرتی تھی۔ قرطاجنی زراعت میں چاول، گندم، مکئی، کپاس [illegible] کیونکہ مجبوری ہوتی [illegible] سرکار اور اہلکار تیار حالت میں فصل اٹھا کر لے جاتے اور [illegible] دنوں کے لیے سرکاری مقامات پر جمع کرا دیتے تب شہری علاقوں [illegible] میں آلو پالک کی کاشت کی جاتی تھی۔

صحت وتعلیم کے شعبے میں عوامی سطح پر کوئی نمایاں پیش رفت نہ ہو سکی۔ اتنا ضرور تھا کہ شہری لوگ ایک سے دس تک کی گنتی اور ابتدائی حروف تہجی حفظ کی [illegible] پہچان لیتے تھے۔ [illegible] سرکار [illegible] سہولت موجود تھی۔ صحت کے میدان میں بھی ایسے ہی حالات تھے۔ سرجری، میڈیسن [illegible] وغیرہ تو آج کی اختراعات ہیں۔ اس زمانے میں تو قرطاجنی حکما اور طبیب بیماروں اور تیمارداروں پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ [illegible] اور شخصیت اعلیٰ کے [illegible] مریضوں کو [illegible] پھرتے تھے، ہر [illegible] کو مفت چیرا لگاتے، زخموں پر پھاہے رکھتے، جلاب دیتے اور [illegible] قرطاجنی [illegible] عوام الناس [illegible]

دماغی اور جسمانی صحت کا اصل راز تھے۔ خوراک کے ساتھ چوری کا بلاناغہ استعمال قرطاجنی قوم ہی نے شروع کیا۔ "قرطاجنی تاریخ مکمل بالتصویر" کے مطابق اچھے اور خراب دنت نکالنے کے لیے غیرملکی دندان سازوں کو ملک میں کام کرنے کی اجازت دینا بھی ایک قرطاجنی روایت ہے۔

صنعت اور تجارت کی قرطاجنی دنیا میں بھی بہت خسارے اور افراطِ زر کے باعث [illegible] کا رجحان برقرار رہا۔ درآمدات پر پابندی کا یہ عالم تھا کہ قرطاجنی حکمران معمولی سوئی، بٹن اور [illegible] تک چوری چھپے منگواتے اور سرکے کی بوتلوں میں غیرملکی عطر بھر بھر کے ذخیرہ کر لیتے۔ زرمبادلہ کی ملکی ضروریات کی خاطر قرطاجنی حکمت کی مستعمل شدہ مشروب، گڑولی، [illegible] اور پاس کا [illegible] برآمد کیا جاتا تھا۔ قوم میں بچت کی عادت اور فضول خرچی سے پرہیز کی خاطر کرنسی کا استعمال ممنوع تھا اور [illegible] سلطنت اور سرکاری اہلکار خریداری کی صورت میں نقد ادائیگی سے اجتناب کرتے تھے۔ قرطاجنی صنعت کاروں نے بھی ایک ہزار سال ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گزارے اور [illegible] شہروں کی بلدیاتی حدود کے اندر یا باہر ایک مربع سے زیادہ کارخانے یعنی [illegible] لگانے پر پابندی عائد تھی۔ ان کارخانوں میں مختلف دھاتوں سے توپیں، چھتے اور [illegible] تیار ہوتی تھیں۔ [illegible] دستی بنائی جاتیں۔ زرعی اجناس سے [illegible] تیار کیا جاتا تھا۔ تنور لگانا سب سے منافع بخش کاروبار تھا لیکن [illegible] اور چکنی مٹی سے برتن سازی کو قرطاجنی صنعت وتجارت کا اہم ستون [illegible] وسیع رہی کہ [illegible] اور گھڑیوں پر کیرا اور فرشی دریاں بنتا عام گھریلو صنعت شمار ہوتی تھی۔ قرطاجنی حکمران، امورِ مملکت اور عوام کی فلاح وبہبود میں [illegible] کہ [illegible] حکمرانوں کی طرح فنِ تعمیر میں کمال حاصل نہ کر سکے۔ [illegible] فرمانروا ایسے کاموں کو فضول اور وقت کا ضیاع قرار دیتے تھے لیکن پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ تعمیری ورثہ چھوڑنے پر رضامند تھے۔ قرطاجنی عہد کی تعمیرات کا کچھ ذکر تو ناموں کے باب میں ہو چکا۔ بس تھوڑا سا بیان اور دریاؤں [illegible] دراصل قرطاجنی تخلیق ہیں۔ یہ پل موسلادھار بارش اور سیلاب میں بہہ جاتے، مگر ان کا دوبارہ بنا لینا قرطاجنیوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ [illegible] گھوڑوں کی [illegible] سڑکیں بھی بنائی تھیں۔ کشادہ اور ہموار [illegible] ماہرین کی موثر منصوبہ سازی کا جیتا جاگتا ثبوت تھیں۔ [illegible] شہری [illegible] اپنی مدد آپ کے قرطاجنی اصول کے تحت [illegible] اپنے گھر خود بنا لیتے تھے بلکہ سرکاری عمارات اور عبادتگاہوں کی محلات کی تعمیر میں بھی بلامعاوضہ ہاتھ بٹاتے رہے۔ عوام الناس اپنے گھروں کی تیاری میں بالو ریت اور [illegible] کا خوب استعمال کرتے جبکہ دوسری طرف عبادتگاہیں اور

Scanned with CamScanner

بلکہ مختلف دفاتر اور محلات کی تعمیر مخصوص مینابت اور محدبات سے منحنی اُبھرے
سے عمل میں لائی گئی، شوپیکل دیواریں، تعمیر دیواریں اور سم وا تیرکمان قرطبی طرزِ تعمیر کی
رومانیت اور مداویزاہ میں چار چاند لگا دیتی تھیں۔

قرطبہ کے امرا اور عمائدین باغبانی سے وابستہ لگاؤ کے باعث بے کثیر وقت گلشن کے
کاروبار میں گزارتے تھے۔ پودوں کی قلم کاری، تراش خراش، آلات باغبانی، جڑوں اور تنے کے
امراض کے فوری علاج کے بارے میں وہ بے تعداد صلاحیت کے مالک تھے۔ قرطبی دور کا مقبول
ترین محاورہ "جہاں فرصت ہے وہاں باغ ہے" تھا۔

قرطبی باغبانی کی نمایاں خصوصیت سبزیوں اور پھلوں کے وہ لہلہاتے باغ تھے جو
بیل بوٹوں، خوش نما چڑیوں اور پرندوں کی چہکار سے ہمہ وقت آباد رہتے تھے۔ گلکوونے،
شہتوت، کھجوریں اور انگور کے باغات عام تھے اور کھجور کی مخروطی بیلیں قرطبی
طرزِ رہائش کا لازمی جز تھیں۔ "قرطبی تاریخ مفصل باتصویر" میں گنبدے کے علاوہ کسی اور
پھلدار پودے کے باغیچے کا ذکر نہیں۔

غرض کہ اب سے ہزاروں سال پہلے قرطبی اور قرطبہ اپنی عظیم اور شاندار روایات،
جداگانہ طرزِ حیات اور منفرد تہذیب و تمدن کے باعث ہم عصر قوموں پر واضح برتری
حاصل کیے ہوئے تھے اور شاید اسی لیے باقاعدہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت قرطبی
سلطنت کا بتدریج خاتمہ عمل میں لایا گیا، اور وہ ایک ہزار سال کے بعد رفتہ رفتہ زوال کو
پہنچی۔

قرطبی تاریخ نگار اپنی سلطنت کے خاتمے کے اسباب بہت زیادہ تفصیل سے بیان نہیں
کرتے مگر "قرطبی تاریخ مفصل باتصویر" میں جو خفیف اشارے کیے گئے ہیں ان سے معلوم
ہوتا ہے کہ زوال کا بہت اہم سبب قرطبی سلطنت کے ہزار سالہ دور کی واحد ملکہ کا
مختصر عرصۂ اقتدار ہے۔ اس اکلوتی ملکہ کے تعلقات قرطبی سپہ سالاروں اور گزشتہ
حکمرانوں سے بوجوہ خوشگوار نہیں رہے تھے اور یہ مشترکہ بدخواہ سازشی حربوں کی ہر
موقع بے موقع اس کی واحد سوہر نامہ کو فرار دیتے رہتے تھے۔ قرطبی زبان میں کتاب میں
بڑی سے مماثل محاورہ اسی بدنصیبی کی وجہ سے اسی دوران وجود میں آیا ہے کہ ایک مرد
سرکاری عہدے پر ہے، نقدی، قصیدوں اور جس محافظ ملکہ کو عوام کی ملکہ کی ور سی
تعلق سے اپنی ملکیت سمجھتا اور بلاجھجک استعمال کرتا تھا۔ اتنی ذرا سی بات پر ہر کس
و ناکس نے بکر بیانی شروع کر دی اور طومار بندی کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا
جب تک کہ دکھیاری ملکہ کو روپوشی کر کے شاہی محل سے نکالا نہ مل گیا۔ ملکہ قرطبیا
میں بہ لحاظ حسن و دانش، عقل و جمال، ذہانت و دنیاداری بےشمار صفات بدرجۂ اتم موجود
تھیں، مگر حیف صد حیف کہ عقل و خرد سے عاری قرطبی اس سے فیض یاب نہ ہو سکے۔

ملکہ کی قرطبی سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنے کی مختصر داستان بھی دلچسپی

سے خالی نہیں۔ آئینِ قرطبہ کے تحت حکمرانی کے لیے ہونے والی قرعہ اندازی کے موقع پر
حکومتِ وقت کے کسی بدخواہ نے ایک بدنام اور مرحوم سیاسی رہنما کی بڑی پوتی کا نام
بھی پرچے پر جلی حروف میں لکھ کے باقی ناموں کے ساتھ پٹارے میں ڈال دیا۔ قرعہ اندازی
پر معمور سپہ سالار اعظم نے پٹارے سے جب نام نکالا تو حسنِ اتفاق یا شومیٔ قسمت سے
سیاسی رہنما کی بڑی پوتی کی تو جیسے لاٹری نکل آئی۔ مگر بیشتر عمائدین اور اہلکار
یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ اب تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا تھا اور ویسے بھی مثالی
طور پر قرطبی شہری آئین کی بالادستی اور قانون کا احترام ہر حال میں ملحوظ خاطر
رکھتے تھے۔ اس لیے فوراً دوسری قرعہ اندازی کو بدعنوانی اور خلافِ اخلاق خیال کرتے
ہوئے ملکہ کو سال بھر کے لیے نیا حکمران بنا لیا گیا۔ "قرطبی تاریخ مفصل باتصویر" کے
مطابق یہ غلطی پہلی اور آخری بار ہوئی۔

ان بیم و مظلوم کی گزشتہ زندگی چونکہ چادر، چاردیواری اور امورِ خانہ داری کی نذر
ہوگئی۔ اس لیے اس میں گزری تھی اس لیے اقتدار سنبھالتے ہی ملکہ نے اپنی شوہر سمیت ہر
چھوٹی بڑی، کھوٹی کھری، خاص و عام کو اندرونی اور بیرونی ملکی سربراہی کرنی اور امورِ
مملکت و عمائدینِ سلطنت کے بارے میں بےدھڑک اور سرعام ہوتے ہوئے جانچ کی گئیں چھپی
دی۔ طبقۂ امرا اور بعض عام اہلکاروں کو بھی یہ اقدام ناگوار گزرا مگر اب کچھ نہ کچھ تو
برداشت کرنا ہی تھا۔ قرطبی ملکہ کا اپنے شوہر میاں کو فی الفور اتنی زیادہ آزادی دینا
بہت مہنگا پڑا اور ہاتھیں بھری کو اندر سے کی آئینی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجنی ہو گئی
اور اقتدار قانونوں میں ہوئے لگے۔ ملکہ کی تمام چوبہائی نمائندگی اپنے سماری خدا کی طرح کرے
رہ کر جمع تفریق اور بدخواہوں کو رام کرنے میں صرف ہو گئی۔ باقی ماندہ جہاں سے کام
لیے ہوئے ملکہ نے اپنے بچوں کی شاہی تعلیم و تربیت اور حفاظت کا بندوبست کیا سپاہ
قرطبیا کو نئی وردی دی کر دفعہ برساتی، چھتری اور جاڑے کے لیے جوتی دی کہ دیا سپہ
سالاروں کو غیرملکی شب کی تاحیات استعمال کی اجازت دی شہوت اور چھوٹی مونچیں کے
باعث لگتی۔ ملکہ کے سرہانے باغ کی مالک کو ملکت فاخرہ کے ساتھ باغبانی الملک کا خطاب
عطا ہوئے لگا۔ کاجل اور اجارہ داری کی روزی حال ملکت حکومت نے اپنی سرپرستی میں لے
لی۔ عوام کے لیے پہلی بار لہلہاتے پانی کی سبیلیں اور مفت جڑی تقسیم کرنے کے مراکز قائم
کیے گئے۔ مگر افسوس اس سنہری دور کو اپنی ہی کی نظر کھا گئی۔ ملکہ کو کھیل کود کا
شوق بھی تھا۔ کبوکبھو اور کل کل کلتا نامی کھیل ملکہ ہی کے دور میں پہلی بار منظرِ عام پر
آئے اور عوام نے ان میں خوب دلچسپی لی۔ لیکن عوام کو یوں بغیر فیس کے چوری کھیلتا اور
بستہ کھیلتا دیکھ کر قرطبی سپاہ، عمائدین اور آئندہ اور گزشتہ حکمرانوں کے سینے پر
اُبھری سانپ لوٹتے رہتے اور وہ دانت پیس پیس کر رہ جاتے۔ ملکۂ قرطبیا نے بیروں دوپہرہ
بھی کیے، مگر وفادار شوہر سائے کی طرح ساتھ رہا اور کبھی پیچھا نہ چھوڑا۔ جہاں ملکہ

Scanned with CamScanner

جاتی یہ وفا کہ پتلا حسب معمول پہلے ہی سے وہاں پہنچ جاتا کہ غریب بیچارہ بھرکم اور لیسٹر
تعلقات اگین کیسے ادا کی۔ یہ معصوم شکل شوہر سرکاری ملازمت پر معمور کرنے کی
قبلی لائق نہ تھا اور کثر جدیر کام اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ قرطبی رسم و رواج کے مطابق
میاں بیوی میں اس طرح محبت اور وفاداری نقلیدوبحسین کی حق دار تھی مگر بدنصیبی
کے باعث اس کی ایک لڑ ہوا اور لوگ بہت پہچانے اور سامنے باتیں بنانے لگے۔ قرطبی ملک
کی شوہر ملک کی پہچان بچپن پہرہ تھا اور بدصورت شوہر نے جہاں وہ جانا یہ سازشی
عناصر اس سے پہلے موجود ہوتے جو چیزیں سے پسند جانیں یہ غریبی سے کم قیمت لیتے
پر اس کے ہاتھ فروخت کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد اس کی جیبیں خالی ہو گئیں۔ وہ
بیچارہ ملک کے خزانے سے (اپنا منصب کی سرکاری رقوم نکالنے لگا اور کبھی کبھی تو یہ
خوشحال، خود سرکاری گھر کی حالت اور لیسی چیزیں گروی رکھ کے اپنا کام چلاتا۔ آخر کب
تک اس طرح گزارہ ہوتا ملک بیچاری خود بدصورت سازشی تھا۔ اور مملکت اور سرکاری
شوہر کی حرکتوں سے یکسر شک تھی مگر چاہتی تھی کہ اپنی کی رو سے ساری بات ہو جو
یہ ذمہ داری کسی اور کو سونپ کر آرام سے بیٹھ جائیں اسی بدنامی عرصے ہوتے گزرے۔ لیکن
دکھ کی تصویر سازشی عناصر نے منال پورا ہونے کا بھی انتظار نہ کیا جیسے ہی خزانے کے
اندر رہ جانے اور سرکاری مال و اسباب کے رہن رکھے جانے کی اطلاعات مع ثبوت مہیا ہوا،
تو اس سلطنت اور شہری لوگوں نے ملک کو مع اس کے سامنے شوہر اور چار چھوٹے بڑے بچوں
کے ساتھ دھکے اور شور شرابے کے بعد ذلیل کر کے محل سے باہر نکال دیا اور ملک کی
حدود سے باہر نکلوا دیا۔ اس غیرانسانی حرکت پر دیکھنے والوں اور غریب خاص شوہر نے
خوب واویلا کیا اور ہاتھ پاؤں چلائے مگر کسی نے اس کی داد فریاد پر کان نہ دھرے۔
بے یار و مددگار ملک روتی پیٹتی قرطبہ سے اپنے کنبے سمیت جنگل بیاباں کی طرف نکل گئی۔
جب ادر یہ بادشاہوں کی دھوپ چھپی اور لوگ اس کی اور اس کے بچوں کی شکل
بھول بیٹھے تب وہ ایک رات وہ جسم جلی ایسے معصوم بچوں اور اس شوہر کے ساتھ اپنی
متروک حالت پر بے بسی شہر میں لوٹ آئی اور پھر جیتا سوت کی ایک سے
عزم کے ساتھ گھر گرہستی کے جھمیلوں میں غرق ہو گئی۔

ہزار سالہ دور کے آخری برسوں میں سرکاری خزانے اور سرکاری مال و اسباب کو اپ
منصب کے مسلسل استعمال کی روایت اور اکلوتی قرطبی ملک کی بزدلانہ اور ذاتی
کوششوں نے سلطنت قرطبہ کو بالآخر کمزور کر کے محتاج سی بالکل تیکھی دکھائی کر
دیا۔ اقتصادی اور دینی طور پر نااہل حکمرانوں کے ساتھ خالی پیٹ عوام کب تک گزارا
کرتے، تنگ آ گئے اور رفتہ رفتہ تمام قرطبی مختلف ملکوں کو ہجرت کر گئے۔ عوام کے
اچانک چلے جانے سے سپاہ قرطبیہ بھی خالی جیب ہو گئی اور سپاہی بددل رہنے لگے۔ آخر
وہ بھی کچھ عرصے بعد دوسرے ممالک جا کر دیگر سپاہ میں جبری ملازم ہو گئے۔

قرطبی عوام اور افواج کے یوں بتدریج چلے جانے سے قرطبی سپہ سالار اور حکمران
ہی پیچھے رہ گئے اور چپ چاپ رہنے لگے۔ بیچارے بیٹھے بیٹھے آسمان کو تکتے رہتے ایک
دوسرے کو گھورتے رہتے یا اپنی جمع پونجی کا حساب کتاب کرتے رہتے۔ لاحاصل تشبیہ کے
بعد وہ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ فوج اور عوام کے بغیر زیادہ عرصے تک گزارا ہونا مشکل
ہے ایک دن یہ "کاس پتلی" حکمران اور "جہاز پھرے" سپہ سالار (بحوالہ ملک کے انتہائی
کوششوں) پسے ہوئے سوؤں کو لے کر ان ملکوں کی طرف نکل گئے جہاں قرطبی عوام اور
سپاہی فوجی خدمت میں بھی ابھی پہنچ سکے تھے۔ قرطبیہ ایک عرصے تک خالی پڑا رہا اور
وہاں خوب جھاڑ جھنکاڑ اگ آیا۔ پھر نہیں معلوم کیا ہوا۔ اسے زمین نگل گئی یا آسمان نگل
گیا۔ کچھ پتا نہ چل سکا بیچارے قرطبیہ کا۔ تاریخ کے اس موڑ پر آ کر قرطبی تاریخ
منصف ناصرین اور سینکڑوں قرطبیک (حوری بدبختی) بھی دفعتاً خاموش ہو جاتے
ہیں

Scanned with CamScanner

انتخاب

گریگور فان ریزوری

گریگور فان ریزوری
Gregor von Rezzori

گریگور فان ریزوری ۱۹۱۴ میں بوکووینا میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ویانا یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ ان کی زندگی کا کچھ حصہ بخارسٹ (رومانیہ) میں بسر کیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد کے جرمنی میں انھوں نے اپنے ریڈیو اور فلم کے میدانوں میں عملی سرگرمیاں شروع کیں۔ ان کی پہلی کتابوں میں *Tales from Maghrebinia* اور *Oedipus Triumphs at Stalingrad* شامل ہیں۔ ان کی ایک اور ناول کا انگریزی ترجمہ ۱۹۹۰ میں *The Hussar* کے نام سے شائع ہوا۔ لیکن انگریزی پڑھنے والوں میں ان کی مقبولیت کا آغاز ۱۹۸۱ میں Memoirs of an Anti-Semite نامی کہانی کی "نیویارکر" میں اشاعت سے ہوا۔ یہ ان پانچ کہانیوں میں سے ایک ہے جو مل کر اسی نام کے ایک مختصر ناول کی تشکیل کرتی ہیں، اور جن میں ایک کہانی Skushno کا ترجمہ آپ آئندہ صفحات پر ملاحظہ کریں گے۔

پانچ کہانیوں سے مل کر بننے والا یہ ناول نہ صرف ایک انسان کی زندگی کی داستان بیان کرتا ہے بلکہ وسطی یورپ کے ساٹھ سالہ سفر کا روحانی سفرنامہ بھی ہے۔ تاریخی منظرنامے سے قطع نظر ان کہانیوں کو انسان کی اجتماعی حماقتوں کی روداد کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے، جو وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہیں اور جن کے خدوخال ہمیں اپنے آس پاس بھی نظر آ سکتے ہیں۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ ناول تکنیک کی ایک جرأت مندانہ اور پرمسرت تجربے کے طور پر قابلِ قدر ہے۔

فان ریزوری کی تازہ تصنیف ان کا ناول *Death of My Brother Abel* ہے جس کا انگریزی ترجمہ کچھ عرصہ پہلے شائع ہوا ہے۔

Scanned with CamScanner

گریگور فان ریزوری

انگریزی سے ترجمہ: فہمیدہ ریاض

اسکشنو

اسکشنو روسی زبان کا ایک ایسا لفظ ہے جس کا ترجمہ کرنا مشکل ہے۔ اس کا مطلب صرف خشک و بےرس بوریت نہیں۔ اسکشنو کو ایک ایسی غیرواضح مگر شدید آرزو کی سی کیفیت کا نام ہے جو ایک اندرونی روحانی خلا کی مانند آپ کے سارے وجود کو چوس کر رکھ دے۔ تیرہ سال کی عمر میں، جو بقول ماہرین تعلیم ایک بےڈھب عمر ہوتی ہے، میں اپنے والدین کے لیے درد سر بن گیا تھا۔ ہم لوگ بُوکووینا میں رہتے تھے جو اب جنوب مشرقی یوروپ کا ایک دور افتادہ صوبہ ہے [illegible] سے بھی بڑے معتوب ہوتا ہے۔ میری کہانی ایسی وحشت اور عدم دلچسپی کے لحاظ سے اسی قدر دور محسوس ہوتی ہے، جیسے وہ سب کچھ میں نے کسی خواب میں دیکھا ہو۔ حالانکہ اس کا آغاز بالکل عام انداز سے ہوا تھا۔

جس واقعے نے میرے والدین کو شدید تردد سے دوچار کر دیا تھا وہ یہ تھا کہ نالائق طالب کو نااہل قرار دینے کی مجاز تعلیمی مشاورتی بورڈ نے مجھے شاہی مملکت رومانیا کے مدرسے جات سے خارج کر دیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد آسٹرو ہنگیرین سلطنت کے خاتمے پر ہم لوگوں نے اپنے آپ کو شاہی مملکت رومانیا کا شہری پایا تھا۔ میرے والدین بہرحال آسٹریا ہی کو اپنا روحانی وطن گمان کرتے تھے، مگر اسٹیریا کے بورڈنگ اسکول کی سخت پابندیوں کے ذریعے میری شخصیت کی [illegible] کو کسی [illegible] اسی قدر اندوہناک نتیجے سے دوچار ہوتی تھیں، اور وہاں سے میں بے رسوا ہو کر [illegible] علیحدہ ہونے کا باعث ہو کر [illegible] کلنک سے بال بال بچ سکا تھا کہ مجھے مستقبل میں علم تعلیم کے لیے باقاعدہ نااہل قرار دے دیا جاتا۔ پرورش نوجوانان کے ماہرین کو میرے وجود میں امید کی ہلکی سی رمق بھی نظر نہیں آتی تھی۔ رہے میرے والدین تو وہ اس حقیقت سے سرتاسر روگردانی کر گئے کہ میرے تضادات خود ان دونوں کے انتہائی خاصے [illegible] اختلافات ہی کے پیدا کردہ ہیں۔ [illegible] وہ مرکب تضادات، جن پر میرا وجود مشتمل تھا، جن میں شدید حساسیت اور پرتشدد رجحانات، بےدردی اور [illegible] کی عدم اہمیت، مشاغل اور مدد کی خواہش اور عدم مطابقت وغیرہ کی خطرناک حد تک ابھری تھی، مستقبل قریب و بعید میں صرف کسی مجرمانہ

نوعیت کی فرد ہی کی صورت میں ظاہر ہو سکتے تھے۔

میری مسلسل کی لیاقتوں میں سے ایک یہ بھی تھی (جو دراصل ولیم بوش کی تصنیف "میکس اینڈ مورٹز" [illegible]) کہ "بدنام ہو جاؤ اور عیش کی گزارو"۔ تاہم میری حد تک تو اس کہاوت کی حیثیت اتنی ہی تھی کہ اک بسا آرزو۔ مجھ سے کوئی میری کیفیت پوچھتا تو میں سرد آہ کھینچ کر کہتا "اسکشنو"۔ کبھی کبھار بغاوت کا خیال ذہن میں ضرور ابھرتا لیکن زیادہ تر کچھوے کی سی سست رفتاری سے رینگتی اس دور میں میں گھستی ہوئی زندگی گزار رہا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ میرے ہیجان وجود کو شب و روز خود کھسوٹ رہے تھے۔ ایک مسلسل جرم میرا جانی سے چھپ رہنا جس سے مجھے کسی صورت نجات نصیب نہ ہوتی۔ یہ احساس جرم مجھ پر دوسروں نے لادا ہی نہیں تھوپ دیا تھا۔ اس کی کھری وجوہات نہیں جن کا میں اس وقت تجزیہ نہیں کر پاتا تھا کہ شاید زندگی کچھ آسان ہو جاتی۔

دور دراز ماضی کی اس دھند میں مجھے ایک تصویر نظر آتی ہے، اس دور کی سب سے پیچیدہ [illegible] والی کسی اولین کیمرے سے اتاری ہوئی تصویر جس میں [illegible] محسوس ہوتی نہیں [illegible] بڑے بڑے لیمپ ان کی چست [illegible] سیاہ چمڑے کی [illegible] کو چمک [illegible] کی طرح کھینچا جاتا تھا۔ [illegible] اس دور کی جرمن سوچ کی روح مظہر آتی تھی، وہ "رانٹ لیسٹ (ذوق حس)" جو اس دور میں بسی ہوئی اولین موٹرکاریوں کے [illegible] اور [illegible] میں منعکس ہوتا تھا اور جو میرے بڑکپن کی تخیل کو مہمیز دیتا تھا، جبکہ زندگی ابھی کمزوری اور بگھیوں کی رسائی سے بہت دور نہیں نکلی تھی۔ میرے ہم جماعت لڑکوں کو کرسمس کے موقعے پر یا ان کی سالگرہوں پر یہ تصویر اتارنے والے آلات تحفتاً ملتے تو میں رشک سے بےچین ہو جاتا۔ حالانکہ جو تصویریں وہ اتارتے تھے اور کبھی کبھار مجھے بھی دیتے تھے، انہیں میں خاطر میں نہ لاتا تھا۔ مدرسہ چھوڑنے کے ساتھ بہرحال ان ہم جماعتوں کا ساتھ بھی چھوٹ چکا تھا۔

اس تصویر میں مجھے ایک لڑکی کا مدور، سرکش چہرہ دکھائی دیتا ہے جس کا پامال بچپن جلد ہی ہلاک کر دیا جانے والا ہو۔ اس چہرے پر ایک بیزار اور افسردہ عزم ہے جس کا مرکز اس کی اپنی ذات کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لحاظ سے یہ کچھ قابل رحم اور کچھ حماقت میں مستور ہے، لیکن اس سے یہ غلط اندازہ نہیں لگانا چاہیے کہ اظہار بلوغت کی ابتلا درحقیقت محض خیالی تھی۔ ایسا نہ تھا۔ وہ ابتلا ایک سنگین حقیقت تھی اور اس لحاظ سے اور بھی سنگین تھی کہ اس شدید اذیت کا کسی دوسری طرح اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ایک بہرالود دن کی تصویر ہے۔ میں ایک کٹے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھا ہوں، اور میں نے کلف دار پاجامے سے بچنے والی اس کا ڈھیلا کرتے پہن رکھا ہے جس کو توجہ پیش سے باندھ

رکھا ہے اور جس میں کشادہ جیبیں ہیں۔ اس طرح کا کوٹ ۱۹۶۰ کے اواخر میں انتہاپسند [illegible] کسی قسم کے فلسفے میں میرا دور کا بھی واسطہ نہ تھا یہ جیکٹ تو میں بس یوں ہی جرموونج کے نیلی نواح میں تنہا، بلامقصد آوارہ گردی کرتے ہوئے پہن لیا کرتا تھا۔ خصوصاً موسموں میں یہ دیہات بیکراں افق کے سجیلے نرم ہموار سبزے میں ڈھکی ایک لامتناہی [illegible] جانے والی اس غلطاں خطے پر دور، برف کی دھاریوں سے بھرے جو اس علاقے کی مشینوں کی منتشر سی کرتی تھیں، سیاہ جنگلوں کی لکیر کوہساروں تک کشیدہ نظر آتی۔ ان اداس بوجھل شاموں میں، آسمان کے گنبد کی دودھ کے گلاس جیسی ٹکر سی جھت پٹے کی مدھم روشنی بمشکل دکھاتی ہوئی۔ ان شاموں میری روح کا اندرونی منظر واضح طور پر کسی ایسے ہی دن جیسا تھا، اور یہی تھا اسکیچ

اس تصویر میں میں ٹنگے سر بیٹھا ہوں، جو اس میرے ماضی کو منتشر کر دیا ہے۔ میرے قدموں میں میرا سیل مچھلی کی طرح چکنا، بھسوں دمش باؤنڈ میتھو پرستی بھری نگاہوں سے [illegible] دوست ہے، یار، غمخوار، جو چاہیں کہہ لیں۔ غالباً ہر بات پر مجھ سے متفق نہیں ہوتا لیکن میرے لیے اس کی محبت غیرمشروط ہے اور میرے ہر عمل پر اس کی پسندیدگی میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ نہیں۔

ایسی کوئی تصویر، جہاں میں واضح کر دوں، حقیقت میں وجود نہیں رکھتی۔ میں اس قدر سہانی پسند تھا کہ یہ تصویر کوئی کھینچ ہی نہیں سکتا تھا [illegible] میں نے ذکر کیا وہ تو اب مجھ سے علیحدہ کر دی جانے والی ماضی کا حصہ بن گئی تھی۔ میکس اور میں جرموونج کے نواحی دیہات میں کسی آوارہ گرد جوڑے کی مانند والے پھرتے۔ اخلاقی لحاظ سے بھی تھوڑی سی آوارگی ہمارا شعار تھا۔ ہم دونوں کے درمیان اس بات پر [illegible] چلے جانے کی جرأت کرے، شکار کے لیے بھی مناسب ہے۔ سی طرح جرمن ہوٹل رہتی کی منزلوں میں چوہوں کے پیچھے دوڑتی بلّی پر بھی حملہ کیا جا سکتا ہے۔ بلیوں سے میری شدید دشمنی تھی۔ کیونکہ جس بات کا مجھے بہت قلق تھا، میکس دوسرے قابلِ ستائش اوصاف کے باوجود، خونخوار کتا نہیں تھا۔ وہ ایسے شکار پر دیوانہ وار حملہ تو کرتا لیکن شکار مقابلے پر [illegible] دوڑ پڑتا اور میری ایڑیوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتا ہو کمال معصومیت سے چہاوں

جاوں کرنے لگتا۔ میں خود کو یہ سوچ کر تسلی دے لیتا تھا کہ غالباً وہ ابھی پورے سن کو پہنچا [illegible] اور اس سے میری توقعات غیرحقیقی ہیں۔ ویسے میرے "غیرسیاسی کوٹ" کی جیب میں ہمیشہ ایک غلیل اور سیسے کی [illegible] ہوا کرتی تھی۔ میرا نشانہ عملی میں تماشا دکھاتے [illegible] مشاقیوں کی طرح سمجھا تھا۔ گیا ہی مشغلے کا بلاؤز ہو، جب اس کی کھوپڑی میں پیش کی ڈالی کے برابر سیسے کی کنکری لگا کر تو چکرا کر گر جاتا۔ میکس کو [illegible] رہی۔

[illegible] زندگی میں [illegible] میں اپنی دونوں کی دشمنی کو میں فطرت کا قانون سمجھتا تھا، اور کتوں سے محبت کرنے کا خاندانی [illegible] کہ بچپن سے میں ایک ایسے شخص کا بیٹا تھا جس کی زندگی کا مرکزی نقطہ ہی شکار تھا۔ شکار کی جان نکالنے میرے بورڈنگ اسکول کی [illegible] شکارگاہوں میں [illegible] ایک [illegible] کی تربیت کھیل میں شرافت کے سخت ترین اصولوں کے مطابق ہوئی تھی۔ مرغ [illegible] ایک پر بیت لطف محسوس کرتا۔ شکار کے اصولوں کی خلاف ورزی کر کے [illegible] باپ کے نام میں بٹا لگاتا تھا۔ [illegible] احساس دلانے کے [illegible] شکار پر جانے کی اجازت [illegible] گرمیوں اور بہار میں موسمی گرفتوں کے [illegible] شامل رہا تھا۔ یہ شکاری مہمات ہوتی تھیں جن کی ہر موسم کی اپنی خصوصیت تھی۔ ایسٹرنائیڈ پر جنگلی [illegible] شکاری مہم کے اہم ترین حصے میں ساتھ لے جایا جانے لگا تھا۔ گرمیوں میں [illegible] جنگلی سؤر کے شکار کا، اس تاریخ کے عروج [illegible] جرموونج پہنچ سکتا تھا جہاں [illegible] کی یاد میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی۔ [illegible] شکار کے موقعے پر جنگل کے [illegible] کسی طرح جنگل [illegible] جنگل کیسے [illegible] جنگلی بکروں کی [illegible] ہر طرف [illegible] کی [illegible] ممنوع تھے۔ [illegible] بھی ابھی نم ہوتی، چشمے کی

Scanned with CamScanner

[illegible] کے مرحلوں میں [illegible] اور [illegible] پر کیا جا سکتا کہ بہار میں
[illegible] سے [illegible] کی [illegible] ہی [illegible] نرم [illegible] ہو [illegible] میں
اندازہ لگا سکتا تھا کہ آسمان پھر نیلا پڑ جائے گا، اور بہار کے بادل اس پر [illegible]
[illegible] دل [illegible] ہر جگہ کوئی کوئی کی [illegible] میں [illegible] نرم [illegible]
سے [illegible] کہ یہ ہماری زنجیر صرف نصابی [illegible] کہ میں اچھا لڑکا نہیں ہوا ایسے
ساتھ میں نصاب کی کتابیں بھی [illegible] کے [illegible] سے [illegible] ہماری [illegible] کی گولیوں کی طرح
[illegible] ہوتا تھا۔ [illegible] نصاب تھا [illegible] کا [illegible] میرے کانوں [illegible]
وہی یکساں واقعی [illegible] جاتی تھی کہ اگر میں حران میں ہونے والے امتحان میں کامیاب ہو
گیا تو میری گزشتہ کوتاہی کو معاف کر دیا جائے گا اور یہ کہ [illegible] میں میرے امکانات
کی بحالی کا [illegible] موقع [illegible]
گا کہ مجھے تعلیم کے لیے [illegible] بھیج دیا جائے گا۔ میں گھر سے [illegible] دیہات سے
شکار سے اور اپنی شکارگاہ [illegible] سے جدا کر دیا جاؤں گا اس کے باوجود میں [illegible]
عزم کر چکا تھا کہ امتحان میں ہر حال میں کامیابی حاصل کرنی ہے خواہ اس کے لیے کچھ
بھی کرنا پڑے۔

"کچھ بھی کرنا پڑے گا" لیکن افسوس، آخر [illegible] کیا کر سکتا ہے؟ مطالعے کے لیے
کمرے میں بیٹھے ہوئے میں [illegible] بہار کی [illegible] سن سکتا تھا جو [illegible]
شیشے کی طرح شفاف برف میں [illegible] میں کھلی [illegible] سرمئی
آسمان کی ریشم میں [illegible] سی [illegible] میں سرسراتی، مجھے غروب آفتاب پر کونپل کی
بو [illegible] دیتی۔ [illegible]
جھاڑیوں میں [illegible] کی [illegible] میرے کانوں سے
ٹکراتی۔ [illegible] اور [illegible] جو جنگل میں [illegible] شکاری کو چونکا دیتی
تھیں۔ میں نصاب کی کتابوں کے سامنے بیٹھا رہتا اور ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہ آتا۔
سادہ ترین عبارت میرے سر پر سے صاف گزر جاتی۔ شکاری مہمات کے [illegible] کے طور پر
میں نے اپنی پیاسی تخیل کو سارے اشتیاق اور [illegible] سے شکار کے موضوع پر ادب کا
مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی بغیر کسی شعوری کوشش کے میں نے فرانسیسی میں
[illegible] کی طبع [illegible] میری [illegible]
بلکہ یہ سمجھا گیا کہ میں کندذہنی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض بددیانتی کے باعث نصابی
کتابیں پڑھنے کا فرض ادا نہیں کرتا۔ اس بات نے مجھ [illegible] کہ میں نے قدیم
فرانسیسی عبارتوں کو سمجھ کر مطلب نکالنے کا کام ترک کر دیا۔ پھر میں کچھ بھی نہیں
کرتا تھا۔ [illegible] کبھی ہوا میں [illegible] میرے [illegible] میں [illegible]
[illegible] اصل صورت حال سے [illegible] اور اس قسم کی [illegible] تقریباً کتابی

[illegible] کی جنگ کا [illegible] و انجام اور دیگر تفصیلات کس قسم کی ہوتی ہیں۔ اس بات کو
[illegible] اس سلسلے میں مزید کچھ بتانا غیرضروری ہے۔ [illegible] اس
صورت [illegible] کچھ [illegible] اور [illegible]
[illegible] میرے بارے میں [illegible] کو [illegible] طور پر [illegible]
کر دیا۔ [illegible] کی پیش کش کر

[illegible] اور [illegible] کر دیا گیا تھا۔ [illegible]
میرے والدین کے [illegible] کچھ اور بھی [illegible] صاحب حیثیت تھے اور ہم لوگوں سے
[illegible] دیہات میں رہتے تھے۔ [illegible]
مشرقی یوروپ کے [illegible] چند جاگیروں کے
[illegible] حالانکہ یہ بات بھی اہم ہے کہ اس وسیع وعریض
[illegible] تہذیب میں [illegible] فرق قابل
[illegible] بہت گہری تھیں۔ یہاں کے چھوٹے سے
چھوٹے گاؤں [illegible] مشرق اور مغرب کی [illegible]
[illegible] اس قسم کی [illegible]
[illegible]
[illegible] ساتھ [illegible] کی اور [illegible]
[illegible] میں [illegible]
[illegible] مشرقی یوروپ کے [illegible]
[illegible] کسی [illegible] کی [illegible]

میرے [illegible] اور [illegible] دوسرے
[illegible] یوروپ کی [illegible]
[illegible] مختلف تہذیبوں کی [illegible]
[illegible] خصوصاً رات کے وقت اس
[illegible] ایک
[illegible] ہوشیار [illegible]
[illegible] باقی [illegible]
[illegible] وسیع [illegible] تاریکی کی [illegible] انسانی
وجود کی [illegible]
[illegible] کی [illegible] اور تکلیف دہ اور

جب کسی کی روح میں اسکاٹش سمایا ہوا ہو تو یہ منظر دل شکنی حد تک خوبصورت دکھائی دے سکتا تھا۔

ان کے اوقات میں یہ قصباتی شہر اس قسم کی شہریت سے زیادہ تر محروم رہتا۔ قصبے میں ایک گوارا سی صدر عمارت تھی، اور چند اڑے ترچھے راستے جو چلنے والوں کے قدموں سے زمین کی چکنی مٹی پر بن گئے تھے اور جن کے دو طرفہ سادہ مکانات کھڑے تھے۔ ان میں چند ایک گھروں میں ماجیجے بھی تھے کہ کمروں میں ہوتے ہیں [illegible] جیسے تھے [illegible] دیواریں دھات کی چادروں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ادھر ادھر گڑھوں کے کناروں پر گوبھی اور آلوؤں کی کیاریوں کی ترتیب [illegible] کی [illegible] سے [illegible] چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی کیاریوں اور اسطبلوں کی [illegible] کیچڑوں میں ایک دوسرے کٹتے جاتے پہیوں کے نشان کھینچی جانے والی گاڑیوں کے پہیوں کے ستانات موسم کی مطابقت سے دھول یا کیچڑ میں گہرے کھڑے [illegible] ایک دوسرے سے جا ملتے تھے وہاں مرکزی شاہراہ پر ٹاؤن ہال کی عمارت شہ بلوط کے درختوں کے جھنڈ میں کھڑی تھی، جس کے سامنے والی دیوار پہلی سیڑھی سے لے کر چھت کے پرنالوں تک اشتہاروں اور اعلانات سے ڈھکی ہوتی تھی [illegible] عمارتوں کا مماثلہ نمونہ تھا۔ اس کی نوک دار برجیوں پر ایک چپٹا سا ستارہ تھا جس کی روشنی دان سے قومی تعطیلات کے موقعوں پر ایک جھنڈا لٹکا دیا جاتا تھا۔ پاس ہی [illegible] کی زمین پر اتھلی بجری بچھی تھی، چوراہے پر گاہکوں کی منتظر لبی دکانیں انگھ میجولی سی کرتی دکھائی پڑتیں۔ بازار لگنے کے دنوں میں تندور اور اس سے ملحق چھوٹا سا کلال خانہ کسانوں سے کھچاکھچ بھر جاتا جو گاڑیوں میں بھر بھر کر دیہاتوں سے سور، بچھڑے، مرغیاں اور سبزیاں فروخت کے لیے لاتے تھے۔ سڑک کی چوکوروں سے ذرا سے فاصلے پر سرخ چھتے کی ایک صاف دواساز کی دکان کی مثال دیا کرتی۔

قصبے کی مرکزی شاہراہ کے اختتام پر جہاں اس کا مختصر پس منظر کھلی میدانوں میں کھو مل جاتا تھا باڑھوں سے گھرا زمین کا ایک ٹکڑا تھا، جہاں برسوں سے رکھ کر فراموش کی ہوئی چوبی صندوقچہ سا لوکریوں میں فرجیوں آوارہ بلیاں سوتی رہتی تھیں۔ اس کے عقب میں سرخ اینٹوں سے بڑی نزاکت کے ساتھ جوڑی ہوئی ایک نہایت دلچسپ عمارت نظر آسکتی تھی جو کہ دیواروں، برجیوں اور کنگروں، چھجوں اور طاقچوں سے مزین۔ اس کی چھت دھات کی چادر کی تھی جسے ایسے سجایا گیا تھا گویا کسی میکے کو نوک دار پتی والے پھول کی شکل میں تہہ کر کے رکھ دیا گیا ہو۔ ہر سمت کی سوت پر اژدہوں کے سروں والے گارگوائل (قدیم چرچوں پر بنائے جانے والے عفریت اور بھوت پریتوں کی شبیہیں) کندہ تھے۔ چھت چھوٹے چھوٹے متعدد مرغی بادنما اور دوسرے پتلوں سے سجی تھی۔ یہ ڈاکٹر گرنڈیس کا "ولا" تھا، اور ۱۸۶۰ کی تک بھگ مروج تعمیراتی

رومانیت کا ایک دلچسپ نمونہ تھا۔ اسی گھر پہلی بار اس والی مہمانوں کو چچا پیوبرٹ اور چچی سولی اس عمارت کا دیدار بطور کسی عجوبے کے کراتے تھے۔ قصبے میں ایک اوسط سی کیتھولک کلیسا کی عمارت تھی جو بچوں کے کھلونوں کے ڈبے کی طرح سادہ تھی۔ یہودیوں کا ایک گنبددار معبد تھا۔ ان کے علاوہ قصبے میں واحد قابل دید عمارت اورتھوڈوکس چرچ کی تھی جس کے مینار پر پیاز کی ساخت کا سبز گنبد تھا اور جو صنوبروں کے جھنڈ میں واقع تھی۔ قصبے میں یہ سب عمارتیں ایک دوسرے سے بے خبر تقریباً بیشتری سے ایک دوسرے کی سمت سے منہ موڑے کھڑی تھیں اور ان سب پر تنا ہوا آسمانی نقشہ ان کی آنکھیں خوابیدہ سی مشرق میں کوٹھری اسیروں، اور اس سے بھی پرے تبت تک کشیدہ تھا۔ عام دنوں میں یہ جگہ بالکل ویران رہتی تھی۔ صرف جھوٹی پیرے بیہودہ بچوں کی چند ٹولیاں غبار آلودہ سڑکوں پر چڑیوں کے پیچھے مارے مارے پھرتیں۔

موسم گرما میں سورج اس جنس سے پھٹوں کو جلاتا اور ہر شب میں تنہائی ہوتی دھند لاہٹ چھائی رہتی۔ سردیوں میں ان دنوں میں کاشتوں کی طرح چمکنے والا پالا اس کساب کو پہ سپید چمڑی گرفت میں لے لیتا۔ برف کی قلمیں گھروں کی چھوٹی چھوٹی دریچوں پر سلاخوں کی صورت جمی رہتیں اور ساحلی مرغزاروں کے درخت بلور میں ڈھلے نظر آتے۔ کبھی کبھی اس سادہ ورق پر اچانک کوئی رنگ برنگی تصویر ابھر آتی، مثلاً کسی یہودی کا جنازہ جاتا ہوا دکھائی دیتا اور جیوں کی تاریک پھبتیوں کی مانند سیاہ جوغوں میں ملبوس یہودی لوگ کی سرخ سمور کی ٹوپیاں اوڑھے اپنے ہم مذہبوں کے لیے مخصوص قبرستان میں جنہیں کہ صنوبر کے درختوں کے پیچھے قبروں کی ترچھی ڈھلی ہوئی کتبوں کی درمیں مسمار ہو جاتے ان میں بعض شکستہ کھڑے ہوتے اور ایسی شبیہی ہوائی ہوتی اور میں ہونے جیسے ابھی [illegible] گرنے والے ہوں ان کے بالوں کی لمبی پلیٹیں ہوتیں [illegible] کی گھنی داڑھیاں جن کی سلکیں بھی پہنی ہوتیں۔ جب وہ سر کو پیچھے کی جانب خم کر کے گفتگو کرتے تو ٹوپیوں کا سرخ سطح رنگ سمور ان کے چہروں کے گرد حاشیہ سا بنا دیتا۔ تومدیں انگو کو نکالیں وہ اونچی اونچی آوازوں میں گفتگو کرتے۔ یا کبھی اورتھوڈوکس خانقاہ میں چاندی کے ابھرواں نقش و نگار والے تابوت میں ابدی نیند سوئے سینٹ کی برسی کے موقعے پر عمارت کا احاطہ شوخ کشیدہ کاری سے مزین بلاؤز، بھیڑ کی کھال کی صدریاں اور ڈوری دار جوتے پہنے کسان مردوں اور عورتوں سے بھر جاتا، گلنار کے پھول ان کسانوں کے کانوں کے پیچھے اڑسے ہوتے یا ان کے سپید ڈاسروں میں دبے رہتے۔ راہبوں کی درود کی سی جلی دھنیں، اور مرد نیک بیویوں کے سینے میں سانس کی بلند آواز میں شمود کی تلاوت وقفے وقفے سے سنائی دیتی۔

چچا ہیوبرٹ اور چچی سولی کا گھر قصبے کی کنارے کسی سرائے جاگیردارانہ اقامت گاہ کی طرح ایستادہ تھا۔ اس کا اندرونی دروازہ تو مقفل ہو سکتا تھا مگر صدر دروازے کا بھاری

ہوئیں کھڑے ہوئے ہوں سے سامنے [illegible] اور اس کے بعد [illegible] ہوئے تھے بعد بوڑھے درختوں کی جھاڑی میں گاڑیوں کے لیے کشادہ راستہ ہمیشہ ہر اس جانے والے کے لیے کھلا رہتا [illegible]۔ رہائش گاہ کی عمارت کو ایک وسیع صحن اصطبلوں، گوداموں، کھیتی باڑی سے متعلق کمروں اور کوٹھریوں سے، اور ایک چھوٹی سی شراب کشید کرنے والی بھٹی سے جدا کرتا تھا۔ عمارت کی پشت پر درختوں کے جھنڈ دور تک پھیلے ہوئے [illegible] میں چھائی رہتی۔ اس سے پرے یہ مرغزار بتدریج دیہات کی کھلی میدانوں میں مدغم ہو جاتا تھا۔

میں اس جاگیر سے بچپن سے آشنا تھا۔ یہاں میں بالکل اسی طرح آرام سے رہتا جس طرح خود اپنے گھر میں۔ یہ کاریپیب کی شکارگاہوں کے جنگلوں میں (جہاں اب مجھے اپنے باپ کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں تھی) اجنبیت محسوس نہ کرتا تھا۔ اس سے قبل کئی بار میں اپنے والدین کے ساتھ یہاں مہمان رہ چکا تھا۔ اس زمانے میں میرا قیام اتنا مختصر ہوتا تھا کہ میرے میزبان غالباً صرف اس سے لطف اندوز ہی ہو سکتے تھے۔ میرے یہ رشتہ دار مجھے کافی پسند کرتے تھے۔ جب میری تربیت کی ناکامی کا سوال اٹھا تو انہوں نے نہ صرف میری ناکامی پر تعجب کا اظہار کیا، بلکہ یہ امکان بھی پیش کیا کہ عین ممکن ہے میری نامرادی میں قصور اس فرسودہ طرز تعلیم کا ہو جو اب بالکل [illegible] ہو چکا ہے۔

یہی ظاہر ہے کہ ہماری پیاری چھاتیوں اور نرم گرم بلاؤز اور جیکٹ پہننے والی چچی سوفی میں مجھے اپنی ماں سے زیادہ مادرانہ گرمی نظر آتی۔ میری اپنی ماں کی وضع قطع میں نفاست اور شاعرانہ جذباتی شدت کا ایسا امتزاج تھا کہ انہیں چھونے کا خیال بھی گھبرا دیتا تھا۔ زندگی کے اس اولین دور میں اپنے باپ کی [illegible]، رنجیدہ طبعی اور شکستہ دل روحوں اور شکار کے لیے [illegible] بڑھے ہوئے سودائی پن کے مقابلے میں چچا یوبرٹ کی شخصیت مجھے ایک مخصوص توانائی اور تندرستی کی علامت کے طور پر نظر آتی۔ اس سے ان کی شخصیت بھی میرے لیے اپنے باپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ سکون بخش تھی۔

دوسری طرف یہ بھی سچ تھا کہ چچا یوبرٹ اور چچی سوفی جس مخصوص دنیا میں رہتے تھے وہاں نظم اور ایک جیسی کوئی شے وجود نہیں رکھتی تھی۔ سابقہ سلطنت ہیپسبرگ کی مشرقی سرحدوں پر (جو کبھی سلطنت روم کا حصہ رہ چکی تھی) یہ دورافتادہ بستی ایسے علاقے میں تھی جہاں دو تہذیبیں ایک دوسرے سے ملتی تھیں (یا کبھی نہیں)۔ اس سرزمین کو مغربی تہذیب نے ایک [illegible] کے سوا اور کچھ نہ دیا تھا۔ ایک طرح سے یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے [illegible] مشینوں کی بھی نوآبادی تھی جس نے یہاں کی قدیم ثقافت کو نڈھال کر دیا تھا۔ اس [illegible] عمل کی مداخلت کرنے والی مقامی خصوصیات تھیں، جیسے مشرقی تقدیر پرستی جو یہیں کے احساس میں گندھی ہوتی ہیں، اور ایسی بربادی کی خاموش [illegible]۔ اس پس منظر میں چچا یوبرٹ اور چچی سوفی، جو ایک دوسرے کے ہم زاد نظر آتے، ایک ایسے مخصوص طبقۂ اشرافیہ کی نمائندگی

طرح [illegible] جو [illegible] یا [illegible] میں بھی مل سکتا تھا۔ یہ طبقہ بہتر وسائل سے عاری نہ تھا۔ مثال کے طور پر میرے میزبانوں کی جوڑی۔ یہ دونوں نہ تنگ نظر تھے نہ ان کی تعلیم میں کمی تھی۔ بعض معاملوں میں ان کی روشن خیالی حیران کن تھی، لیکن ان حالات میں محفوظ زندگی [illegible] جس میں ہر فرد کی ذمہ داری واضح تھی اور ہر کام قواعد سے انجام دیا جاتا تھا، ان کے خیالات اور جذبوں کی رہنمائی اور رویے میں ایک ایسی سادگی پیدا کر دی تھی جو کسی کو سادہ لوحی بھی نظر آ سکتی تھی۔ پھر بھی اگر کوئی گہرائی سے دیکھتا تو ان دونوں میں کچھ [illegible] سی گرم جوشی اور مسائل کے ادراک کی [illegible] صلاحیت بھی نظر آ سکتی تھی۔ یہ وہ اوصاف تھے جو زیادہ مہذب معاشروں میں عام طور پر عنقا ہوتے ہیں۔

[illegible] کوئی مجھے پڑھنے کی ہدایت نہیں کرتا تھا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ میں اپنی مرضی سے [illegible] کی عادت کو [illegible] گا۔ مجھے [illegible] کو اپنے ساتھ لانے کی اجازت مل گئی تھی۔ پہلے جب میں اپنے والدین کے ساتھ یہاں آتا تھا تو رہنے کے لیے مجھے چچی سوفی کے کمرے سے ملحق ایک کمرہ دیا جاتا تھا۔ لیکن اس بار میری رہائش کے لیے "ٹاور" کا انتخاب کیا گیا۔

یہ ٹاور [illegible] کا [illegible] تھا [illegible] کشید کرنے کی بھٹی کے [illegible] کے لیے مخصوص [illegible] والے چند کمرے تھے [illegible] اس کے [illegible] میں تنہا تھا جہاں سے [illegible] ڈھلوان سیڑھیوں کے ذریعے [illegible] تک پہنچا جا سکتا تھا۔ موسم سرما [illegible] مشہور شکاری مہمات کے زمانوں میں چچا یوبرٹ کے شکاری ساتھی [illegible] اور کھلاڑی دوستوں کو یہیں ٹھہرایا جاتا تھا جن کی بلانوشی کی داستانیں [illegible] رہی تھیں۔ باقی سال یہ خالی پڑا رہتا۔ [illegible] کے باعث ان کمروں میں گرد اور بند جگہوں کی مخصوص [illegible] رہتی۔ چچا یوبرٹ کے دوستوں کے قیام اور اس جگہ کے بارے میں [illegible] کچھ ایسی باتیں [illegible] صرف اشارتاً ذکر کیا جا سکتا ہو [illegible] اگر [illegible] میں نہیں تو ان واقعات کا ذکر [illegible] چچی سوفی کی [illegible] برداشت کی [illegible] چل سکتا۔

ٹاور مجھے رہنے کے لیے کیا ملا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں راتوں رات بالغ [illegible] ہو گیا۔ یہاں قدم رکھ کر [illegible] مردوں کی صحبت میں وارد ہو گیا تھا۔ وہ [illegible] جو مجھے اپنی ماں اور اتالیقوں کی جانب سے مسلسل ملتی رہی تھی اور جس نے بعد میں بورڈنگ روم کی سخت پابندیوں کی صورت بدل لی تھی، ٹاور کی [illegible]

Scanned with CamScanner

میں یکسر مفقود ہو گئی تھی۔ میرے رونگٹوں میں یہ احساس سرسراتا کہ ان کمروں میں پوری عمروں کے مرد رہے ہیں۔ مرد، بچے یا لڑکے نہیں، پوری عمر کے مرد جو آزادی سے جو چاہیں کرتے ہوں گے، خودمختار ہوں گے اپنی زندگی کے خود مالک ہوں گے۔ انہیں ہتھیاروں کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا، وہ سورما اور جنگ جُو تھے۔ [illegible] درخت تنہا میں اب بھی رہ سکتا تھا اور سانس لے سکتا تھا۔ شکار کے زمانے میں ان کے قیام کا محل [illegible] میں اپنی روح روح میں محسوس [illegible] کمروں میں شکار کی باسی مہک بو موجود ہی تھی۔ باہر کا منظر میرا تخیل خود بدل لیتا۔ موسم سرما کی گہری سرمئی صبحوں میں آتش دان میں چٹختی ہوئی آگ میں الصباح حویلی [illegible] میں شکار کی [illegible] کی جھیل پہل شکاری کتوں کو پھرتے ہوئے [illegible] کے گوشت [illegible] کی شب بکھر مہک گویا [illegible] کرتی [illegible] ایک ایسا دن جس کا اشتیاق سے انتظار کیا جاتا اور [illegible] سے جیسے [illegible] ایک خودفراموشی [illegible] دھڑکتی ہوئی امکانات کا [illegible] ہر لمحہ حیرت انگیز، خون گرماتی ہوئی [illegible] سے مملو لمحات، سرعت سے گزرتے گھنٹوں کی سنسنی، [illegible] پر رنگوں سے مصوری کرتی ہوئی ساعتیں جو سحر کی گلابی [illegible] جیسی صاف ستھری کرنوں کو منظر کو شام کی خوں آشام رنگوں میں ہولے ہولے تبدیل کرتی جاتیں۔ شکار ختم ہو چکا ہے، ہر سانس کے ساتھ پھیپھڑوں میں تازہ، سرد، چبھتی ہوئی ہوا بھر رہی ہے، رگوں میں خون تیزی سے دوڑ رہا ہے۔ شکاری گھر لوٹ رہے ہیں۔ ان کے [illegible] رفتار گھوڑوں کے نتھنے پھڑک رہے ہیں، ہوا سے رخسار تمتما رہے ہیں جب کہ شکاری بھاری اونی کپڑوں میں خوب گرم ہیں۔ اس منظر کو رات آہستہ آہستہ اپنی سیاہ قبا میں ملفوف کرنے والی ہے اور دنیا کو اولین تاریکی سے بھر رہی ہے۔ اس ملگجی روشنی میں لوٹتے شکاریوں کے گراں ڈیل پیکر ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔ گھوڑوں کے جسموں سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ دوڑتے ہوئے وہ اپنی دمیں اٹھاتے ہیں۔ [illegible] کی گلابی [illegible] کی [illegible] سے [illegible] رہی ہے جو دیوار کی [illegible] ہوئی لکڑیوں کے درمیان بھوکے پرندوں کی غذا بن رہی ہے۔ یہ کس قدر مسحورکن پُر اسرار شب تھی! اس میں ستاروں کی جگمگاہٹ تھی۔ خلا کی سی بےکراں وسعت اور [illegible] اور خوشگوار [illegible] سے بھری زندگی۔ "آج [illegible] [illegible] زندگی تمہارے رگ و پے میں بجلی کی طرح دوڑ رہی ہے۔" شکاریوں کی گھر کی جانب پرشور واپسی۔ گھر میں تہواروں کی سی رونق، شکاریوں کے بوٹوں پر جانوروں کے [illegible] تعریفی کلمات، [illegible] کے درمیان [illegible] میں ہلکی [illegible] کی جھنجھناہٹ، گرم پانی [illegible] والی خادمہ کے [illegible] پر بھاری [illegible]، غسل میں بدن کے ہر عضو کی پرسکون ہو جانے کی لذت، صاف تازہ [illegible] کی مسرت [illegible] کے طعام کی [illegible] جوتوں [illegible]

طعام [illegible] قہر گئے ہوئے جانوروں سے منہ تک بھرے ہوئے [illegible] سے لتھڑا ہوا [illegible]، جو چند ساعت قبل تک زندگی سے سرشار [illegible] روشنی اور [illegible] کی روانی جاری کرتی، مقتول جانوروں کی پتھرائی آنکھیں جو شمعوں کی روشنی میں اب بھی پرنور نظر آتیں۔ رات کی سرد ہوا میں ڈوبتی ہوئی شکاری نقاروں کی [illegible] کہانی کے بعد [illegible] مردوں کی مانند، جیسے وہ پھر [illegible] واقعات کو دوبارہ جی رہے ہوں۔ [illegible] گونج دار قہقہے [illegible] میرا انتظار کر رہے ہیں۔ بہت جلد یہ میری زندگی بن جائیں گے میرا وجود بن جائیں گے۔

[illegible] پر میں اور بھی مسرور تھا کہ مردوں کی اس دنیا میں [illegible] تھا جو اس [illegible] کی خبر کرتا تھا کہ مجھے [illegible] "زندگی کیا ہے؟" کے خواب سے نکل کر اب [illegible] زندگی میں داخل ہوتا ہوں جس میں ضروری اور اہم کام کرنے ہوتے ہیں اور [illegible] کو [illegible] کرنا ہوتا ہے جس سے بالغ ہی [illegible] پورا اور سنجیدہ ذمہ داری سے [illegible] کی برعکس مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میری تربیت اور [illegible] کی ابتلا کا [illegible] بالآخر میں آزادی اور خودمختاری اور مسرت اور خوش باشی کے [illegible] کی زندگی تک رسائی حاصل کر چکا ہوں۔ گھر میں جو سازوسامان فالتو یا غیرضروری سمجھا گیا وہ ٹاور میں رکھ دیا گیا تھا۔ ٹاور کا فرنیچر عام استعمال ہونے [illegible] فرنیچر پر کسی ہوئی [illegible] معلوم ہوتا تھا، جو کہ [illegible] والے صوفے اور کرسیاں رنگ برنگ پیوند لگی گدڑی جیسے قالین ہاتھی دانت کی کھونٹیاں جو [illegible] کا کام دیتی [illegible] اور ان پر سگریٹ کے [illegible] کی شکل کا [illegible] [illegible] کسی [illegible] یا طالب علم کے کمرے کا سا منظر [illegible] کے سامنے [illegible] ریچھ کی سمور بچھی تھی جس میں ایک ریچھ کا سر بھی لگا تھا جو بالکل اصلی معلوم ہوتا [illegible] پر شیشے کا [illegible] تھا جس میں گرم خطوں کی غیرمعمولی حد تک [illegible] کا ذخیرہ تھا۔ دیوار پر کسی [illegible] کی طرح ایک [illegible] تھا جس میں شکار کا سارا [illegible] موجود تھا۔ جال [illegible] بندوقیں، شکاری [illegible] کے چھرے چاقو، میرے لیے ٹاور کا سارا سامان ایک بھرپور خوش باشی سے گزاری ہوئی زندگی کا مظہر تھا جس میں [illegible] کی جھلک نمایاں تھی۔ میرے لیے یہ ان مردوں کی [illegible] کی روح تھی۔ ان کی خوش باشی اور [illegible] پر [illegible] اور [illegible] جیسے [illegible] کا باریک حجاب تھا۔ جب میں کسی بھی حد سے گزر جانے کی [illegible] زندگی کا رس [illegible] لینے کی طمانیت تھی، اور ایک [illegible] گویا یہ پورا [illegible] شدید خطرات اور موت کی بھی [illegible] پر [illegible]

[illegible] میں جب یہاں مہمان ہوتا تو مجھے [illegible] کے کمرے سے ملحق کمرے میں رکھا جاتا تھا۔ اس کی دیواروں پر آویزاں تصویروں میں جذباتی پن تھا، مثلاً [illegible]

Scanned with CamScanner

ہم نے ایک سلسلہ شروع کیا جس کو اب تک دو سال ہو چکے ہیں جس میں ہم نے مختلف کتب کو سافٹ میں منتقل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ریختہ کی قابل تعریف ویب سائٹ سے بھی کتب کو پی ڈی ایف میں منتقل کیا، ہماری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ دوستوں کے لئے نایاب و اہم کتابوں کو سافٹ میں پیش کیا جائے۔

معروف ادبی جریدے "آج" کو سافٹ میں منتقل کرنا بھی اسی کوشش کا حصہ ہے اور ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں کے لئے ایک تحفہ

محمد ثاقب ریاض ایڈمن بزم کتب

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تاکہ مزید اس طرح کی شاندار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے

ہمارا وٹس ایپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبر ذیل میں ہیں

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

محمد ثاقب ریاض: +92-3447227224

Scanned with CamScanner

اور کنواری مریم کی شبیہات اپنی لڑکپن کی تنہائی میں میں ان تصویروں کی داستانوں کا
بھی ایک خاموش ناظر بنا رہتا تھا۔ لیکن مجھے تب بھی احساس رہتا تھا کہ یہ سب تو
محض ادب تھا، میری اپنی زندگی میں ان کہانیوں کے واقعات اور موڑ کبھی نہیں آئیں گے۔
لیکن یہاں ٹاور میں دیواروں پر سورماؤں کی کارناموں کی تصویریں تھیں۔ تاریخی حکایات
اور دیومالائی داستانوں نے دیواروں کو ڈھانپ رکھا تھا جیسے کاؤنٹ میں ڈور کی مہمات
(یہ ذکر کرنا کوئی نہ بھولتا تھا کہ وہ شہزادی پالین کے والد تھے جو بعض نفیس پھندے اپنی
چالیں [illegible] کی ہوا کرتی تھیں)۔ ایک تصویر میں یہ [illegible] ایک حسینہ سے یوں
محوکلام تھے کہ انہوں نے اپنے ریوالور کو حسینہ کے دریچے پر چڑھا رکھا تھا۔ کاؤنٹ نے
گھوڑے کو دریچے کی کگر پر گھٹنوں کے بل جھکا دیا تھا۔ یہ آسن اس درجہ دشوار تھا کہ
سکتا تھا گھوڑا ان کی رانوں کے نیچے سے ابھی رقصہ ہو کر نکل جائے گا۔ اس ترتیب میں
کاؤنٹ کی گردن کا منکا ٹوٹ جانے کا بہت حقیقی خطرہ موجود تھا مگر کاؤنٹ اس
خطرے سے قطعی بے نیاز کامل سکون سے محبوبہ کے ساتھ ہم کلام تھے اور دیکھنے والا
جانتا تھا کہ اگر گھوڑا ان کے نیچے سے نکل جاتا تب بھی وہ یوں ہی رکاب میں پیر پھنسائے
ہوا میں کسی طرح، ہوا میں سکون سے معلق رہیں گے۔ اس فوق الانسانی جرأت، خطرات کی
بے اعتنائی بلکہ ایک لاابالی دعوت کا مجموعہ کمرے میں دوسری رنگین شبیہ میں بھی موجود
تھا، جیسے جنگ عظیم کی یادگاریں، توپ کے گولوں کے خول، بموں کے ٹکڑے، لٹکی رہی
وغیرہ جو کمرے میں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔

ٹاور میں گھنٹوں خاموش کھڑا میں گردوپیش کو تکتا رہتا۔ میں جیسے اس ماحول کے
ذرّے ذرّے سے اٹھتی ہوئی مکمل روح کو اپنی سانسوں اور نگاہوں سے چوس کر اپنے اندر
سمو لینا چاہتا تھا جو میرے لیے بالغ مردانہ پن اور مردمی کی جارح قوت کا مجموعہ
تھی، جس میں لذت، خطرہ، موت، سب کچھ یکجا ہو گیا تھا۔ پھر دماغ میں کبھی کبھی ایک
سوال ضرور آتا تھا یہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ ٹاور کی [illegible]
قاتلوں کی [illegible] تصویروں میں مردانگی کی جسمیات بالکل منطقی بات تھی لیکن آخر
یہ کیونکر ہوتا تھا کہ ٹاور میں ویران پڑی چوکیوں کے اندر سے، اس کی ساخت، رنگ،
لمس [illegible] سے قوت مردانگی پھوٹتی محسوس ہوتی۔ حالانکہ [illegible] اسی ساخت، رنگ اور
جسامت کا ایک [illegible] لڑکیوں کے کمرے میں نزاکت سے معمور نسوانیت کا مرقع بن جاتا تھا؟
اس کا کیا بھید تھا؟ مردانگی کا اصل جوہر، جس پر میں انگلی رکھ کر شناخت کر سکوں،
آخر کیا تھا؟ میں کس طرح اس کو اپنے اندر سمو سکتا تھا؟ اس پُراسرار، مبہوت کیفیت
میں [illegible] کیسے حل ہو جاتی؟ یہ سوچ سوچ کر میں دیوانہ ہو جاتا اور کبھی [illegible] میں
سانس [illegible] باہر بھاگ جاتا۔

رفتہ رفتہ مجھے چچا بیوریں کی لڑکپن اور بچپن کے بارے میں معلومات مہیا ہونی شروع

ہوئیں۔ چچا بیوریں آج مردانگی کا پیکر تھے۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ ان کا بچپن اور لڑکپن،
جو اس کی مردانگی کا پیش رو تھا، نوزائیدہ بہت جذباتی نسوانیت کا پہلو بھی رکھتا
تھا۔ اس طرح مجھے چچا بیوریں اور ان کی شکاری فرمنسٹری کے بارے میں [illegible] کے
پس منظر کا مبہم سا اندازہ ہوا۔ گو میں اسے پوری طرح سمجھنے سے اب بھی قاصر تھا۔
چچا بیوریں سابق سربیائی کی حیثیت سے پروشیا سے [illegible] ہجرت کر کے تھے۔ آسٹرو ہنگیرین
سلطنت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور وسیع تر جرمن [illegible] دل سے حریص
تھے۔ [illegible] یونیورسٹی میں اپنی طالب علمی کے دور میں وہ وہاں کی [illegible] کی انجمن کے
سرگرم رکن تھے۔ چچا بیوریں ایک پکے یہودی دشمن تھے۔ وہ [illegible] سیاسی رہبر [illegible] شونرر کے
پرجوش معتقد تھے۔ [illegible] شونرر وہی موصوف تھے جنہوں نے ایک یہودی اخبار کی ادارتی دفتر
میں گھس کر ہنگامہ مچایا تھا (اس اخبار نے مارچ ۱۸۸۸ میں قیصر ولیم اول کی موت کی
غلط خبر پھیلائی تھی) [illegible] اور خطاب کی [illegible] ہوئی تھی۔ میرے والد اپنے
[illegible] مزاج کی [illegible] صحبت میں چچا بیوریں کو یہ واقعہ یاد دلا کر [illegible]
[illegible] کبھی اپنی [illegible] پر [illegible] رہتا۔ چچا بیوریں اب بھی اس واقعے کے ذکر پر طیش
میں آ جاتے جس نے نوجوانی کے دنوں میں انہیں تقریباً آپے سے باہر کر دیا تھا۔ اور جیسے
سوال ان کی نابینہ کرتے ہوئے کہتے "آپ کو یہ بات جان لینی چاہیے کہ یہودی بے انصافی کو
کبھی برداشت نہیں کر [illegible]

میں من ہی من میں چچا بیوریں کی نوجوانی کے زمانے کو دوبارہ تخلیق کرتا۔ میں [illegible]
سے [illegible] کرنے کی کوشش کرتا [illegible] وہ "زائٹ گیسٹ" [illegible]
مخصوص [illegible] جس نے پوری طرح [illegible] ہو کر [illegible] شعلے کی طرح ان تمام
[illegible] کو [illegible] کر دیا تھا جن سے چچا بیوریں کی شخصیت کی ابتدائی تشکیل ہوئی
ہو گی۔ کیونکہ یہ بھی تو حقیقت ہے کہ چچا بیوریں کے خاندانی پس منظر کے مطابق ان کی
پرورش میں سربیا کی قدیم مہذب حقیقت پسندی، [illegible] روایات کا احترام اور
ریاست سے وفاداری کی تربیت یہ سب کچھ یقیناً شامل رہا ہو گا۔ یہ خصوصیات ان کے خون
میں [illegible] سرزمین کی [illegible] تھا جہاں انہوں نے جنم لیا تھا اور پرورش
پائی تھی۔ [illegible] کی معروف خصوصیات، [illegible] ہوشیاری اور حس مزاح، مشرقی
[illegible] اور ایک طرح کی [illegible] یقیناً ان کے خمیر میں شامل رہی ہوں گی۔ کوئی تو [illegible]
[illegible] خصوصیات کو جلا کر نابود کر [illegible] میرے اندر یہ [illegible] تجسس تھا کہ اس آگ
کی [illegible] وہ چقماق [illegible] جس کی رگڑ سے یہ چنگاری پھوٹی۔ میرے [illegible] کی
[illegible] وقت [illegible] اور [illegible] ایک دن وہ [illegible] حل ہو گیا۔ ایک
کتاب میرے ہاتھ لگ گئی جس کی [illegible] "بائش" تھا۔ اب یہ [illegible] تو غیر ضروری ہے کہ
یہ [illegible] بائبل نہیں تھی [illegible] کے لیے [illegible] کے وقت [illegible] جانے والی [illegible]

اور مختصر نظموں کا مجموعہ تھا۔ اس جلد سے جھلکتی ہوئی شاعری جیسے میرا ذہنی
خالص [illegible] جرمن جلد سمجھ سکتا تھا۔ سو یہ [illegible] کی بات ہے کہ جرمن نسل سے ہونے کے
باوجود صدیوں سے ہم جرمن، نوآبادیاتی مہمات کے سلسلے میں مشرقی یورپ کے دور افتادہ
قصبات کے باسی ہو چکے تھے اور ان گنت نسلوں سے وہیں رہتے رہے تھے۔ میری طرح کے
لاکھوں لوگ ان نظموں کو اصل جرمنی کا جوہر اور روح ہی سمجھ سکتے تھے۔

ان دنوں بہار اپنے عروج پر تھی۔ ہر سو پھول رہے تھے اور [illegible] شوخ چشمی
کلکاریاں مار کر ابل پڑے تھے۔ ویسا ہی تھا میری طبیعت کا موسم۔ [illegible] کی سرورق پر
رنگین تصویر تھی جس میں طالب علموں کو [illegible] پر کشتی رانی کرتے ہوئے دکھایا گیا
تھا۔ جو لباس انہوں نے پہن رکھا تھا وہ [illegible] آج بھی پسند ہیں [illegible] سے
مزین سیاہ مخملی جیکٹیں، چست سفید پاجامے اور سر پر [illegible] کو گول ٹوپیاں۔ ایک
طالب علم کشتی میں [illegible] باقی کشتی کھینچ [illegible] گیت گاتے ہوئے دریا کے [illegible] اطراف
پہاڑیوں پر قلعوں کے کھنڈر۔ یہ تھا جرمنی کی ماضی کا شکوہ، اس کے حال کا رومان اور
مستقبل کی شاندار مکاشفت۔ اور وہ لباس! [illegible] چست، چابک و چوبند لباس۔ [illegible] سب کچھ
اس لباس کے پہلوؤں اور [illegible] ہو چکا تھا اور میں یہ لباس ہی ضرور خود
پہن لینا چاہتا تھا۔ میں نے چچی سوفی سے مشتاقانہ فرمائش کی۔ [illegible] پرانے کپڑوں کے
صندوقوں کو مناسب کپڑوں کی تلاش میں کھنگال ڈالا۔ خوش قسمتی سے باورچی کو
یاد آیا کہ اس کی [illegible] کے پاس کسی زمانے میں اس طرح کی وردی تھی۔
شاید اس کی بیوہ کے پاس کوٹ اب بھی پڑا ہو۔

باورچی کا بہنوئی قصبے کا لوہار بالر تھا۔ میری اس سے گاڑھی چھنتی تھی۔ اکثر میں
پرانی [illegible] کی گولیوں کے سیسے کو پگھلانے کے لیے اس کی دکان کے چکر لگایا کرتا تھا
اور شدید رشک کے ساتھ اسے اپنے دلچسپ کام میں غرق دیکھتا رہتا تھا۔ وہ سفید کھولتے
ہوئے سیسے کو چمٹی سے پکڑ کے [illegible]
ہاتھ جلائے کمال پھرتی سے حرکت دے کر سیسے کی ننھی ننھی کنکریوں میں تبدیل کر دیتا۔
(انہیں میں اپنی غلیل کے چھرے بناتا تھا۔) ایک بار بالر کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ایسا
کرنے کی کوشش کی تھی اور نتیجتاً پورا ہاتھ چھالوں سے بھر بیٹھا تھا۔ بہرحال بالر کی بھائی
کی بیوہ سے وہ کوٹ منگوا لیا گیا۔ سوفی چچی نے اسے میرے ناپ کا سلوا دیا اور تسموں سے
مزین کر دیا۔ اب سوال تھا کہ نیچے کیا پہنا جائے۔ چچا جوزف کی پرانی جرابیں
پہننے پر تو میں [illegible] راضی نہ ہوا۔ لیکن جب کوئی مناسب چست سلائی کا پاجامہ نہ مل
سکا تو چچی سوفی نے مجھے اس بات پر [illegible] کہ میں [illegible] چچی کا ایک
پرانا ریشمی سیاہ زیرجامہ پہن لوں جو انہوں نے کبھی اپنی جوانی میں کسی فینسی ڈریس
دعوت کے لیے سلوایا تھا۔ جوتوں کا مسئلہ کسی مہمان کے فراموش کردہ لمبے شکاری بوٹوں

نے حل کر دیا۔ [illegible] پرانے کپڑوں کی گٹھڑی سے ایک سیاہ مخملی
ٹوپی برآمد کر لی [illegible] اس پر لومڑی کی سرخ کھال کی گوٹ بھی لگا دی۔

[illegible] کرنے کے بعد جب چچی سوفی کے کمرے والے آئینے میں میں نے
[illegible] رومانی [illegible] کا ایسا [illegible] کہ اسی کمرے سے باہر
[illegible]
[illegible] کا [illegible] نہیں تھا۔ ایسا کوئی [illegible] مثلاً [illegible]
[illegible] کوئی [illegible] کھیل کھیلنا چاہتا ہو۔ یہ میرے وجود کا وہ
[illegible] جس کی [illegible] چیز تو میں اپنے وجود میں محسوس
کرنا چاہتا تھا وہ جرمنیت تھی۔ یہ کاسٹیوم مضحکہ خیز تھا، مگر یہ اسی ماحول کی نقل
[illegible] جرمنیت کا [illegible] مظہر تھا۔ یہ احساس میرا اپنا تھا۔ [illegible]
[illegible] مبہم مگر [illegible] حقیقی اضطراب تھا اور
[illegible] نامعلوم تھا۔ [illegible] کی کیفیت کی
[illegible] اضطراب تھا۔ [illegible] کی شدید آرزو، اور
[illegible]

[illegible] چچی سوفی [illegible] کی [illegible] پر بجاتیں۔ [illegible] والی [illegible]
[illegible] جب ہم [illegible] تو چچا [illegible] ہماری
[illegible] کی طرح [illegible] کا علم
[illegible] وہ سب پہلا پہلا کر [illegible] اور [illegible] کہ چچی سوفی [illegible]
[illegible] کرنی کے [illegible] کے واسطے اب بس کرو۔ کبھی کبھی میں اور چچی سوفی
[illegible] چچا [illegible] ایسے [illegible]
[illegible] کے [illegible] اب یہ [illegible] روز کا معمول ہو گیا تھا کہ رات کے کھانے سے
[illegible] کے گرد جمع ہو کر [illegible] جرمنیت کی تجدید کریں۔ میں بہت خوش تھا [illegible]
[illegible] چچی سوفی بھی خوش تھیں [illegible] اور اپنائیت کی ایسی
[illegible] ہو گئی تھی، جو مجھے کبھی اپنے خاندان میں نہ مل سکی تھی۔ میرے [illegible] کو
[illegible] مل گیا تھا

[illegible] کی [illegible] میرے وجود میں [illegible]
[illegible]
[illegible] میں [illegible] پانی میں اس کے رنگ و [illegible]
[illegible] کے خاتمے کی بعد اس
[illegible] شامل ہو گئی تھی۔ میں جس [illegible] کا وارث تھا وہ میری
[illegible] وہ سب [illegible] و [illegible] کی گردان۔ ایک قسم کا [illegible]

Scanned with CamScanner

یہ وضع تو کل اور تقریباً مرتب حوالی کنج، میری عمر کی شناسی سے ناقابل برداشت حد تک متصادم تھے۔ ایسے ورثہ سے مجھے کسی حد تک نفرت بھی اس کا اندازہ مجھے ایک شخص کے لیے اپنی نفرت سے ہوا، جس کا نام استپانسی تھا اور جو چچا صوفی کے گھر برسوں سے مستقل مہمان تھا۔

استپانسی جو اپنے آپ کو اپنے منہ سے "زوال کا وارث" کہتا تھا، سینتیس برس اور تعلیم یافتہ شخص تھا۔ وہ پراگ کا رہنے والا تھا جہاں کسی زمانے میں اس کے خاندان کا شمار امرا میں ہوتا تھا۔ اس کے گھرے میں دوسرے نوادرات اور نایاب کتب کے ذخائر کے ساتھ سلطنت وہ سلامی فہرست بھی مل سکتی تھی جس میں ۱۹۱۹ کے فوراً بعد اس کے خاندان کی کل مال و املاک اور جائیداد کی ہوئی بکی تھی — نتیجہ نیلام پر کہ ہوا، مہر و سامان، بگھیاں، خادموں کی وردیاں یہاں تک کہ استپانسی کے باپ کی نادر تصاویر کا ذخیرہ بھی نہ بچ سکا تھا۔ اس نیلام کے بعد خاندان کے والدین میں سے ایک بھائی نے خود کو گولی مار کر خودکشی کر لی تھی۔

استپانسی اپنے خاندانی ادبار کو ذاتی المیہ نہیں سمجھتا تھا۔ وہ ہونٹوں پر مردنی زدہ تبسم لا کر کہتا، "لیکن یہ تو ایک کلاسیکی عمل تسلسل کا حصہ ہے" اس کے نزدیک یہ علاوہ بات تھی کہ وہ مفلس ہو گیا تھا اور یہ اس جگہ پناہ لیتا پھر رہا تھا جہاں بقول اس کے عمل تحلیل نے ابھی اپنا کام مکمل نہیں کیا ہے" ویسے ہمارے یہاں آنے میں خوشحال گھرانوں میں یہ عام طریقہ تھا کہ مرور زمانہ سے متاثر ہونے والوں میں سے کچھ لوگ ہمیشہ مہمان رہتے چلے جاتے۔

ذرا سے فاصلے پر دنائسٹر دریا کے پار روس تھا۔ ۱۹۱۷ کے انقلاب کے بعد وہاں سے بہت لوگوں کی جھنڈ اس پار ہجرت کر آئی تھی جو بڑے بڑے خاندانی رشتہ داروں یا دوستوں کے گھروں میں رہ رہے تھے۔ استپانسی اپنے میزبانوں کی مدارات کو احسان کے بجائے اپنا حق تصور کرتا تھا۔ وہ ہر چیز پر اعتراض کرتا، ہر بات میں عیب نکالتا، اور لوگوں سے بدمزاجی سے پیش آتا۔ ساتھ ہی وہ اپنے آپ پر ایک ناخوشگوار استہزائیہ انکسار بھی طاری رکھتا۔ اس کی عرفیت "مسٹر کورا" پڑ گئی تھی۔ اکثر وہ کوئی بات ان جملوں سے شروع کرتا "مگر میں کون ہوتا ہوں جو فلاں بات پر اعتراض کروں..." وغیرہ

حقیقت یہ تھی کہ میں استپانسی سے ڈرتا تھا۔ میں اس سے متنفر محسوس کرتا اور رشک بھی کھاتا۔ شاید اس کی جانب سے کا ردعمل بھی تھا۔ ہاں چچا صوفی بے شک اسے کسی بدشگون پنچھی کی طرح اپنی چھتر چھایا میں اطمینان سے بیٹھنے دیتے تھے۔ میرے والد استپانسی سے شدید نفرت کرتے تھے۔ جب وہ آتے تو استپانسی کی توہین کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اس سے مجھے جہاں ایک طرف تو خوشی ہوتی کہ استپانسی اسی سلوک کا مستحق ہے، وہاں عجیب بات یہ تھی کہ گہری اذیت بھی محسوس ہوتی۔

استپانسی سب سے الگ تھلگ رہتا مگر ایک طرح سب کے سر پر سوار بھی رہتا۔ اپنے کمرے میں وہ عجیب و غریب مصروفیات میں منہمک رہتا۔ کبھی تمام ملازموں کے زائچے کھینچتا، کبھی چچی سوفی اور چچا صوفی کی شادی کے وقت ان کے مسیر بروجوں پر ستاروں کے منحوس اثرات کا حساب لگاتا۔ کہا جاتا تھا کہ کبھی کبھی وہ روحیں بھی بلاتا ہے۔ یہ کام کامل رازداری سے سرانجام پاتے۔ اس طرح اس کی موجودگی میں بھی کچھ غیر موجودگی کی سی کیفیت رہتی۔ کھانے کے وقت البتہ وہ متاثرکن پابندی وقت کے ساتھ پوری طرح موجود ہی رہتا۔ کسی بھی قسم کا کھانا ہو، تہوار ہو کہ ضیافت، یا کسی کے ہاں سے مہمان آئے ہوں یا جانے سے پہلے مہمانوں کا دور ہو یا مولی پر، استپانسی لازماً موجود ہوتا۔ کھانے کی میز کے ساتھ اس کا وجود اسی طرح لازم و ملزوم تھا گویا وہ چھری یا کانٹا تھا جیسے کھانے کی میز پر بہرحال موجود رہتا تھا۔

وہ گہرے رنگ کے خوش قطع مگر پرانی طرح کے سوٹ میں، انکسار سے مذہبی استادوں کی مانند ہاتھ باندھے اور نظریں جھکائے کھڑا رہتا۔ اس کی قمیص کے کف اور کالر چھدرے ہو گئے تھے اور ٹائی کی گرہ ہمیشہ ٹیڑھی بندھی ہوتی۔ اس کے باوجود اس کی خوش وضعی میں فرق نہ آتا تھا۔ اس کا دراز قد اور متناسب جسم، اس کے سیاہ بھورے بال، کاسہ سر کی متناسب ساخت، اور سرخ دھاری دار جیتی پرکشش تھی۔ اس کی شخصیت سے قدر مکروہ تھی۔ اس کی قطعی تہہ شدہ داڑھی، مسلسل تمباکونوشی سے داغدار انگلیاں، کاہلی اور پرخوری کے باعث اس کا مرجھایا ہوا شباب۔ خصوصاً اس کی آنکھیں عجیب تھیں۔ جب تک وہ ادھر ادھر نظریں دوڑاتا رہتا اس کے چہرے پر طنز اور حقارت کا تاثر رہتا، مگر جوں ہی اس کی نگاہیں کسی میزبان سے ٹکراتیں اس کی آنکھیں گویا کانچ کی سی ہو جاتیں اور چہرے پر نہایت عاجزانہ نفس کشی کی کیفیت طاری ہو جاتی جیسے وہ ابھی کہنے والا ہو میں کون ہوتا ہوں۔

[illegible] میرے ساتھ ہوتی، وہ شدید بدتمیزی سے کھانا کھاتے۔ مجھے اس کی کھانے سے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ پھر بھی میں کنکھیوں سے اسے دیکھے بغیر نہ رہ پاتا۔ جب میں اس پروقار مہمان اور ترشی ہوئے خدوخال والے انسان کو جلدی جلدی حرص سے کھانا نگلتے ہوئے دیکھتا تو مجھے ایک ذہنی ناگوار لطف آتا۔ وہ کسی سرپرست پیشگی کی طرح تھا جس میں خوبصورتی کے ساتھ اس کا متضاد بھی پیوست ہوتا تھا۔ اکثر وہ میری دزدیدہ نگاہیں پکڑ لیتا۔ تب وہ یوں مسکراتا جیسے کسی جرم میں ہم دونوں کی ملی بھگت ہو۔ اس کی بےرنگ اور گستاخ سی نگاہیں اس کے ذہنی جذبات کو چھپانے کی کوشش سی کرتیں۔ گویا وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس جیسے اعلا تعلیم اور ذہانت کے مالک شخص کو کس قسم کے انسانی گھامڑوں کے ساتھ رہنا پڑ رہا ہے۔

وہ نگاہیں مجھے پریشان کر دیتیں۔ میں کئی کئی دن بےچین رہتا۔ میری خوداعتمادی [illegible] میں [illegible] کی [illegible] نہیں۔ میری خود [illegible] بھی بی کتنا احساس کو اس کا خوب اندازہ تھا۔ وہ دانستہ مجھے شرمندہ کر کے لطف لیتا تھا۔ میرا اور اس میں جوڑے کا قرب خصوصاً اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اس کی موجودگی میں جب بھی میں کمرے میں قدم رکھتا وہ طنزیہ لہجے میں کہتا "بہت خوب! تو وارث صاحب تشریف لے آئے [illegible] کے ساتھ گھر [illegible] بیٹھ [illegible] اور کبھی رہتا۔ اور مجھ سے آپ جناب کر کے بات کرتا۔ [illegible] کئی بار ٹوکنے پر بھی اس [illegible] میں فرق نہ آیا۔ [illegible] مجھے [illegible] کا [illegible] کر [illegible] مگر اس کے طنزیہ غرور کا [illegible] کے باوجود میں بھی رہتا تھا۔ یہ طنزیہ اکثر میری سمجھ میں بھی نہ آتے، اور استہزائیہ میرے اس الجھن سے اور زیادہ لطف لیتا محسوس ہوتا۔ اسے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ تھا کہ میں سخت گیر ماحول میں تربیت پانے کے باعث بڑوں سے [illegible] کے [illegible] پر مجبور ہوں اور میرے [illegible] کے طنزیہ تکلف کے جواب میں [illegible] زیادہ تکلفات برتاؤ [illegible] کروں۔ اس طرح ہمارے درمیان گویا [illegible] اور تکلف کا ایک مقابلہ شروع ہو جاتا جس پر [illegible] اور [illegible] کبھی کبھی بری طرح جھنجھلا جاتیں۔

جب اس نے پہلی بار مجھے طالب علموں کی جرمنی کے لباس میں دیکھا تو اس کی آنکھیں [illegible] سے چمکنے لگیں۔ پھر [illegible] والی خلافت [illegible] کہنا شروع کر دیا [illegible] کی ترکی [illegible] ہیں، ایک شخص سے دوسری کو روشنی ہونا چاہیے اور پھر ہماری جرمنیت کی حفاظت بھی تو لازمی ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے [illegible] صاحب کی والدہ جرمن [illegible] [illegible] کی رگوں میں [illegible] [illegible] ہی [illegible] کہ [illegible] کہنے والا کہ ہم آسٹریائی سب مخلوط النسل ہیں۔ خصوصاً [illegible] جرمنی [illegible] کی بات [illegible] ہم خود کو [illegible] تک نہیں کرتے۔ شاید ہم امریکی ہیں یا شاید ہم بھی یہ سمجھنے کی بھی صلاحیت [illegible] [illegible] زندگی [illegible] عقل پر فوقیت رکھتے ہیں اور زیادہ عرصے تک قائم رہتے ہیں [illegible] سچ تو یہ ہے کہ [illegible] جیسے [illegible] عظیم جرمن سلطنت کے لیے ہماری آرزو ہی کو لیجیے۔ کون سی عظیم جرمن سلطنت؟ شارلیمن کی یا کارل اعظم کی؟ اسے دوبارہ متحد کرنے کے لیے، تخلیق کرنے کے لیے، ہم کس قدر مضطرب ہیں۔ ایک صدی قبل بھی [illegible] [illegible] جرمن ہونے والے جرمنی [illegible] [illegible] محسوس [illegible] ہیں۔ اب یہ حقیقت بھلا میں جانے کہ اس میں زیادہ تر پروشیا یا [illegible] کا خون ہے اور خود آپ

[illegible] اور [illegible] کو [illegible] اور [illegible] اور [illegible] وطن کی اور اسپولن ہیں لیکن سبھی ہم پھر بھی خالص، اصل نسل، ٹھیٹ جرمن ہیں۔ ہمارے نوجوان [illegible] رنگ موت کی سرخ جھلک اڑاتے ہیں خون کی اور سنہرا رنگ کسی خواب ناک امکان کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہی ہماری جرمنیت ہے۔ یہ ہم نوجوانوں کی پرسوز سچائی اور بوقعت [illegible] کو کوئی شکوہ کا وقت سمجھ بیٹھے ہیں۔ اگر میرے معزز مہمان برا نہ منائیں تو میں [illegible] سے [illegible] دکھاؤں [illegible] تھا [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible] ایک ٹکڑا میں گھس کر [illegible] [illegible] ہو [illegible] بلی رہتی تھی۔ ہر جگہ سے طرح ایجاد ہو [illegible] [illegible]

ایک روز اسی قدیمی جرمنی لباس میں لپٹا ہوا میں ٹاور سے باہر نکل آیا اور سڑک پر سرگشت کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری ہیئت کذائی تھوڑی بہت ہلچل ضرور مچائے گی اور اگرچہ مجھے کسی کھلی جھڑپ کا سامنا ہونے کی توقع نہیں تھی، پھر بھی میں ایسی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] میرا [illegible] باوجود [illegible] میرے [illegible] [illegible] [illegible] تھیں [illegible] [illegible] [illegible] اسے چھوکروں کی میں نے پروا نہیں کی اور آگے بڑھتا گیا۔

ڈاکٹر کرنیمیں کی بوجھوں اور لنگڑوں والی تھوڑی کے سامنے ایک لڑکے نے میرا راستہ [illegible] وہ میرا ہم عمر تھا لیکن قد اور جسامت میں مجھ سے کہیں لمبا چوڑا۔ اس کا لباس [illegible] چھوکروں کے مقابلے میں بہتر تھا اور اس کی [illegible] میں [illegible] [illegible] [illegible] بالوں سے [illegible] بالکل معمولی [illegible] مگر چہرے کی [illegible] سے زیادہ نمایاں اس کی خوداعتمادی کا [illegible] جو میرے ذہن پر نقش ہو گیا۔

[illegible] نے مجھے دیکھ کر حیرت سے کہا "ارے! کیا تم کوئی بہروپیے راہب ہو؟" میں نے اسے [illegible] کر [illegible] سے ہٹانے کی کوشش کی کیونکہ اس کے بیہودہ سوال کا [illegible] مجھے [illegible] کے خلاف محسوس ہوا۔ لیکن اس پر میرے گھورنے کا مطلق اثر [illegible] کر میری ٹوپی کے پھندنے کو استہزائیہ انداز میں چھوا اور اپنا سوال

ہو پڑا۔

اس توہین پر میں نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔ میرا ایسا کرنا تھا کہ شدید مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ ذرا سی دیر میں میری خوبصورت ٹوپی سر سے اتر کر دھجی دھجی ہو چکی تھی۔ مجھے اپنی کالی کس کی جیکٹ کی آستینیں الگ ہوتی محسوس ہوئیں۔ میرے منہ پر چند گھونسے بھی پڑے، مگر میں نے بھی تاک تاک کر گھونسے جمائے۔ سب سے زیادہ دہشت انگیز بات یہ تھی کہ میکس میری حمایت کرنے کی بجائے میری ٹانگوں کے پیچھے چھپ کر کپکپی کر رہا تھا۔ وہ اپنی بدحواسی کی وجہ سے گھونسوں اور لاتوں کی زد میں آ گیا۔ لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ جس لڑکے کو میں نے پہلے مارا تھا وہ میکس کو بچانے کے لیے اس پر جھپٹ پڑا اور چلایا "اسے چھوڑ دو۔ کتے نے سمجھا کہ شکار ہم ہیں۔" پھر اس نے ایک زوردار پٹاخا چھوڑا۔ ہمارا پالتو پھر واپس جا رہا تھا۔ اس کی تالی کی آواز بھی گولی کے دھماکے جیسی تھی۔ بچے اناً فاناً غائب ہو گئے۔ گلی میں سناٹا چھا گیا۔ صرف میں اور گوسفند صورت بڑی کھڑے رہ گئے۔ میں نے میکس کو گود میں اٹھا لیا جو اس کا چہرہ چاٹنا چاہ رہا تھا۔ اس نے کہا "کتنا پیارا کتا ہے؟" میں نے جلدی سے جواب دیا، "ابھی چھوٹا ہے اس لیے لڑنا نہیں سیکھا۔" دل تو میکس کو کوسنے اور گالیاں دینے کو چاہ رہا تھا، لیکن میں یہودی لڑکے کے سامنے اپنے کتے کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"کیونکہ وہ ان لڑکوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا؟" اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔ "جرمنوں کی طرح بیوقوف نہیں، اس لیے؟" اس نے منہ کھول کر زبان سے دانت کو ٹٹولا پھر کہنے لگا "تم نے میرا ایک دانت ہلا دیا ہے۔ اگر ٹوٹ گیا تو سونے کے دانت کی قیمت تمہیں بھرنی پڑے گی۔ دانت دوسری بار نہیں نکلتا۔"

"کتے کو مجھے اتار دو،" میں نے کہا "یہ گود کا کتا نہیں ہے۔"

لڑکے نے بہت نرمی سے کتے کو زمین پر رکھ دیا۔ میکس دوبارہ سہلائے جانے کی امید میں اچھلنے لگا۔ لڑکے نے پیار سے میکس کا سر سہلاتے ہوئے پوچھا، "تو پھر کیا ہے کتا؟"

"شکاری کتا۔"

"کس چیز کا شکار کرے گا؟ تتلیوں کا؟"

"ہاں، کیوں نہیں؟" میں نے جواب دیا۔ "میں تمہیں اس کا شکار دکھا سکتا ہوں۔" میں تتلیوں کے اس ذخیرے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ٹاور میں شیشے کے صندوقوں میں سجا ہوا تھا۔

"تو دکھا دو۔" اس نے کہا۔ "کیا تمہیں ڈر ہے کہ میری وجہ سے تمہارے گھر میں جوئیں پڑ جائیں گی؟ میں ڈاکٹر گولڈمین کا بیٹا ہوں۔" اس نے دوگوسینگ اسٹریٹ میں کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ "تم چاہو تو میرے گھر آ سکتے ہو۔ خواہ تمہارے شکاری کتے کے روؤں میں کیڑے ہی کیوں نہ بھرے ہوں۔"

اس طرح ایک ایسی دوستی کا آغاز ہوا جو بدقسمتی سے زیادہ عرصے قائم تو نہ رہ سکی لیکن جس کی وجہ سے اس برس کا موسم گرما، جس میں بہت سے واقعات پیش آئے میرے لیے کئی لحاظ سے ناقابل فراموش ہو گیا۔

پہلے تو مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں ڈاکٹر گولڈمین کے بیٹے کو محض اپنی مرضی سے اپنے رشتہ داروں کے گھر مدعو کروں یا نہ کروں۔ بات صرف اتنی ہی نہیں تھی کہ وہ یہودی تھا۔ چچا ہیوبرٹ کے خاندان اور گاؤں کے دوسرے باسیوں کے درمیان سماجی فرق بھی ایک رکاوٹ تھی۔ پھر میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ گولڈمین گھرانے کے لیے چچا ہیوبرٹ اور چچی سوفی شاید کچھ اور طرح کی جھجک بھی محسوس کرتے ہیں۔ یوں تو اکثر جاگیرداروں کے تعلقات گاؤں کے طبیب سے خوشگوار ہوتے ہیں، لیکن یہاں دوسری صورت حال تھی۔ حویلی کے نوکر چاکروں اور ملازمین کو زیادہ سنجیدہ بیماریوں کے بارے میں مشورے لینے تو ڈاکٹر گولڈمین کے پاس بھیج دیا جاتا تھا، مگر کوشش یہی رہتی کہ چھوٹی موٹی شکایات کا علاج ڈاکٹر گولڈمین کی مدد کے بغیر ہی، قصبے کے پولش دواساز کی مدد سے کر لیا جائے جس پر چچی سوفی کو کہیں زیادہ اعتماد تھا۔ چچا ہیوبرٹ اور چچی سوفی خود اپنا علاج تو ڈاکٹر گولڈمین سے ہی کرواتے تھے، علاوہ ازیں جس استہزائیہ انداز میں یہ دونوں کسی بھی تہوار پر مدعو مہمانوں کو گولڈمین کا ذکر ایک مضحکہ خیز عجوبے کی طرح دکھاتے تھے اس سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ ڈاکٹر گولڈمین سے فاصلہ رکھنے کا کوئی مخصوص سبب ہے۔

یہ سبب کوئی بھی ہو، اتنا مجھے ضرور اندازہ تھا کہ اگر میرے رشتہ دار ذرا بھی ضرورت محسوس کریں تو یقیناً وہ ڈاکٹر گولڈمین سے بہتر تعلقات استوار کر چکے ہوتے۔ اس لیے میں مخمصے میں تھا کہ اس چھوٹے سے قصبے کے سماجی رسوم، یا ان رشتوں کے عدم وجود میں صرف اپنی مرضی سے کیونکر دخل اندازی کروں۔

مثلاً ایک بار میں نے اسٹیفن کے منہ سے ایک ایسی بات سنی تھی جو میرے ذہن میں بیٹھ گئی تھی۔ میں نے غالباً دوسروں سے زیادہ اس بات پر غور کیا تھا۔ کسی مہمان نے سرسری تذکرہ کیا تھا کہ چونکہ چچا ہیوبرٹ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں (گو ابھی سند نہیں ملی ہے لیکن پھر بھی) ان کا شمار علما میں ہو سکتا ہے۔ اس پر اسٹیفن نے یہ تبصرہ کیا "جرمن قوم کا المیہ ہی یہ ہے کہ اس کے مفکرین میں سے نصف نام نہاد عالم ہیں اور نصف نام نہاد فلسفی۔" صاف ظاہر تھا کہ علما اور دانشوروں میں نہیں بنتی۔ اس بات کی شہادت خود چچا ہیوبرٹ کے تبصرے سے ہوتی ہے۔ اسٹیفن کی بات پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "ان دانشوروں سے چڑ ہے اسی سے زیادہ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ سچ یہ ہے جو کہیں سیدھی بات کہیں۔ یہودیوں جیسی قومیں ترپ چال کی سیاسی سمجھ بوجھ نہیں باندھی ہدف کچھ اور ہوتا ہے اور نشانہ کہیں اور لگاتے ہیں۔ بالکل

Scanned with CamScanner

یہودیوں کی طرح۔ چچا بیوریں نے مولف کی حمایت میں [illegible] چند کتب ضرور ادا کرتی تھیں۔ اس بار بھی انھوں نے کچھ یوں کہا "بیوریں کا یہ مطلب نہیں کہ توپ خانے کے تمام سپاہی یہودی ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ درست ہے کہ اگر انھیں محکمۂ طب یا محکمۂ جنگ میں پناہ نہ ملے تو وہ توپ خانے ہی میں ملازمت کرتے ہیں۔ مگر بیوریں صحیح کہہ رہے ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ جس طریقے سے گفتگو کرتی ہے اس پر تو نہایت مدبرانہ سوچ بچار کرنی پڑتی ہے۔ حالانکہ بچارے اتنے اچھے ہیں۔۔۔ اور اتنے غریب بھی ہیں۔"

ابھی بھی وہ سوچتا وہ "دوست" قدیم کی یادگاریں جس دور میں مہمان ہی کی ایسے والی چچا بیوریں کی شکاری درست اور طرح کی تھی۔ وہ تو حالسن میں بھی کوسوں دور رہے تھے، جن میں ایسے پیشہ ور علما بھی شامل تھے، مثلاً وکلا اور طبیب، جن کے بارے میں وہ حتماً یوں تبصرہ کرتی تھیں کہ "پیشہ ورانہ تربیت یافتہ جو اپنے دماغ کی کمائی کھانے پر مجبور ہیں۔ ایسے لوگ جب جو بھی ہے شوقیہ، علوم کی لامحدود وسعتوں میں جرأت رکھتا ہوں۔" یہاں اشارہ صاف چچا بیوریں جیسے "شوقیہ" شخص کی جانب ہوتا تھا۔ اب اگر کوئی نہ صرف دانشور ہونے کے باعث مختلف ہو، بلکہ ساتھ ساتھ یہودی بھی ہو تو اس صورت میں سماجی خلیج کو پاٹنا بالکل ہی ناممکن تھا۔ یہ تو امر مسلم تھا کہ ڈاکٹر کولڈمین یہودی بھی تھے اور دانشور بھی تھے۔ یہ بھی پتا چلا کہ وہ [illegible] سے دانشورانہ موضوعات پر پرجوش تبادلۂ خیال کرتے رہتے ہیں۔

ان تمام ہچکچاہٹوں کے باوجود، میں یہ [illegible] کہ ایسی تنبیہ بھی [illegible] کہ ٹاور بلا دخل اندازی میرے صرف میرے لیے مخصوص ہو، یہاں میں اپنی مرضی سے جیسے چاہے مدعو کر سکتا ہوں۔ لہذا ڈاکٹر کولڈمین کے سرخ بالوں والے لڑکے کو ٹاور میں تنتوں کی [illegible] صورت میں خالی۔ "ویسے تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا تھا۔

اس کا نام وولف تھا۔ اس نام پر میرا ملا جلا ردعمل ہوا تھا۔ اس پر تو میں مسرور ہوا کہ میرے نئے دوست کی نام سے یہودیت کی بو نہیں آتی تھی کہ مجھے کوفت ہوتی، مگر ساتھ ہی یہ مناسب نہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ایک یہودی بچہ نام جرمن حکایتوں کے کسی سورما سے مماثل رکھے۔ بعد میں اس نے بتایا تھا کہ قدامت پرست یہودیوں میں وولف بہت عام نام تھا۔ اس کے باپ کا اول نام ہنز (ربیچ) تھا۔ ہنز کولڈمین یہ نام سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ پھر اس نے میرا نام پوچھا۔ مجھے بتانا پڑا کہ مجھے ہنری کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس نام کو سن کر اس نے اس طرح حماقت سے کھی کھی کر کے ہنسنا شروع کر دیا جس طرح ہاتھی سونڈ کی ملازمت نے مجھے قدیم جرمن ملبوس میں دیکھ کر ہنسنا شروع کر دی تھی۔ "تو اگر تمہارا کوئی بہن ہوتی تو اس کا نام لڑکی ہوتا؟" مجھے تسلیم کرنا پڑا، شاید ایسا ہی ہوتا۔ "اور تمہارے باپ کا نام مرد اور ماں کا نام عورت ہوتا؟" وہ اتنا ہنسا کہ اس کی سانس کافی دیر میں درست ہو پائی۔

جب میں اسے پہلی مرتبہ ٹاور میں لے گیا تب بھی اس کا ردعمل یکساں تھا۔ "کیا یہ ہے تمہارا اپنا ذاتی ٹاور؟ یہ ٹاور کیسا ہوتا ہے میں تمہیں دکھاتا ہوں۔" اس نے روشندان سے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا جس کی چھت پر بلند بارعب مینار کھڑکیوں سے بالا ہستادہ تھا، بلکہ اس پر ایک پرچم تک آویزاں تھا۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر کڑھا کہ اس عمارت، مینار کو تو میں اکثر تکتا رہتا ہوں، اور سوچتا ہوں کہ میرے جرمن جذبات کی [illegible] جیسے میرے حوالے کر دیا گیا ہے۔

"تو کیا تمہارا کمرہ اسی برج میں ہے؟" میں نے کچھ معذرت خواہی کے انداز میں پوچھا۔

[illegible] کوئی میں [illegible]

[illegible] کہ وہ ہر اعتبار سے جرمنیت میں [illegible] حالانکہ مجھے یہ احساس ہوتا کہ غالب حسن ماحول میں وہ اتنا ہی بہتر ہے [illegible] گفتگو ہو گا اور میں درست سمجھ سکا ہوں کہ مجھ سے بہ لحاظ عمر کہیں [illegible] میں بات کرتا ہے۔ وہ چاہتا تو درست جرمن بول سکتا تھا، مگر وہ [illegible] یہودیوں کی بولنے اور پڑھنے کی ملی جلی بولی استعمال کرتا تھا، رنگارنگ [illegible] روزمرہ سے عربی، عبرانی اور رہبانیت طرز سے سطور پر بولی اس کی شخصیت [illegible] ذہانت اور چرب زبان دماغ ہے اور اس کی ناقابل تسخیر خوش مزاجی سے بہت متاثر ہوا [illegible] جس کی بر عکس مجھے قطعی درست جرمن بولنے کی سختی سے تربیت دی گئی تھی۔ حالانکہ میرے والدین گھر پر جو زبان بولتے تھے وہ کبھی بھی کہا جاتا کہ [illegible] جرمن تھی۔ اسٹریا کے باسیوں کی اپنی بولی تھوڑی اسی قسم کی تھی۔ لیکن انھیں [illegible] درست کہ معیاری جرمن بھی ہوتی اہم تھی۔

ٹاور کی نوادرات سے وولف قطعی متاثر نہ ہوا، بلکہ بور ہو گیا، ہاتھی دانت کی کاسہ سر میں سے [illegible] نظر نہیں، اس نے سنایا کہ اس کی ماں کے پاس ایک سچ مچ کا انسانی [illegible] ہے اور وہ مجھے دکھا سکتا ہے کہ [illegible] کہاں ہیں، کاوسٹ میں ڈرل کی [illegible] درست ہیں [illegible] "یہ سرکس میں کام آتے ہیں کیا؟"

[illegible] صاحب کی ماند ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی چچا سوبورث کی تلواروں کو اس نے زیادہ غور سے دیکھا۔ میں نے کمال گرمجوشی سے اس کے سامنے اپنی [illegible] معلومات کا خزانہ لٹا دیا، کس طرح جرمن نوجوانوں کے جنگجو انجمنیں ہوتی تھیں، ان کی لڑکیاں [illegible] شمشیروں سے تلوار بازی کرتے تھے، ہر انجمن کی مخصوص وردی اور ٹوپی ہوتی تھی، انھیں ہماری چارلس کی انجمن کہا جاتا تھا، ان کی خاص گشت بھی ہوتی تھی جو مے نوشی کی وقت گائی جاتی تھی۔ انجمنوں کی تربیت میں شراب نوشی کے آداب بھی سکھائے

جاتی تھی مثلاً یہ کہ یکے بعد دیگرے جام ختم کرنے کی بجائے والے سے سر پر ہی حد سے زیادہ پینے والا مدہوش نہ ہو۔

وولف گرونڈمین جس کے سرخ بالوں والا چہرہ شراب کے نشے میں کھویا ہوا تھا کو سعد سے مسائل بتا دیتا تھا۔ میری باتیں غور سے سنتا رہا۔ پھر اس نے کہا "اور ہم رائن کے ساحل پر سنہرے بالوں والی حسیناؤں کے گیت بھی گاتے ہیں؟"

ہاں، یہ درست تھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس کا اشارہ ہائنرخ ہائنے کی ایک مشہور نظم کی طرف تھا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ایک یہودی تھا۔ یہ بات میں نے خاص طور پر اسے بتائی۔ یہ سن کر اس کے چہرے کی ناگواری میں بظاہر کوئی فرق نہیں آیا۔ مگر کھسیانا ہو گیا۔ مبادا وہ سمجھے کہ میں بےدھڑک جرمن طریقے سے اس سے اہانت پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

پھر اس نے سوال کیا "اگر ان تلواروں سے جنگ کی جاتی ہے تو ان میں نوکیں کیوں نہیں ہیں؟"

[illegible]
سمجھی تھی اس سے زخم نہیں لگایا جاتا۔ صرف پھبتی کی جاتی ہے۔ یہ طالب علموں کے دوطرفہ مقابلوں کے لیے ہوتی ہیں۔ حریف ایک دوسرے کے مدمقابل، ٹانگیں پھیلائے ساکت ایستادہ ہو کر، ایک بازو پشت کی جانب کر کے، صرف ایک بازو سے صرف سر اور چہرے پر وار کرتے تھے۔ جب کسی کے چہرے پر زخم آ جاتا تو اس کا معائنہ کیا جاتا۔ بعد میں ان زخموں میں ٹانکے لگائے جاتے اور ان کے نشانات قابل فخر سمجھے جاتے۔ ان مقابلوں میں یہ بڑی ذلت کی بات سمجھی جاتی تھی کہ کوئی فریق سر کی جنبش سے خود کو بچانے کی کوشش کرے۔ ایسے نوجوان کو جنگجو بھائی چارے کی انجمن سے بےدخل کر دیا جاتا۔ اس کی رپورٹ میں درج کیا جاتا "غیر تسلی بخش"۔

مجھے تعجب ہوا کہ وولف گرونڈمین اس لفظی ترکیب سے آشنا تھا۔ اس نے کہا "ہم یہودیوں کو غیر تسلی بخش قرار دیا گیا تھا۔"

میں گڑبڑا گیا کہ اس بات کا کیا جواب دوں۔ میں نے کہا "یہ تو ایک طرح کے کھیل ہوتے ہیں جس میں پٹے کا برادرانہ استعمال کیا جاتا ہے۔ زخموں کے نشان شجاعت کے ثبوت سمجھے جاتے ہیں۔"

وولف گرونڈمین نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا "ہاں، افریقی بھی اپنے چہروں پر نشان گودتے ہیں مگر کم از کم وہ پھول پتیاں تو بناتے ہیں۔" آخرکار اس نے مجھے بتایا کہ اس تمام تاریخ سے وہ خود واقف ہے۔ اس کا باپ اپنی نوجوانی میں اسی قسم کی یہودی جنگجو انجمن کا رکن رہ چکا ہے۔ یہ نظامی انجمنیں تھیں۔ غالب جرمن قوم پرست جنگجو انجمنوں کے برتاؤ نے یہودیوں کو اکسایا تھا کہ انھوں نے بھی جنگجو انجمنیں تشکیل دے لی تھیں۔

"لیکن" اس نے تلخی سے اضافہ کیا۔ "ان میں شراب نوشی کے گیت وغیرہ نہیں گائے جاتے تھے۔ ان کا مقصد تلوار بازی سیکھنا تھا۔ کوئی ماہر پھکیت شمشیرزنی سکھاتا تھا۔ اسے سیکھنے کے لیے پھرتی اور حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی تھی۔ جرمن لڑکے ان ماہر شمشیربازوں سے الجھتے ہوئے گھبراتے تھے۔" اس نے ہنس کر کہا "اسی لیے انھیں غیر تسلی بخش قرار دیا گیا تھا۔" یہ بات اسے اس کے باپ نے بتائی تھی۔ وہ خود اپنی انجمن کے سب سے ماہر شمشیرزن رہ چکے تھے۔

"تم بھی پھکیت سیکھو گے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی میرا دماغ خراب ہوا ہے؟" وولف گرونڈمین نے کہا۔ "مجھے اپنے ہاتھوں کی کسی اور کام کے لیے ضرورت ہے۔"

اس وقت میں ٹھیک سے جان نہ پایا تھا کہ وولف اپنے ہاتھوں سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ مگر وہ اپنے ہاتھوں کا خاص خیال رکھتا تھا۔ اس عمر کے لڑکے جن ہنروں میں ماہر بننا چاہتے ہیں وولف کو ان میں ذرا دلچسپی نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ گھڑسواری کا شوقین نہ ہو گا۔ یوں بھی مجھے اصطبل کے کسی سائیس سے یہ کہتے ہوئے شرمندگی محسوس ہوتی کہ کسی یہودی لڑکے کے لیے گھوڑا کس دے۔ لیکن وولف کو لڑکوں والے دوسرے شوق بھی نہ تھے۔ نہ وہ درختوں پر چڑھتا، نہ پتھروں سے نشانہ باندھتا، نہ شاخیں چھیلتا۔ فٹبال اور ہینڈبال بھی اسے پسند نہ تھے۔ وہ تو منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹی تک نہیں بجاتا تھا۔ اس کے سامنے مجھے اپنی ساری مہارت مضحکہ خیز لگتی۔ ہم دونوں ہم عمر تھے لیکن ایک میں تھا کہ تعلیم بالغ طبقے میں شمولیت کے امکانات وجود میں لانے کے لیے امتحان میں کامیاب ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا، دوسری طرف وولف ابھی سے اچھا خاصا دانشور لگتا تھا۔

عرصے تک میں وولف کو اپنے رشتے داروں کے گھر لانے کا فیصلہ نہ کر سکا۔ اس کے گھر میں کئی بار گیا۔ جہاں ہر کمرے میں چھت تک کتابیں اور کاغذ بھرے تھے۔ گھر کا ساز و سامان تو بالائی طبقے جیسا تھا۔ سیاہ بھاری فرنیچر جس کی گدیوں پر پلش کا کپڑا چڑھا تھا۔ بھاری ریشمی پردوں کو شکاری سے چنٹیں دے کر اور نکتے لگا کر آویزاں کیا گیا تھا۔ اس کے موجودہ گھر میں کمتر طبقات کی رہائشی کالونی سے مشابہت بالکل تھی۔ الماریاں اور میز کرسیاں گزشتہ صدی کے جرمن طرز پر گہری کندہ کاری سے مزین تھیں۔ یہ مجھے پسند آنی چاہئیں تھیں (ہمارے بچوں کی طرح میں بھی بدذوق تھا)۔ لیکن یہ فرنیچر درحقیقت اعلیٰ درجے کا نہ تھا۔ جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا اور کندہ کاری بھی نفیس نہیں تھی۔ گھر بھر میں ہر ممکن سطح پر کتابوں اور کاغذات کا انبار تھا۔

وولف کا کہنا تھا کہ اس انبار میں بعض نایاب کتابیں شامل ہیں جو مصنفوں نے اپنے دستخطوں کے ساتھ ڈاکٹر گرونڈمین کو دی تھیں۔ اس کے علاوہ [illegible] وسطی سے اب تک

یہودیوں پر ستم ڈھانے کے حدود و شمار جمع کیے تھے کہ کوئی اس موضوع پر لکھنے کی جرأت کرے تو اسے اس ذخیرے سے [illegible] اور لاتعداد معلومات میسر ہو سکتی تھیں۔

مجھے ڈاکٹر گولڈمین پسند نہ تھے۔ ان کا چہرہ [illegible] کی طرح [illegible] جیسا تھا۔ سرخ بال، جیسے [illegible] ابتدا میں کمزور رہی ہوں۔ مجھے ان کی [illegible] باتوں سے ایک خوف محسوس ہوتا تھا جو [illegible] مچھلی کی پشت کی مانند [illegible] تھے اور شیر کے بالوں جیسے سرخ بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ [illegible] گولڈمین [illegible] نہیں چھپے نہ تھے کیونکہ چچا [illegible] کی خاطر [illegible]

جرمنی میں رولف کے [illegible] کی وجہ سے نکلا۔ ایک دن جب ڈاکٹر گولڈمین مریضوں کو دیکھنے باہر گئے ہوئے تھے [illegible] کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں استیاسی موجود تھا۔ اسے دیکھ کر میں ہڑبڑا کر رہ گیا۔ وہ کتابوں کے ایک شیلف پر جھکا ہوا تھا۔ دانتوں میں پنسل دبائے وہ غور سے کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس کے خمدار سرخ ہونٹوں پر پرسکون تبسم تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے ہمیں نہیں دیکھا۔ وہ زیرلب کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اس کے خوبصورت چہرے کو اس کی اصلیت میں دیکھا۔ [illegible] حسین چہرہ تھا۔ [illegible] اس کی آنکھوں میں دانائی کی سی کیفیت [illegible] نظر آتی تھی جب وہ مخصوص [illegible] کیفیت خود پر طاری کر لیتے۔ [illegible] کی رٹ لگاتا اور مکروہ نظر آنے لگتا۔

ہم دونوں جیسے خودبخود الٹے پاؤں واپس کمرے سے نکل آئے۔ میں نے پوچھا "کیا یہ اکثر یہاں آتا ہے؟" مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر گولڈمین کے گھر استیاسی کی آمدورفت برسوں سے ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس گھر میں وہ میرے رشتہ داروں کے گھر کی نسبت کہیں زیادہ اپنائیت محسوس کرتا ہے۔ مگر مجھے [illegible] تھا کہ چچا یوسف اور چچی [illegible] کو اس بات کا علم نہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ اچانک مجھ سے یہاں اپنا آمنا سامنا ہونے کا ذکر نہیں کرے گا۔

اس لیے میں حیران رہ گیا جب دوسرے وقت کے کھانے پر استیاسی نے بہت اہتمام سے میری جانب رخ کر کے بہ آواز بلند کہا [illegible]

مگر میں یہ بات [illegible] کہ قوم پرست جرمنوں کے حلقوں میں یہ بات پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھی [illegible] نہ جائے۔ لیکن میں کون ہوتا ہوں جو یہ بتاؤں کہ دراصل ہمارے قدیم ہیرو [illegible]

ملکوں کو آزاد کرانے کی جنگیں لڑیں، اس بات کی فکر نہیں کرتے وہ پورے ملک کو آزاد کرانا چاہتے تھے اور اس کا مطلب یہی تھا کہ ان ملکوں میں رہنے والے یہودی بھی آزاد ہو جائیں۔ ہماری تاریخ کے اصل سورما یہودیوں کو گھیٹو میں محبوس کرنا ہرگز برداشت نہ کرتے۔"

جرمن قوم پرست [illegible] کا اشارہ واضح طور پر چچا یوسف کی طرف تھا۔ چچی [illegible] کی طرح [illegible] کی مدد کو [illegible] کہا "بچوں کو ایسی پیچیدہ باتوں [illegible] مت بناؤ۔" پھر انہوں نے اضافہ کیا "وہ ہم جیسا ہی ہے۔ [illegible] اپنی فطری رجحانات کی تکمیل کریں [illegible]

یہ اشارہ چچا یوسف کی طرف تھا کہ وہ یہ قوم پرستانہ باتیں [illegible] کے زیر اثر کہیں یہودی لڑکے سے میری دوستی پر اعتراض نہ کریں۔ لیکن چچا یوسف جو [illegible] اور پھر یہود دشمنی میں تو ان کا مذاق [illegible] آنکھیں چمکاتے ہوئے کہنے لگیں "[illegible] گولڈمین [illegible]"

اس طرح وہ گفتگو [illegible] کچھ اضافہ کیا۔ کیونکہ یہ [illegible] گولڈمین کے گھر [illegible] رشتہ داروں کی [illegible]

[illegible] گولڈمین [illegible] تھا جو اس زمانے میں روس کا [illegible] ان کا باپ [illegible] اور عملی یہودی مذہبی رہنماؤں میں سے تھا جو [illegible] استیاسی نے اس پر کہا "وہ اخلاقی اور مذہبی مسائل میں [illegible] ہماری [illegible] بہت ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں جبکہ ان یہودی [illegible] کی تحریریں ہم [illegible] انداز کرتے آئے ہیں [illegible] ہم سے قریب تر ہو سکتے ہیں اور جو ہمارے پاس رہتے ہیں۔"

[illegible] گولڈمین [illegible] ثابت ہو [illegible] جرمنی ہجرت کی، موسیقی کے رسیا گولڈمین نے جرمنی میں رچرڈ واگنر کی موسیقی [illegible] دوسری طرف [illegible] دولت [illegible] اس کے [illegible] کا ذریعہ [illegible] تھا۔ استیاسی نے [illegible] اس بات کو تسلیم کرنے پر کوئی مشکل ہی سے آمادہ ہو گا مگر یہ

Scanned with CamScanner

ایک تاریخی حقیقت ہے گولڈاسمتی کی طرح بہت سے یہودیوں کی دولت و ثروت کی
کوئی راسخ کی بنیادیں رکھنے میں خرچ ہوئی تھیں۔* چچا سموئیل نے لکھر جوزف کے مداح ہوں
بھی تھے اور قربانیاں بھی دیتے تھے دونوں کام ساتھ ساتھ۔ چچی سوفی نے ہاں میں ہاں
ملاتی "جوزی ٹھیک کہتے ہیں، پیسہ بنانا تو کوئی یہودیوں سے سیکھے۔"

وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ بڈھا گولڈاسمتی اپنے منتخب وطن جرمنی کو چھوڑ کر روحی خوشحالی کے اس مثالی خطے میں مرینشوں کے کاروبار کرنے نیویارک آ رہے ہوں اور کیسے اس نے یہاں اپنا مضحکہ خیز، خوشحالی کے نمونے جیسا گھر تعمیر کیا۔ استہاسی کا کہنا تھا کہ اس نے مشتبہ کی انکار سے ایسا پرخروش سمبندھ قائم کر لیا کہ وہ واگنر کا منکر ہو گیا۔ وہ بسمارک کی مطلق العنانی سے بھی بیزار ہو کر جرمنی سے نکل آیا تھا، مگر اس کے گھر کا جارحانہ جرمن قوم پرستانہ طرز تعمیر اس خیال کی تردید کرتا تھا۔ یہ بوالعجبی ہی تو تھی کہ بسمارک کے خلاف الخشی علاقے میں یہ طرز تعمیر نمودار ہو اور اسے بیابینیل متعارف کرنے والا ایک یہودی ہو۔ وثوق سے صرف یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ ان چچا ہیوبی کے والد کو پسند نہیں آئی تھی جو بےحد قدامت پرست سٹریٹلی تھے اور آسٹریا کے قیصر جوزف فرانز کی تابعداری کو گویا عبادت گردانتے تھے۔ مطلق العنانی پدرانہ نظام کی لیے ان کی اطاعت کیتھی بسمارک کے اوبی حقوق شہنشاہیت سے کئی گنا زیادہ تھی۔ ایسے شخص کو ایک ایسا یہودی جو جرمن قوم پرستوں کی نقل کر رہا ہو تو مکروہ تضادات کے امتزاج کے سوا اور کیا نظر آ سکتا تھا۔ یہ ایسا امتزاج تھا جس کی حیرانی کی دعوت فکر سے فرار صرف اس کے وجود کو سراسر نظرانداز کر کے ممکن تھا۔ چچا ہیوبی نے ہچکچاتے ہوئے کہا: "میرے والد کو مجھ سے شکایت ہو گی کہ میرے جذبات ان سے متصادم تھے" چچی سوفی پھر ان کی مدد کو آئیں: "ارے ہیوبی، اس وقت تمہاری عمر ہی کیا تھی؟ مشکل سے اٹھارہ برس کے ہو گے۔ یہ ۱۸۹۰ کی بات ہے اور اب تمہارا اٹھاونواں برس چل رہا ہے، اس وقت تم کوئی سمجھ داری کی بات کیسے کر سکتے تھے بھلا؟"

گو میں نے کبھی اپنے والد سے یہ ذکر سنا تھا لیکن اس وقت میں مشتی کے فلسفے کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا تھا، نہ میں بسمارک کی مطلق العنانی اور اس سے پیدا ہونے والے ردعمل کو سمجھ سکتا تھا، لیکن اتنی بات میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ اس پوری صورت حال میں تضادات ایک عجیب و غریب طریقے سے مستقل مشترک تھے اور حماقتوں کی سوجھت سے بیادلہ ہو رہا تھا۔ بڈھا یہودی گولڈاسمتی بس ہر طرح کا جرمن قوم پرست تھا۔ اس نے اس کے بیٹے کو حصول تعلیم کے لیے ویانا اور پیرس بھیجا۔ اس کی آرزو تھی کہ اس کا بیٹا ان علوم اور فنون کا مطالعہ کرے جن سے وہ خود محروم رہ گیا تھا اور جو اس کے خیال میں کل عالم انسانیت کی نجات دہندہ ثابت ہوں گے۔ تقدیر کا کرنا یہ ہوا کہ ان کا سپوت ان شہروں میں جرمنوں کے تعصب کا شکار بن کر سردمہری سے صرف علم

طب کا حصول کر کے واپس لوٹا تو اس نے اعلان کر دیا کہ وہ یہودیوں کے لیے علیحدہ ریاست کا حامی بن چکا ہے اور صیہونی ہو گیا ہے جبکہ یہ کہ اس نے ارض وسطیٰ سے یہودیوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کے اعداد و شمار جمع کیے ہیں۔ بڈھا گولڈاسمتی بیٹے کا منہ تکتا رہ گیا۔ ساری عمر اس نے جرمنوں اور یہودیوں کے اتحاد کی کوشش میں گزار دی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہودی دوسرے مذاہب کے پیروکاروں اور دوسری قوموں کی مذہبی جنونی کی بانہوں سمیت جیتے رہے ہیں۔ اس کی آرزو تھی کہ اس قسم کا جنونی یہودیوں میں کبھی پیدا نہ ہو۔

گفتگو کے اس مقام پر استہاسی جذبات کی رو میں بہہ نکلا کہ اس نے وہ مکروہ خلاصہ نقاب بالکل اندر پھینکا جو وہ عام طور پر اپنے چہرے پر مسلط کیے رکھتا تھا۔ اس کی شخصیت کے نفیس ترین پہلو عیاں ہو گئے۔ اس کا چہرہ حسن سے دمک اٹھا جس کا میں وہ بہیں سمجھا رہا تھا کہ بڈھا گولڈاسمتی بھی نرمی پسند انسانی دوستی خیالات کا علمبردار ہونے کے لیے اس علاقے کو مناسب ترین گردانتا تھا جہاں پہلے سے وافر نسلی تنوع موجود تھا۔ وہ قیصر ولہیم کی اس قوم پرستی سے متنفر تھا۔ اس کے خیال میں اس کے نسخۂ حیات کے لیے جہاں کسی کی سرکار نہیں کیونکہ قدیم سلطنتی نظام میں متنوع مذاہب، زبانوں، قومی تشخص اور نسلی عادات کی ذرہ بھی بقائے باہمی قائم رکھنے کی گنجائش رکھی گئی تھی، لیکن جب استہاسی نے ہمیں باور کرانا چاہا کہ گولڈاسمتی کی رہائش گاہ کی رومانی بسمارکی طرز تعمیر کو ہم اسی نظر سے دیکھنے کی کوشش کریں تو وہ دوبارہ اپنے طنزیہ "میں کوئی ہوتا ہوں" والی طرز گفتگو میں پلٹ آیا۔ معمولی ہوئی آنکھوں اور مزیدار مسکراہٹ کے ساتھ اس نے وضاحت کی کہ ہمیں اس طرز تعمیر کو محض ایک بمصداق نودولتیے یہودی کی گستاخانہ جرأت سے تعبیر نہیں کرنا چاہیے جس نے مشکوک ذرائع سے چلتک دولت حاصل کر لی ہے۔ یہ رومانی جذباتی مینار اور کنگورے اور محرابیں دراصل ایک اعلیٰ شجاعت افروز تمدن کی آرزو کی نشاندہی کرتے ہیں جس کی جگہ، بہ صد ملال، ایک بورژوا، بیہودہ حریصانہ طرز زندگی نے لے لی ہے۔

چچا ہیوبرٹ شگفتہ مزاجی کی لہر میں اس پھبتی کو بھی یکسر نظرانداز کر گئے۔ ویسے بھی کسر نفسی کی عادت تھی۔ ایسے میں وہ شاذ ہی براہ راست کچھ بولتے تھے۔ ان کی مبہم سی کچھ گفتگو کے لیے چچی سوفی کو اکثر ٹوکنے میں پڑتی تھی۔ "کیوں ہیوبی، تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ کہتیں۔ مگر جب وہ بولتے تو ان کی گفتگو غیرمعمولی حس اور بےپناہ قوت مشاہدہ کا اندازہ ہوتا جو استہاسی کی تصویرپرستانہ، پیچ دار اور منطقی گفتگو سے زیادہ کارگر تھی۔ اس بار بھی چچا ہیوبرٹ کی ظرافت نے اپنا کام دکھایا۔

چند چھوٹے چھوٹے جملوں میں انہوں نے ۱۸۹۰ میں قیصر فرانز جوزف کی پچاس سالہ جشن تاج پوشی کے تہوار کی تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ مشرقی یورپ کے کسی گوشے

(تحصیل) میں سرکاری تقریب کی تمام حماقت افروزیاں، آگ بجھانے والے رضاکاروں کی پریڈ کا استثار صرف علامت کے طور پر چند یہودیوں کی بھی جمع میں شمولیت۔ جن کی ٹوپیاں موٹا ماکوں تک پہنچی جاتی ہیں اور پاجامے گھٹنوں سے اوپر چڑھے ہوئے ان کے پس منظر میں شرابور شہر کی سرحدی چوکی ہوتی میں پوسٹروں تحریریں، جس میں ہر بات دوہرائی جاتی۔ کمرہ ہال کی دیواروں کی مانند پھولوں سے پر ہر طرف شہر میں ان کے تحریے چسپاں کیے۔ چچا یہودیت کی باپ نسبت میں ہے۔ معتمد شہنشاہ کی حکومت کے سماجی معاشرے کی مسرت سے ممیکی ہیں۔ محروس ان کو دھڑا دھڑ ہر طرح تحسین پیش کر رہے ہیں اور وہ دوسروں پر اعزازات کی بارش کر رہے ہیں۔ اعزازی انعام جس کی فوراً بعد وہ مشرقی و مغربی اور پادری کی محبت میں قانونی ہال کا رخ کرنے والے ہیں کہ بوڑھا گوانڈمین ہی کا راستا روک لیتا ہے۔ مجھے یاد آیا، وولف نے اس کی کس طرح میرا راستا روک لیا تھا جب میں اپنا رنگ برنگا ملبوس زیب تن کر کے چہل قدمی کر رہا تھا۔ تصور میں میں نے بعض گوانڈمین کو بالکل اسی حالت میں دیکھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی ہیں اور بھی خود مصداق بدھا یہودی قصبے میں دور رہ گئی ہیں۔ اس کا علم سب مکان دار عرصے سے موجود ہے۔ ایسی عجیب و غریب حالات کی بندش وہ اب تک مرکزی میں گھل مل نہیں سکا۔ وہ محسوس کر رہا ہے کہ اس تنہائی کو ختم کرنے کا وقت آج ہی آ گیا ہے کیوں نہ ہو، جو ایک ایسے شہنشاہ کی جشن تاج پوشی کا موقع ہے جس کی شفقت کے زیرِ سایہ سب قومیں، نسلیں اور مذاہب بحفاظت رہ سکتے ہیں۔

اس دیہاتی منظر کا ذکر کرتے ہوئے چچا یوبرٹ ہنسی نہ روک سکے۔ "پھر جب میں یاد کرتا ہوں تو پاتا ہوں کیسے اس یہودی اور اس کے عقب میں کھڑی اس کی موٹی عورت نے جھک کر دیکھا تھا۔ وہ یہودی بوڑھا جو سر پر ٹوپی دیے ... ہر مرتبے پر سری کہ اس مسعود موقعے پر میں اپنا تعارف کرا سکتا ہوں؟ ساؤل گوانڈمین میرا نام ہے۔ ہو سکے اس وقت سے تو یقیناً واقف نہ ہوں گے کہ گزشتہ چند برسوں سے اس ایالت میں چھکا ہوں اور اس برادری میں، جس کا میں ہر لحاظ سے حصہ ہی بننا چاہتا ہوں، میں نے اپنا مکان کھڑا کیا ہے۔ گوانڈمین کی زبان اور لہجہ درست نہ تھا۔ وہ یہودیوں کی مخصوص ملاوٹ میں بولتا تھا۔ اس لہجے میں مکان کا تلفظ پاجامے کا ہم معنی سنائی دے سکتا تھا۔ اور پاپا وہ میئر کی جانب مڑے اور کہنے لگے، کیا کھڑا کیا ہے تم نے اپنے پاجامے میں؟ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ یہودی اپنی موٹی عورت کو پیچھے لیے کھڑا رہ گیا۔ بہت نیچے سے نکلنے والی ٹانگوں اور خم دار مرکزی والی شرارتوں جیسے اپنا سا منہ لیے کھڑا رہ گیا۔

ہمیشہ کی طرح چچا سول نے تائید کی مگر بھی بدھا گوانڈمین جسے تم نہیں جانتے تھے لگتا ہے کہ وہ شیلو کی طرح پیسہ ہی لے کر آیا ہو، اس سے کہا ہوتا ہے کہ میری بھی نسل ہی نہیں، موتی تو دیکھی۔"

ابھی تک مجھے گوانڈمین کے گھربار میں کسی عورت کے وجود کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ بدھو کی بیوی کے ذکر پر پہلی بار خیال آیا کہ یقیناً اس خاندان میں کچھ عورتیں بھی ہوں گی۔ مجھے یوں ہی سا یاد تھا کہ گوانڈمین کے پہلو پر موسیقی کے کاغذوں کے ڈھیر کے پاس میں نے ایک عورت کی تصویر رکھی دیکھی تھی، مگر مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ یہ وولف کی ماں ہو سکتی ہے۔ چند دن بعد جب چچی سولی نے وروانے ڈاک سے سیباسٹین کے نام کا ایک خط مجھے اس کے کمرے تک پہنچانے کے لیے دیا تو میں نے چاندی کے فریم میں جڑی وہی تصویر اسٹیباسی کی میز پر رکھی دیکھی۔ یہ ایک عام سا چہرہ تھا کانوں تک پھیلے ہوئے بال۔ حساس عورت اور گہری سی نگاہیں۔ اس زمانے میں اس انداز کی تصویروں کا رواج تھا۔ میں نے سمجھا تھا شاید کسی اداکارہ کی تصویر ہے پھر مجھے خیال آیا کہ یہ تو وہی ہے جس کی تصویر میں نے وولف کے گھر دیکھی تھی۔ دوسری بار ملنے پر میں نے وولف سے پوچھا "یہ کس کی تصویر ہے؟" وولف نے سپاٹ لہجے میں کہا "جس نے مجھے جنم دیا۔" مجھے شک شاید میں ٹھیک سے اس کا مطلب نہیں سمجھا اس لیے میں نے پھر پوچھا۔

"تمہارا مطلب ہے تمہاری ماں؟"

"اور کون؟ ماں نہیں تو کیا باپ؟"

"تو کیا تمہاری کا انتقال ہو گیا؟" میں نے "گھڑا ہوا سا سوال" کیا۔

"خدا نہ کرے وہ کیوں مرتی۔"

"میں نے تو انہیں یہاں کبھی نہیں دیکھا۔"

"طلاق ہو گئی ہے۔ وہ ویانا میں رہتی ہیں۔ وانسر کے اڈے میں معروف ساری کی شعبہ کی صدر ہیں۔"

"اسٹیباسی انہیں پسند کرتا ہو گا اس کی میز پر ان کی تصویر رکھی ہے؟"

"ہاں۔" وولف نے بے پروائی سے کہا۔ "وہ ان کے عشاق میں سے ایک ہے۔ سب سے مشہور پیٹر آلٹن برگ تھا۔"

میں پیٹر آلٹن برگ کو نہیں جانتا تھا۔ پھر بھی وہ جس طرح اپنی ماں کے بارے میں بات کر رہا تھا اس نے مجھے بھونچکا کر دیا۔

"تم ان سے ملتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جب ویانا جاتا ہوں تب۔" اس نے سکون سے جواب دیا۔ پھر ایکاایکی اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "خیر، اب تمہیں رخصت ہونا پڑے گا مجھے کام ہے۔"

یہ پہلا موقع نہیں تھا جب کہ وولف نے اس طرح اچانک ہماری ملاقات کو منقطع کر دیا ہو۔ عام طور پر، میرے خیال میں، جب میری کسی حماقت پر اس کا پارہ چڑھ جاتا تو وہ ایسے ہی کرتا تھا۔ میں نے کبھی اس سے پوچھا نہیں تھا کہ اسے کیا کام ہے۔ مجھے

معلوم تھا کہ میں ہوم ورک نہیں کرتا۔ وہ کسی مضمون کی بہتر کارکردگی پر ... لیکن جس ثابت قدمی سے وہ مجھے پڑھا دیتا تھا اس کا مجھے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ میں بیزار ہو کر فاور میں سکول کے حساب پڑھنے لگتا۔ میکس میرا ... مجھے میرے قدموں میں بیٹھا رہتا۔

کبھی کبھی وولف گولڈمین کی صحبت سے میں اوب جاتا۔ اس کی ناقابل تسخیر خوداعتمادی سے میرے جذبات کو ٹھیس لگتی تھی۔ بڑی سے بڑی بات کی جانب اس کی بےپروائی مجھے کھٹک محسوس ہوتی۔ مثلاً ... اس قدر سختی سے یہ کہہ ... اس کے باپ کی بجائے ... کی محبوبہ ہے ... کی مردوں کی محبوبہ ہے ... میرے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا کر دیتا تھا۔ جس طرح اسٹیلنی کی مردنی زدہ مسکراہٹ مجھے منتشر کر دیتی تھی۔ ... سیاست کو جب بھی کوئی ... پسند عقیدہ پاش پاش ہو جاتا تو وہ بات شروع کرنے سے پہلے ... پر وہی مردہ مسکراہٹ چسپاں کر لیتا تھا۔ میں اس رویے سے ... سا ہو جاتا تھا۔ مگر یہ باتیں مجھے اکھڑی بھی نہیں کیوں کہ وہ مجھے ... معتقد ... میں دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ آخر میں نے طے کر لیا کہ گولڈمین کی اور ہمارے گھرانوں میں جو سماجی فاصلہ ہے اسے ختم کرنے کی کوشش نہیں کروں گا ... اسے اپنے رشتہ داروں کو گھر مدعو کرنے کی کوشش کروں گا۔

لیکن ایک دن میری کوشش یا مرضی کے بغیر ایسا خودبخود ہو گیا۔

... چند ہفتوں میں ... جس سے میں اپنے ... دوست کو مرعوب کرنے کی توقع رکھتا تھا چچا ہیوبی کی ڈیمسلر کار ... جو ... ان کی ... نہیں۔ اس کے رنگ کا ... چمکیلا پن ... کی مناسب ... کی جگہ سے مماثل ... کی جسامت کا ... ہر چیز میں ایک واضح ... قسم کی کشش موجود تھی ... بات جو آج کی ... لانے پر کثیر تعداد میں ... کی کاروں میں ... لیکن وولف گولڈمین ... سے متاثر نہ ہوا اور بولا: "کار میں ایسی کیا خاص بات ہے؟ اگر میرے والد چاہیں تو وہ بھی خرید سکتے ہیں۔ مگر ہمارے قصبے کی سڑکوں کو دیکھتے ہوئے تو کار رکھنا پاگل پن ہے۔"

اس کی بات اتنی غلط بھی نہ تھی۔ کار اکثر اصطبل کے ایک ملحق حصے میں کھڑی رہتی تھی اور عموماً ہم آمدورفت کے لیے ... استعمال کرتے تھے۔ ... کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ چچا ہیوبی اور چچی ... اس میں سوار ہو کر ... تک جاتے ... کا موقع تو اس سے بھی کم آتا تھا۔ اس کے باوجود وولف اس بات کو جھٹلا نہ سکا کہ اسے بھی کار میں ایک لذت آمیز کشش محسوس ہوتی ہے۔ یہ ... اور تسلط کی علامت تھی، اور ... کی کہانیوں کے جادوئی قالین کی طرح وقت اور فاصلے پر اختیار بخشتی تھی۔

بوڑھے گیب کو جو شہر لے جاتا تھا ... کار کے ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دیتا ہے

بہادر شہسوار سے چھیڑچھاڑ کرنا، اس کا اسٹیرنگ گھمانا اور ہارن جیسا باجہ بجانا، جو اس موٹر کار کے باہر لگا ہوتا تھا، پسند نہ تھا۔ اور وہ ہمیں اصطبل کے ملحق حصے کی جانب ... میں ... کرتا تھا۔ وہ اور ... کار کے انجن اور بیرونی حصوں کی دیکھ بھال میں لگے رہتے تھے۔ جو نئی کار کی طرح چمکتی رہتی تھی اور جب چلتی تو یوں لگتا تھا جیسے ... کارخانے سے تیار ہو کر نکلی ہو۔ چچا ہیوبی اسے ... حالت میں رکھنے پر اصرار کرتے تھے۔ لیکن میں نے اصطبل اور ... کی کوٹھڑی کی درمیانی دیوار میں ایک روشن دان کا سوراخ لگا لیا تھا جہاں سے کم از کم جھانکا تو ضرور جا سکتا تھا۔ اسی طرح اگر ... گیب سے چابی مانگتے تو دل نہ چاہتا تو ہم ... کی کوٹھڑی کی طرف سے چڑھ کر روشن دان تک پہنچ جاتے اور ... سے آدھے باہر لٹک کر ... پر نظر ڈالنے میں کامیاب ہو جاتے۔ اور اس کی تکنیکی خصوصیات اور خوبیوں پر دیر تک بحث کرتے رہتے۔ دروازے کے باہر لگا ہوا ... کی شکل کا ہارن وولف کو بہت قدیم انداز کا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے محض تفریح طبع کی خاطر جیب سے غلیل نکالی اور ہارن کا نشانہ لیا۔ ... کے چھرے کے ٹکرانے سے تانبے کے ہارن نے ایک مختصر مگر تیز آواز پیدا کی۔ گیب جو کہیں آس پاس ہی تھا، جلدی سے تالا کھول کر اندر آیا اور پوری گاڑی کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ ہارن بجانے والا کون تھا۔

رفتہ رفتہ اس نے ایک کھیل کی شکل بدل لی، جو ہمیں ... کی طرح مصروف کرتا تھا ... طویل ... بھی معلوم ہوتا کہ گیب یا پالر ... موجود ہے، میں غلیل کا چھرا زور سے ہارن پر مارتا، جس سے پیدا ہونے والی آواز ان میں سے کسی ایک کو تالا کھول کر اندر آنے اور ... کا جائزہ لے کر ہارن بجانے والے مخفی بھوت کا پتا چلانے کی کوشش کرنے پر مجبور کر دیتی ... ہم ... چھپے ... کوشش کرتے رہتے۔ جب یہ ناکام تحقیقات اپنے انجام کو پہنچ جاتیں تو میں ایک بار پھر جیب سے غلیل نکالتا اور سارا قصہ پھر سے شروع ہو جاتا۔

ایک بار ایسے میرا ایک چھرا پالر کے ہاتھ آ گیا۔ وہ یقیناً اسے پہچان گیا ہو گا، کیوں کہ یہ چھرے ... کی بجلی کے ... ہوتے تھے۔ اس نے اسے اپنی جیب میں ڈال لیا، اور ہم نے نتائج کے انتظار میں اپنا کھیل روک دیا۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا اور ہم نے اسے دوبارہ شروع کر دیا ... میں خصوصاً بوڑھے گیب کے معاملے میں اتنا بےباک ہو گیا تھا کہ جوں ہی وہ اپنی ناکام تلاش ختم کر کے جانے کے لیے مڑتا تو میں ہارن پر دوسری بار نشانہ ... دیتا، وہ برق کی طرح ... ہو کر پلٹتا جیسے کار خودبخود چل پڑی ہو اور ہارن بجا کر اسے راستے سے ہٹنے کو کہہ رہی ہو۔

بوڑھے گیب کی سادہ لوحی ہمارے لیے تفریح کا بیش بہا سامان تھی۔ غالباً پالر نے اسے اپنی

Scanned with CamScanner

دریافت کے بارے میں بتانا بھول گیا تھا یا پھر وہ کسمپرسی سے انتظار کر رہا تھا کہ گپ اس معاملے کا خود پتا لگائے۔ لیکن گپ کو ہماری شرارت کا کچھ اندازہ نہ ہو سکا، اور وہ بدحواس ہو ہو کر ہمیں محظوظ کرتا رہا۔

ظاہر ہے یہ کھیل ہمیشہ تو جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک دن جب گپ کار کا معائنہ کر کے واپس ہو رہا تھا، میں نے بے بسی [illegible] میں وولف نے [illegible] کے باوجود مسئلہ لکھنے سے انکار کر دیا۔ ہاں یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ جب وولف نے میرے ہاتھ سے غلیل لی تو میں نے کوئی خاص مزاحمت نہیں کی۔ اس نے سامنے رکھا ہوا ایک چھرا اٹھا کر غلیل کے ربر والے حصے میں رکھا، پوری قوت سے کھینچا اور نشانہ باندھ کر چھوڑ دیا۔

اتنا تو مجھے اندازہ تھا کہ اس کا نشانہ خطا ہو جائے گا لیکن اس کا چھرا نشانے سے اتنی دور تھا کہ بارش کے آس پاس لگنے کی بجائے کار کے سامنے والے شیشے کے عین درمیان میں لگا۔ چھرے کی ٹکر سے ریزہ ریزہ ہو جانے والے حصے کے گرد پورے شیشے پر مکڑی کا ایک باریک جال سا بن گیا۔

اب چھپنے کی کوشش بے سود تھی۔ "میں چچا عباس سے کہوں گا کہ یہ میں نے کیا ہے" میں نے وولف سے کہا۔ اس کی وجہ میری کشادہ دلی سے زیادہ یہ تھی کہ میں جانتا تھا کہ گاؤں کی ایک یہودی لڑکے کے مقابلے میں میرا جرم کم سنگین سمجھا جائے گا۔

لیکن وولف یہ سن کر بھڑک اٹھا۔ "کیا تم میرے سرپرست ہو؟" اس کا بھورا جیسا چہرہ یوں سرخ ہو رہا تھا جیسے وہ بہت تیز آگ کے روبرو ہو۔ "مجھے کسی عربی سرپرست کی ضرورت نہیں۔ ایک شیشے کی اوقات ہی کیا ہے! میرا باپ اس کی قیمت ادا کر دے گا۔"

"یہ بات اندر جا کر کہنا،" گپ نے کہا، اور وولف کا بازو پکڑ لیا۔

"مجھے ہاتھ مت لگاؤ ورنہ میں اتنے زور سے چلاؤں گا کہ سارا گاؤں اکٹھا ہو جائے گا۔" وولف نے کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو میں ڈر کر بھاگ جاؤں گا؟" یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور میرے رشتہ داروں کے گھر میں داخل ہو گیا۔

نشست میں، جہاں گپ ہمیں چچی سوفی کا انتظار کرنے کے لیے چھوڑ گیا تھا دیواروں پر شکار کے قدیم، جھلملاتے آویزاں دیکھ کر وولف پر دوبارہ ہنسی کا دورہ پڑا۔ "ایسا لگتا ہے اگر میں تم لوگوں کی جگہ ہوتا تو کم ازکم انہیں یوں سرعام تو نہ لٹکاتا۔" پھر اس کی نظر پیانو پر جا پڑی۔ "اوہ! اصلی [illegible] پیانو! یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟"

اس نے پیانو کا سرپوش اٹھایا اور ایک دو سُر بجائے۔ پھر وہ پیچھے سے اسٹول کھینچ کر پیانو کے سامنے بیٹھ گیا اور ایسی مہارت سے بجانے لگا کہ میں ششدر رہ گیا۔

چچی سوفی کمرے میں داخل ہوئیں تو ٹھٹک گئیں۔ جب تک وولف پیانو بجاتا رہا وہ کھڑی رہیں۔ جب وولف ختم کر چکا تو انہوں نے کہا،

"بہت خوب! کب سے بجا رہے ہو؟ کس سے سیکھا ہے؟"

وولف گرینڈ پیانو کی طرف دیکھنے کی بجائے رخصت ہونے کو دوسری سمت رخ کر کے کہنے لگا۔ "عام لوگ شوقیہ سے ہمیشہ متاثر ہو جاتے ہیں۔ آج کل میں برامز پر کام کر رہا ہوں۔"

اس نے پھر ایک دو سُر بجائے۔ پھر چچی سوفی کی جانب مڑ کر بولا۔ "میں نے آپ کی کار کا شیشہ توڑ دیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن پہلے مجھے سلام کرو اور پھر میری بات کا جواب دو۔" چچی سوفی نے ہنس کر کہا۔ میں حیران رہ گیا۔

اور اس طرح پہلی بار مجھے اس جذبے سے میرا تعارف ہوا، رشک سے پیدا ہونے والا حسد جو ایک بدصورت جذبہ ہوتا ہے اور بدطینت خیالات اور خواہشات کو جنم دیتا ہے۔ مجھے اپنی روح میں ایک بار پھر وہی خالی پن محسوس ہونے لگا، اور اسکٹسو نے دوبارہ مجھ پر حملہ کر دیا۔

چچی سوفی گرینڈ پیانو پر فدا ہو گئی تھیں۔ اب یہ روز کا معمول بن گیا کہ ناشتے کے فوراً بعد وولف [illegible] گھر [illegible] پیانو پر مشق کرتا۔ موسیقی کی طربیہ لہروں سے پورا گھر جھوم اٹھتا۔ وولف کے چہرے پر کامیاب عاشق کی سی روشنی رہتی۔ چچی سوفی مبہوت ہو کر اس کا پیانو سنتیں۔ کبھی کبھی وہ خود بھی بجاتیں۔ ان کا چہرہ شرم سے سرخ ہو جاتا۔ "یہ تو بس یوں ہی ہے۔" وہ کہتیں۔ "میرے بجانے میں اس نکھار کو نہیں پہنچا نہیں۔"

مجھ جیسے تیرہ سالہ لڑکے تک کو صاف نظر آ رہا تھا کہ چچی سوفی کی ساری دبی ہوئی بھولی بسری خواہشیں، امنگیں اور امیدیں اس سرخ بالوں والے لڑکے میں مجسم ہو گئی ہیں۔ جب کبھی سری اور چچا مہوت کی تعریف ملتی تو بے تکلفانہ اپنائیت پھوٹ [illegible] ان سطروں میں ابھر آتا ہے ایک دوسرے کی آنکھوں میں ابھرتی چمک سے نفرت صاف پڑھ سکتی تھی جس نے [illegible] اپنائیت کی سوتن ہی میں مہارت کے حملے سے ایک ایسی عورت کے قدم ڈگمگا دیے جو بصورت دیگر اتنی ثابت قدم محتاط، مثالی خاتون تھیں۔ استیاسی کو اپنی طرف دیکھتا پا کر مجھے جھرجھری آ جاتی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میرے احساسات اور خیالات سمجھ رہا ہے۔ یہ بات اتنی عیاں تھی کہ ہر شخص حتیٰ کہ باورچی گپ تک خوب سمجھ رہا تھا۔ صرف چچی سوفی تھیں جو ہر بات سے بےخبر ہو چکی تھیں۔ گونج دار موسیقی میں پیوست ان شاموں کی کشیدگی سب محسوس کر سکتے تھے لیکن اس پورے منظر کے دو مرکزی کردار وولف اور چچی سوفی [illegible] گردوپیش سے بیزار رہتے۔ گپ خود بجانا چاہتا۔ "کھانا ابھی گھنٹے سے تیار ہو پڑا ہے۔" لیکن یہ دونوں پیانو بجاتے رہتے۔ چچا

سویوں کھانسی بکی ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ مجالت سے ہم نے ایک دوسرے سے نظریں ملانا چھوڑ دی تھیں۔

آخر چچی سرفی کہتیں "آج کی پیٹ کافی ہے۔" پھر کسی پر جھنجھلاتیں، "اب تک کھانا نہیں لگایا؟" اور جب وہ بتاتا کہ کھانا دوسری بار گرم کیا جا رہا ہے تو وہ مسز اسمتھ کے شوہر کولڈمین کے لیے بھی ایک پلیٹ لگا دیتیں۔

ایک شام چچا بیوی نے عام سے لہجے میں تجویز پیش کی کہ اگر وولف مستقل طور پر گھر میں منتقل ہو جائے تو زیادہ سہولت رہے گی۔ توقع کے مطابق چچی سرفی نے ان کی تائید کی کہ اس بار ان کا انداز [illegible] تھا اور کچھ کچھ ہچکچاہٹ بھی۔ "کیوں نہیں! بیوی ٹھیک کہتی ہیں، یہ زیادہ اچھا رہے گا۔" اور ہم سب کھڑے چچی سرفی کو وولف کولڈمین کے دبلے کندھوں کے گرد بازو رکھ کر کھانے کے کمرے میں لے جاتی دیکھتے رہتے، اور اس منظر کی معصومیت اور مسکین چہرے کے شدید احساس کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے کھانے کے کمرے میں داخل ہو جاتے۔

ان حالات سے [illegible] خوب لطف لے رہا تھا۔ وہ ایسی کانچ کی سی آنکھوں سے کیپ کی مطالعہ کرتا رہتا جو کھانے کے وقت پہلے سے بڑھ کر ہمارا خیال رکھتا، اس طرح کہ ہماری پلیٹ میں کھانا ڈالتا اور گوشت کے بہتر ٹکڑوں کی طرف آنکھ سے اشارہ کرتا۔ اس کی کوشش رہتی کہ چچی سرفی وولف کی پلیٹ میں خود کھانا نہ نکالیں۔ بیہودہ چھوکرے کو وہ سب سے آخر میں [illegible] پیش کرتا، استہزائیہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہتا "مبارک ہو! وفادار [illegible] نے ابھی [illegible] نہیں کی ہے؟" وہ [illegible] چچا بیوی نے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے اور گریز کر کے کہتے "استہزائیہ! یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

اسی عرصے چچا بیوی کی اور میری پرانی قربت داری کی اپنائیت دوستی میں ڈھلنے لگی۔ [illegible] لڑکے اور ایک عمر رسیدہ آدمی کے درمیان [illegible] تعلق تھا جو ہم عمروں کے رشتوں کی شدت جذبات اور پیچیدگیوں سے مبرا ہوتا ہے۔ اس میں ایک جانب صرف شفقت ہوتی ہے اور دوسری جانب صرف بھروسا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ سیر پر لے جانے لگے۔ مجھے بھی ان کے ساتھ [illegible] بہت پسند تھا۔ اس کا باعث صرف یہ نہ تھا کہ مجھے کاؤنٹ سے دور کی جانشینی [illegible] تھا۔ ان کی نصیحتیں اور حکایتیں میں پوری توجہ سے سنتا تھا۔ ان کی تمام زندگی گھوڑے کی پیٹھ پر گزری تھی۔ گھڑسواری ان کے لیے ایک مذہب بن گئی تھی۔ وہ بہت ہی ماہر شہسوار [illegible] ان کے اعضا میں حرکت میں [illegible] یہ خیال بھی میرے لیے [illegible] تھا کہ میں [illegible] چھوکرے مجھے چچا بیوی کے ساتھ گھڑسواری کرتے ہوئے دیکھیں گے [illegible] جائے گا کہ میرے پیچھے کتنی بڑی طاقت ہے۔

رفتہ رفتہ میں نے وولف اور چچی سرفی کے [illegible] رشتے کی جانب [illegible]

[illegible] کر [illegible] میں وولف کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرتا، جو میرے خیال میں اشرافیہ کے لیے مناسب تھا۔ [illegible] ایک بار میں نے وولف کو پھر سیر چچا (نو کے دو بجوں کو دیکھنے) کی دعوت دی۔ اور وہ جھنجھلا کر بدتمیزی کرنے لگا۔ "ہم جرمن جانوروں کی کسی شوقین [illegible] سے زیادہ جانوروں کے بارے میں جانتے ہو کیا؟" [illegible] کھول [illegible] بہت کچھ [illegible] مدارات سے فیض یاب ہو کر وہ پھر کے بارے میں کچھ بھی [illegible] سے [illegible] تھا۔ جو [illegible] وولف بے شرمی سے ہنسا اور کہنے لگا "میں تم لوگوں [illegible] جانوں جو تمہاری چچی [illegible] [illegible] سمجھ رکھنے کی کتابیں پڑھی [illegible] گھوڑے کی پیٹھ پر [illegible] سارا [illegible] ساری مبارک [illegible] مگر [illegible] میں [illegible] کو پڑھ رہا ہوں۔ [illegible] پڑھنے سے تو سہارا بھی بھلا ہو گا۔ شاید تمہاری سمجھ میں آ جائے کہ تمہارے چچا جو کسی گھوڑے پر بیٹھ کر [illegible] وہ اصل میں تم سے چاہتے کیا ہیں۔"

[illegible] وولف نے خود ہی مجھے سمجھایا۔ چچا بیوبرٹ پر سب کو فوجی ہونے کا شک تھا۔ [illegible] تھا کہ ان کی شکاری دوست جو تاؤں میں ٹھہری ہے [illegible] سے [illegible] رشتے دار قصبے والوں کو [illegible] کو جنس [illegible] کے [illegible] اشتہار سمجھتے ہیں۔

[illegible] چچی سرفی سے ان کی اتنی مثالی، کامیاب شادی؟ کیا تم سچ مچ اتنے احمق ہو [illegible] [illegible] سے [illegible] گھر میں [illegible] چچی سرفی [illegible] [illegible] کی بیوی کی اسپاسٹن سے ملاقات تھی۔ تم جو ہمیشہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش [illegible] تمہاری عورتوں اور مردوں کی [illegible] میں [illegible] بھی۔

میں [illegible] نہیں کر سکتا کہ اگلے چند ہفتوں تک مجھے صرف وولف ہی نہیں، ہر شخص [illegible] محسوس ہونے لگا۔ میری کھنی سی گاؤں کا [illegible] بھی شامل تھا [illegible] مجھے [illegible] [illegible] ایک زخم میں [illegible] [illegible] عورت [illegible] [illegible] جرمن [illegible] کسی [illegible] شہوت میں [illegible] [illegible] پگھلا کر [illegible] کے چہرے [illegible] [illegible] مجھے [illegible] وولف نے مجھے [illegible] فوجی [illegible] لڑکوں پر [illegible] ہیں۔

مجھے پھر یاد آنے لگا، اپنی ماں یاد آنے لگی۔ ان کی شدت اور جذباتیت تو مجھے مضطرب کر دیتی تھی، لیکن غالباً ان کے احساسات اپنی بڑی بچیوں سے زیادہ مستحکم ہوں گے۔ اور اب تو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بھی ڈگمگا سکتی ہیں، آپے سے باہر ہو سکتی ہیں۔ اور گو اس خیال سے مجھے مسرت محسوس ہوئی پھر بھی میں دل ہی دل میں یہ مقابلہ کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر میری ماں اسپاسکی سے عشق کرتیں تو اس رشتے میں زیادہ شدّت اور شریفانہ ہوتی، ویسے ابھی تصوّر بھی میں کر سکتا تھا کہ میری ماں اسپاسکی سے ہم آغوش ہوں اور میں، وولف کی طرح، بےشرمی سے اس بارے میں باتیں کروں۔ اب مجھے اپنے سیدھے باپ کا شکار کا خبط بھی ایک باوقار انسانی کا فرار کا طریقہ معلوم ہونے لگا تھا جو میدہ ہوں کی غلاظت پر سپاہی اور کوہستانی زندگی کو ترجیح دیتا تھا۔ میں خود ... ہنگامے سے اکتا گیا تھا اور زیادہ وقت ناور میں امتحان کی تیاری میں گزارنے لگا تھا۔

پرانی دوستی کے ناتے، جو ہوری بھی ہمارے علیحدہ اسکولوں کے آغاز پر ختم ہونے والی تھی، میں وولف کو چھوڑنے اس کے گھر تک گیا۔ ڈاکٹر گولڈمین اس دن بھی مریض دیکھنے گئے ہوئے تھے ہم ان کے آفس کا جی بھر کر معائنہ کر سکتے تھے۔ اس دن مجھے اس مشہور ڈھانچے کو بھی دیکھنے کا موقع ملا جو مجھے بہت ڈراونا لگا۔ اس کی ہڈیاں اتنی چمک دار تھیں کہ یقین نہیں آتا تھا کہ کبھی یہ کسی انسان کے بدن میں پوشیدہ رہی ہوں گی۔ لیکن ڈھانچے سے بڑھ کر مجھے ان کی ایک الیکٹروسٹیٹک مشین نے مسحور کیا جو اعصابی مریضوں کے لیے تھی۔ وولف نے مجھے بتایا کہ مریض دھات کی دو سلاخیں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیتا تھا ان سلاخوں میں برقی رو دوڑائی جا سکتی تھی جو معمولی سی سنسناہٹ سے بتدریج زوردار جھٹکے تک جا سکتی تھی

وولف چاہتا تھا کہ میں سلاخوں کو پکڑ کر دیکھوں لیکن مجھے ڈر لگا۔ کیوں! وولف نے حقارت سے کہا۔ "جرمن سورما کو ذرا سی گدگدی سے ڈر لگ رہا ہے کیا؟" معاً کر سلاخیں اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیں اور سر کے اشارے سے مجھے مشین کا بٹن دبانے کو لیے کہا۔ "چھوٹے و سے بٹن کو دباؤ، مگر آہستہ آہستہ۔

بعد میں میں کسی طرح نہ جان پایا کہ کس جذبے کے زیر اثر میں نے بٹن آہستہ آہستہ دبانے کے بدلے وحشیانہ طریقے سے پورے زور سے دبا دیا۔ اس وقت تو وولف کی حالت بہت مضحکہ خیز تھی، وہ پیچھے ہٹا، پھر بل کھا کر دوہرا ہو گیا۔ اس نے لاٹھی چلانے کی کوشش کی مگر ٹانگوں میں جنبش نہ ہو سکی۔ اس کے سرخ بال اس کے سر پر سئی کے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ مسرت تو مجھے اس کی ملتجی نگاہوں سے ہوئی جب وہ ہاتھ پھیلا کر خود کو نجات دلانے کے لیے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی تمام خوداعتمادی کافور ہو چکی تھی، اور اس کا بھیڑ جیسا چہرہ اب کسی قربانی کی بھیڑ کا چہرہ نظر آ رہا تھا قصاب خانے لے جائے جانے والے مویشیوں کا چہرہ جن کی کاروبار سے

اس کو دادا نے دوست بنوری تھی۔

بعد میں الزامات تو کچھ اور لگائے گئے لیکن میرا خیال ہے کہ بٹن واپس دبانے میں میں نے غیرضروری دیر لگائی کہ وہ سلاخوں کو پھینک سکے۔ جب میں نے اسے نجات دلائی تو وہ گھٹنوں کے بل، سرنگوں قابل رحم حالت میں چلا رہا تھا "میرے پاپا! میرے پاپا!"

موسم گرما دھیرے دھیرے گھل رہا تھا، اور میں اپنے رشتےداروں کے گھر جیسے ہوا میں معلّق تھا۔ میں اس آگہی کے ساتھ رہ رہا تھا کہ میں نے ایک جرم کیا ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ مینکجو امیجسن کی اصطلاح میں میں "کالا" ہو گیا تھا، اور اب کتنی بار بھی ڈوبل لڑوں خود کو "چِٹّا" نہیں کر سکتا تھا۔ چچا میروں نے میری پُرزور طرفداری کی اور میری حرکت کو معمولی شرارت سے تعبیر کیا، جو کہ وہ بہرحال تھی، کیونکہ چند دنوں کے علاج کے بعد وولف گولڈمین کے ہاتھ پہلے کی طرح چست اور پھرتیلے ہو گئے۔ لیکن چچا میروں کے دوستانہ رویے کے مقاصد میری نظر میں مشکوک ہو گئے تھے لاکھ چاہنے پر بھی ان کے بارے میں سوچنے سے میں خود کو باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں اپنے آپ سے بھی دور ہوتا گیا۔ چچی سولی نے اس صورت حال کو بہت ٹھنڈے مزاج کے ساتھ قبول کیا۔ وولف کے ساتھ اپنے وارفتہ معلقات کے اختتام پر انھوں نے ماتم نہیں کیا۔ وہ ایک خواب تھا، اور چچی سولی نے سب پر ظاہر ہو جانے دیا کہ اب وہ خواب سے بیدار ہو چکی ہیں۔ ظاہر ہے وولف گولڈمین اس کے بعد ہمارے گھر کبھی نہیں آیا۔ اس کے باپ نے اس کے ہاتھوں کا بھرپور علاج کرنے کے بعد اسے معمول سے قبل ہی ویانا، اس کی ماں کے پاس بھیج دیا۔ وولف ہم میں کسی کو الوداع کہنے بھی نہیں آیا۔

گولڈمین گھرانے کی خیرخبر مجھے اسپاسکی سے مل سکتی تھی، لیکن یہ نازک موضوع میں نے کبھی چھیڑا ہی نہیں۔ اب مجھے اس سے خوف بھی نہیں آتا تھا۔ اس کی جانب میرا رویہ سردمہری کا اور عمومی رہتا تھا۔ یہ سبق میں نے چچی سولی سے حاصل کیا تھا۔ ظاہر ہے میں لوہار بالر سے بھی کترانے لگا تھا۔ میرے خیال ایک کھونٹی پر ٹنگی رہتی سے ستعمال کرنا میں نے چھوڑ دیا تھا۔ مرغزاروں میں میری آوارہ گردی کا دوبارہ آغاز ہو گیا تھا۔ میکس میرا ساتھی تھا جو مجھ سے ہر بات پر متفق تھا۔ میں نے اس کی بےوفائی کو، جو اس نے وولف کا گرویدہ ہو کر کی تھی، معاف کر دیا تھا کیونکہ بہرحال وولف میرا بھی دوست رہا تھا۔ وولف کے لیے میکس کی وارفتگی بہت طوفانی تھی لیکن وہ بہت ہی مد بھری۔

بہرحال میں میکس کو خوبصورت لڑنے کتا بنانے کا عزم کر چکا تھا۔ مجھے اس کی شخصیت کی تعمیر کرنی تھی۔ میں سکھانا چاہتا تھا کہ کیسے خطرناک صورت حال میں چھلانگ لگا دے۔ میرا یہ بھی خیال تھا کہ اندھادھند لڑیا کتا مالک سے اندھی وفاداری کا وصف اپنانے

Scanned with CamScanner

پر بھی مجبور ہو گا۔

احاطے کے ایک گوشے میں، کیکروں کے نیچے، سیڑھے کے وہ حصے تھی جو کسی کام کے لیے استعمال نہ ہوتی تھی۔ یہاں پرانے، ٹوٹے پھوٹے، زنگ خوردہ اوزار اور صندوقچے پڑے تھے۔ یہ جگہ آوارہ بلیوں کے لیے پناہ گاہ بن گئی تھی۔ یہیں وہ اپنے بلونگڑے جنتیں۔ میں ہمیشہ میکس کو ان بلیوں کے پیچھے دوڑاتا، مگر وہ بھاگ نکلتیں۔ آخر میکس کو خونخواری کا سبق پڑھانے کے لیے میں نے ایک طریقہ ایجاد کیا۔ میں نے ایک تنگ صندوقچے کا ڈھکنا علیحدہ کر کے اسے زمین میں دفن کر دیا جیسے وہ کسی لومڑی کا بھٹ ہو۔ ایک بلی کو آسانی سے پکڑ کر میں نے صندوقچے میں بند کر دیا۔ اس کے بعد یہی کام باقی رہتا تھا کہ میکس کو بھی بلی کے ساتھ قید کر دیا جائے۔

اس تجربے کا نتیجہ افسوسناک نکلا۔ ذرا سی دیر میں میکس ناک پر کھرونچا کھا کر چیاؤں چیاؤں کرتا ہوا صندوق سے گولی کی طرح برآمد ہوا۔ اس نے میرے احکامات کی ذرا پروا نہ کی۔ مارے غصے کے میں نے بلی کو باہر کھینچ نکالنے کے لیے صندوقچے میں ہاتھ ڈالا تاکہ لڑائی باہر جاری رہ سکے۔ صندوقچے کے اندر میں نے ایک رویں دار، گرم متحرک شے کو پکڑ لیا، لیکن اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ میں شدید درد کی لہر دوڑ گئی۔ بلی نے میرے انگوٹھے اور انگلی کے درمیان دانت گاڑ دیے تھے۔ میں ہاتھ چھڑا نہیں سکتا تھا۔ میں نے اپنی گرفت اور بھی سخت کر کے بلی کو باہر کھینچا۔ اس کے دانت میرے گوشت میں اتنے گہرے گڑے ہوئے تھے کہ میں جھٹک کر اسے پرے نہیں پھینک سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اور بھی شدت سے اسے دبوچ لیا۔ بلی دیوانگی سے میرے بازو پر چاروں پنجوں سے پنجے مارنے لگی۔ میری قمیص کے ساتھ ساتھ بازو کے گوشت کے بھی پرخچے اڑ گئے۔

بدقسمتی سے اسی وقت چچی سوفی کی ملازمہ فلورنس وہاں سے گزری۔ مجھے لہولہان دیکھ کر اس نے دیوانگی سے شور مچانا شروع کر دیا۔ احساسِ جرم سے میں بوکھلا گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ گھر کے دوسرے لوگ مجھے اس حالت میں دیکھیں۔ باورچی کب احاطے کی طرف دوڑا چلا آ رہا تھا۔ فلورنس کی چیخوں سے مجمع اکٹھا ہونے والا تھا۔ سب لوگ ہر سمت سے جائے وقوعہ کی جانب لپکے آ رہے تھے۔ بلی کو ہاتھ میں لٹکائے، میں اندھادھند باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ گیٹ سے کچھ دور، پھولوں سے ڈھکے گڑھوں کے کنارے، میں نے بلی کی چھاتی پر گھٹنا رکھ کر دبا دیا۔ اب اسے گرفت ڈھیلی کرنی ہی پڑی۔ میرے گھٹنے کے نیچے اس کی پسلیاں چٹخ گئی تھیں۔ اس کے خوفناک دانت میرے گوشت سے باہر نکل آئے۔ میں نے اپنا ہاتھ اس خونیں، دندانےدار شکنجے سے آزاد کرا لیا۔ لیکن جب میں کھڑا ہوا تو چیختے چلاتے گلی کے چھوکروں میں گھرا ہوا تھا۔

پورے بازو کی حالت خستہ تھی۔ بلی کافی گندی تھی اور زخم کے سڑنے کا پورا امکان تھا۔ مجھے ٹیٹنس کا انجکشن لگانا لازمی تھا۔ کم از کم چچی سوفی نے تو تحکمانہ لہجے

میں یہی کہا۔ یہودی چھوکرے اور قصبے کے دوسرے باسی میرے چاروں طرف کھڑے مجھے نفرت سے گھور رہے تھے۔

مجھے ڈاکٹر گولڈمین کے یہاں گھسیٹ کر لے جایا گیا۔

ہو سکتا ہے گاؤں میں کسی بھی بات کے پھیلنے کی غیرمعمولی برق رفتار تیزی سے ڈاکٹر گولڈمین کو پہلے ہی معلوم ہو گیا ہو کہ میرے ہاتھ پر زخم کن حالات میں لگا ہے۔ انھوں نے میرا مرہم پٹی کرنے سے سختی سے انکار کر دیا۔ چچی سوفی سے، جو پہلی بار ان کے روبرو ہوئی تھیں، وہ اتنی درشتی اور اہانت سے پیش آئے کہ دیکھنے والے تک بعد میں تسلیم کرتے تھے کہ ان کا سلوک قطعی ناروا تھا۔

افسوس کہ یہ واقعات پرشکوہ ثابت نہ ہوئے، اگرچہ اس کے نتائج میرے لیے اتنے سنگین نہ تھے۔ پہلے مجھے دوفروش کے پاس لے جایا گیا، جہاں میرے زخم کی جیسے تیسے مرہم پٹی کر دی گئی۔ اس کے بعد مجھے یہ منظر دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی کہ چچا سوبی کی مشہور ڈیملر کار کو صرف میرے لیے باہر نکالا گیا۔ اور گلی کے حاسد چھوکروں نے، ایک بھاری دل والے جلوس کی صورت میں، مجھے اس میں سوار کرتے ہوئے دیکھا۔ مجھے جرنویچ، اپنے ماں باپ کے پاس بھیج دیا گیا۔ وہاں میرا علاج بھی ہوا اور لاڈ بھی۔ میں پھر چچا سوبی اور چچی سوفی کے گھر واپس نہیں آیا۔ امتحان کی بقیہ تیاریاں میں نے اپنے گھر ہی میں کیں، جس میں میں، برسبیل تذکرہ، بہت عمدہ طور پر کامیاب ہو گیا۔

البتہ چچا سوبی اور چچی سوفی کے لیے، اور یقیناً ڈاکٹر گولڈمین اور شاید میرے دوست وولف کے لیے، اور حتیٰ کہ اسٹیناسن کے لیے بھی یہ واقعات بڑی دوررس تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ یہ تو خیال اسٹیناسن کا بھی ہو سکتا تھا کہ چچی سوفی کے ساتھ ناروا سلوک کے جواب میں چچا سوبی ڈاکٹر گولڈمین کو ڈوئل لڑنے کا چیلنج دیں۔ درحقیقت آسٹروہنگرین فوج کے سابق افسر اور ڈوئل کی انجمن کا رکن ہونے کی حیثیت سے چچا سوبی پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی، لیکن اسٹیناسن نے یہ تجویز پیش کی یا نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چچا سوبی نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے اس انکار کو میرے والد کی تائید بھی حاصل ہوئی جن کا کہنا تھا کہ کسی معزز جرمن سے یہ توقع کرنا کہ وہ کسی یہودی کو ڈوئل لڑنے کا چیلنج دے ایک نہایت بیہودہ بات ہے۔

بہرحال اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ چچا سوبی کے انکار کی وجہ شمشیرزنی میں ڈاکٹر گولڈمین کی مہارت رہی ہو۔ کیونکہ ہتک اتنی سنگین تھی کہ اس کا فیصلہ پستول ہی سے ہو سکتا تھا جس کے استعمال پر چچا سوبی کو یقینی طور پر زیادہ مہارت حاصل تھی۔ اس کے باوجود ان کے مقابلے سے گریز کی افواہیں اتنی سخت جان ثابت ہوئیں کہ چچا سوبی کی انجمن کی عدالت کو معاملے کا جائزہ لینا پڑا۔ عدالت نے اس دلیل کو تسلیم نہیں کیا کہ یہودی ڈاکٹر گولڈمین کو ڈوئل لڑنے کا چیلنج نہیں دیا جا سکتا۔ وہ

Scanned with CamScanner

اگرچہ دانشور تھی لیکن بلاشبہ عالم بھی تھی، اس لیے ہتھیار کے ذریعے اپنی عزت کا دفاع کرنے کا انھیں یوں کچھ نہ کچھ حق "حاصل تھا"۔ چچا بیوبی کو، جنھیں اس وقت تک ایک انتہائی معزز رکن کی حیثیت حاصل رہی تھی، عدالت کی جانب سے بزدلی کا مجرم ٹھہرایا گیا، اور ازحد اہانت آمیز طریقے سے انجمن سے خارج کر دیا گیا۔ اس سے ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ ان کے بیشتر پرانے شکاری ساتھیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔

چچی سوفی کا رویہ بھی بدل گیا۔ ان کی ساف گو اور گرم جوش حقیقت پسندی نے تندوتیز کاٹ اختیار کر لی، جو کبھی کبھی طنز و تشنیع کی شکل میں ظاہر ہونے لگی۔ چچا بیوبی کی ہر بات کی تائید کرنے کی بجائے، جیسا کہ وہ زندگی بھر کرتی چلی آئی تھیں، اب وہ اکثر ان کی تردید کرنے لگیں۔ "بیوبی ٹھیک کہتے ہیں" کا فقرہ رفتہ رفتہ "اس قسم کی باتیں کرنا تو بیوبی کی پرانی عادت ہے" میں ڈھل گیا۔

یہ سب خبریں مجھے لوگوں کی باتوں سے معلوم ہوئیں؛ کیوں کہ میں اس کے بعد ان سے کبھی نہیں ملا۔ میں پورا تعلیمی سال آسٹریا میں گزارتا اور تعطیلات میں سیروسفر میں مشغول رہتا۔ اور ہاں، میں پہلے سے بھی زیادہ ذوق و شوق سے اپنے والد کے ساتھ ان کی شکاری مہمات میں شریک ہونے لگا۔ جب چچی سوفی کے انتقال کی خبر آئی تو میں اسکول کے آخری امتحان کی تیاری میں مصروف تھا؛ میں ان کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ کچھ مہینوں بعد چچا بیوبی کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کی جائیداد ان کے ایک دور کے عزیز کو وراثت میں مل گئی۔ میں اس کے بعد وہاں کبھی نہیں گیا۔

ایک بار ویانا میں مجھے وولف گولڈمین کا پتا لگانے کا خیال آیا۔ اس کی ماں کے ذریعے، جو مجھے معلوم تھا کہ والٹر کے ادارے میں ظروف سازی کے شعبے کی سربراہ ہیں، یا موسیقی کی اکیڈمی میں، جہاں وولف تعلیم پا رہا ہو گا، اس سے جا ملنا یقیناً ممکن تھا۔ لیکن کچھ تو کاہلی کے باعث اور کچھ اپنے ضمیر کے بھاری بوجھ کی وجہ سے، میں نے اسے تلاش نہیں کیا۔ اگرچہ ڈاکٹر گولڈمین نے اپنی عزت کے دفاع میں چچا بیوبی پر فتح پا لی تھی، لیکن میرا علاج کرنے سے انکار ان کے حق میں برا ثابت ہوا۔ میڈیکل کمیشن نے ان کا اجازت نامہ منسوخ کر دیا۔ ڈاکٹر گولڈمین کو وہ گاؤں چھوڑنا پڑا جہاں ان کے باپ نے، گویا ایک ارضی موعودہ میں، "اپنا مکان کھڑا کیا تھا"۔ ان کا ولا رفتہ رفتہ کھنڈر ہو گیا۔

استاسشی کمیں اور رہنے لگا تھا، لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں گیا۔ صرف ایک بار کرسمس کے تہوار پر مجھے اس کا تحفہ ملا تھا۔ یہ روکوکو دور کے لکڑی اور ہاتھی دانت کے بنے ہوئے دو نصف مجسمے تھے۔ استاسشی کے نوادرات کے ذخیرے میں میں نے انھیں اس کے کمرے میں دیکھا تھا۔ اور ان سے مجھے بیک وقت نفرت اور کشش محسوس ہوتی تھی؛ یہ ایک مرد اور ایک عورت کے چہروں کی شبیہیں تھیں جنھیں دونیم کر دیا گیا تھا۔ ایک جانب سے بہت خوب صورت، خوش خال نظر آتی تھیں، جب کہ دوسری جانب سے

کھوپڑی کی اندرونی ساخت، ہڈیاں، عضلات، رگیں، یہاں تک کہ بھیجے کی گرہیں بھی دیکھی جا سکتی تھیں۔ میرے والدین نے اس تحفے کو میری عمر کے بچے کے لیے نامناسب سمجھ کر اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ پھر وہ مجسمے کہیں غائب ہو گئے۔ میں نے دوبارہ انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ اب صرف ان کی یاد باقی ہے، جیسے اس دور دراز زمانے کی میرے پاس اب صرف یادیں ہیں۔

آج

سالانہ خریداری

اندرونِ ملک
چار شماروں کی قیمت ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں
ڈی ۲۰۳ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی [illegible]

بیرونِ ملک

امریکا اور کینیڈا کے لیے
چار شماروں کی قیمت (بشمول ہوائی ڈاک خرچ وغیرہ) ۱۰۰ امریکی ڈالر

بھیجنے کا پتا :

Prof. Muhammad Umar Memon
5417, Regent Street
Madison, Wisconsin 53705
U.S.A.

انگلینڈ اور باقی ممالک کے لیے
چار شماروں کی قیمت (بشمول ہوائی ڈاک خرچ وغیرہ) ۱۵۰ پاؤنڈ

بھیجنے کا پتا :

Ms. Shabana Mahmud
52, Queen's Road
Wimbledon
London SW19 8LR
England

خزاں ۱۹۸۹
تاراشنکر بنرجی　ستیہ جیت رے　اسد محمد خاں　محمد خالد اختر
ڈونلڈ بارتھیلم　ولیم سیرویان　افضال احمد سید　ذی شان ساحل
نسرین انجم بھٹی　قمر مسعود　فروغ فرخ زاد　بابا مقدم

سرما ۱۹۹۰
نجیب محفوظ　لیو تالستائی　کیم مونزو
مظفر علی سید　فہمیدہ ریاض　عذرا عباس
احمد فواد　محمد خالد اختر　اکرام اللہ

بہار ۱۹۹۰
اِتالو کلوینو　امین مالوف　محمد عمر میمن　محمد سلیم الرحمٰن
جیک لنڈن　محمد انور خالد　زیبا الیاس　محمد خالد اختر
تادیوش روزیوچ　زبگنیو ہربرت　وِسلاوا شمبورسکا　الیگزانڈر وات

گرما ۱۹۹۰
وجے دان دیتھا　انور خان　حسن منظر　محمد سلیم الرحمٰن
شمس الرحمٰن　شمس الحق　فہمیدہ ریاض

خزاں ۱۹۹۰
منوچہر خسروشاہی　بابا مقدم　جمال میرصادقی　ثروت حسین
ذی شان ساحل　اوکتاویو پاز　یہودا امیخائی　جولین بارنز
فاروق خالد　محمد خالد اختر　علی امام نقوی　خورخے لوئس بورخیس

سرما ۱۹۹۱
ابراہام یہوشوا　صلاح الدین محمود　فہمیدہ ریاض　قمر مسعود
یانس رتسوس　انطون شماس　اسما راجا　ولاس سارنگ

بہار ۱۹۹۱
خصوصی شمارہ : گابریئل گارسیا مارکیز

آج کی کتابیں
بی ۱۳۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۳۶

تقسیم کار
مکتبۂ دانیال
وکٹوریہ چیمبرز نمبر ۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی

کلاسیک
شاہراہ قائداعظم لاہور

ہدیہ تشکر

عزّت مآب وزیر اعظم
اسلامک ریپبلک آف پاکستان

میاں محمد نواز شریف

کی خدمت میں ہم مبارک باد پیش کرتے ہیں
کہ انھوں نے ملک میں مالیاتی جمہوریت کے اجراء کا
جرأت مندانہ فیصلہ کیا اور

الائیڈ بینک آف پاکستان لمیٹڈ

کی ملکیت اور نظم و نسق اہل ترین افراد یعنی بینک ملازمین
کے حوالے کر دیا
ہم عہد کرتے ہیں کہ بینک کا کام کاج چلانے میں اپنی پوری محنت اور
اہلیت صرف کریں گے تاکہ وزیر اعظم کا فیصلہ درست ثابت ہو۔

ملازمین و کارکنان الائیڈ بینک آف پاکستان لمیٹڈ

الائیڈ مینجمنٹ گروپ

PID Islamabad